سبز پرچم میں لپٹی شہادت

ضیا شاہد

عام طور پر ہمیں ٹی وی پر پہلے خبر سنائی دیتی ہے، پھر کچھ وقت گزرنے پر سبز پرچم میں لپٹا ہوا لکڑی کا کفن جسے مقامی طور پر سلامی دے کر شہید کا جنازہ پڑھتے ہیں اور پھر آبادی سے باہر کسی شہر خموشاں میں دفن کر دیتے ہیں۔ ایسے میں اکثر ٹی وی چینلز پر شہید کے گھر والوں سے بات چیت دکھائی جاتی ہے۔ یہ بات چیت ہم نے 65ء اور 71ء کی جنگوں کے علاوہ کارگل کی جنگ میں بھی سنی تھی۔ سب شہیدوں کے گھر بہت معمولی اور سادہ ہوتے ہیں، ان کے والدین بھی ایک جیسے ہوتے ہیں، ان کی خشک آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے، پھر بھی انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر دِل بھر آتا ہے۔ وہی بیٹے، بھائی یا بھتیجے بھانجے کی شہادت پر فخر کی بات۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کا انداز۔ پھر کبھی کبھار کچھ بچے بھی دکھائے جاتے ہیں جن کے سر سے سایہ اٹھ گیا، پھر بھی بڑے بوڑھے اصرار کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا بڑا ہوگا تو وہ اسے پاک فوج میں بھیجیں گے۔

کچھ دیر کیلئے عزیزوں، رشتہ داروں کا جھرمٹ اور شہید کی بیوہ سے عورتوں کا اظہار تعزیت، پھر رفتہ رفتہ خاموشی چھا جاتی ہے۔ تیسرے دن قل کی تقریب ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی ہے، پھر بعض گھروں میں دسویں اور ایک مہینہ چند روز گزرنے پر چالیسویں کا ختم۔ تب تک قبر کی مٹی بھی خشک ہو جاتی ہے اور نئی اور پرانی قبروں میں کوئی زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا، تاہم وہ آنسو جو شہادت کے بعد کچھ دن رُکے تھے،

اب وقتاً فوقتاً بہہ نکلتے ہیں۔ بچوں کی آنکھوں میں ایک مستقل اور ہمیشہ رہنے والی اداسی چھا جاتی ہے۔ شہید کی بیوہ رفتہ رفتہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہے، شہید کا باپ بچوں کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں حساب لگاتا ہے کہ یہ کمسن یتیم کب بڑے ہوں گے، تب شہید کی ماں کے اندر کا خلا بڑھتا جاتا ہے اور ایک مستقل غم اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ دلاسہ دینے والے آہستہ آہستہ لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ پرسہ دینے والوں کی آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ شہید کے دوستوں اور ساتھیوں کو زندگی آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اب تو شہید کی قبر پر کبھی کبھار کوئی لاٹھی ٹیکتا ہوا بوڑھا نظر آتا ہے، اس کے پاس چھوٹا سا پنجسورہ ہوتا ہے، وہ اپنی عینک کو ٹھیک طرح سے آنکھوں پر جماتا ہے اور پھر دبے لفظوں میں قرآنی آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ تلاوت سے فارغ ہو کر وہ غیر ارادی طور پر قبر پر جمع شدہ پتوں کو ہاتھ سے صاف کرتا ہے، پھر اسی ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہے۔ آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو قبر کی مٹی میں جذب ہو کر غائب ہو جاتے ہیں، جیسے اس کا بیٹا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، وہ اس کا آخری دن یاد کرتا ہے۔

اس دن گھر میں بڑی چہل پہل تھی مگر ساتھ ہی ایک خاموشی دِلوں پر چھائی ہوئی تھی۔ بیٹے کی چھٹی ختم ہو رہی تھی، وہ بار بار اپنے بچے کا ماتھا چومتا اور اسے گلے لگاتا تھا، بیوی کو کھانے پکانے ہی سے فرصت نہیں تھی، تازہ کھانا وہ شوہر کو کھلانا چاہتی تھی، کوئی پکوان اسے ساتھ دینا چاہتی تھی، تب بیٹے نے ماں باپ سے گزارش کی تھی کہ وہ بچے کا خیال رکھیں۔ وہ پڑھائی میں دل نہیں لگاتا، سکول سے واپس آ کر کھیل کود میں مصروف ہو جاتا ہے۔

باپ اپنے بچے کو بڑا آدمی دیکھنا چاہتا تھا، آخری دن اس نے اپنے ''بیچ میٹ'' کسی کولیگ کی بات نہ کی تھی، وہ باپ کی بیماری پر فکرمند تھا، بار بار کہتا تھا اور باپ کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا کہ دوا کھاتے رہیں، میں ڈیوٹی پر جا کر اور دوا بھجوا دوں گا۔ وہ ماں کے گھٹنوں کے درد سے پریشان تھا، بار بار کہتا کہ زیادہ پیدل نہ چلا کرو، تیل گرم کر کے گھٹنوں پر اس کی مالش کیا کرو۔ اپنی بیوی کو کام کاج میں مصروف دیکھ کر اس کا جی بے اختیار چاہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کیلئے ہی سہی، اس کے پاس بیٹھ کر دُکھ سُکھ کی بات کرے، مگر گھر میں سبھی لوگ موجود تھے اور بیوی کو باورچی خانے ہی سے فرصت نہیں تھی۔

تب اس کے بچپن کے دوست ملنے آ گئے، انہیں معلوم تھا کہ آج اس کی آخری چھٹی ہے، وہ اسے ساتھ لے کر بس کے اڈے تک چھوڑنا چاہتے تھے، تب اس نے باری باری سب کے گلے ملنا شروع کر دیا، اس کے

دوست خوش بھی تھے اور غمگین بھی۔ خوشی اور غمی کا یہ ملاپ بڑا دلچسپ تھا۔ وہ بار بار کہتے تھے، یار اس بار تمہاری چھٹی کا پتہ ہی نہیں چلا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے آخری دن آ پہنچا۔ تب وہ ہنسا تھا، اب تو کافی دیر بعد چھٹی ملے گی۔ تب تک بیٹا اگلی کلاس میں جا چکا ہوگا۔ خدا کرے ماں کے گھٹنوں کا درد ختم ہو جائے اور باپ کا بلڈ پریشر اب کم نہ ہو۔ وہ بار بار کہتا تھا آپ خوراک اچھی کریں، باپ اس کی بات سن کر ہنسا تھا، مورکھ ہے میرا بیٹا بھی۔ کام کرنے والا ایک اور اس کی تھوڑی سی تنخواہ میں مہینہ پورا کرنے والے تین بڑے اور دو چھوٹے۔ ڈاکٹر تو بس بغیر سوچے بات کر دیتے ہیں۔ پروٹین لو، گوشت اور انڈے میں ہوتی ہے، تازہ پھل کھاؤ اور دودھ روزانہ پیو۔

پھر اس نے بیوی کی طرف دیکھا، شادی کے دن وہ گڑیا سی لگ رہی تھی مگر اب اتنے سال گزرنے پر اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ غربت اور مسلسل کام سے اس کے خوبصورت ہاتھ اب کھردرے ہو رہے تھے۔ باپ نے اداس لہجے میں کہا تھا اگر مقدمے کا فیصلہ ہو جاتا تو ہمیں ڈیڑھ ایکڑ زمین ہی مل جاتی۔ کچھ ہاتھ کھل جاتا۔ اس نے سوچا تھا کہ کاش! ہمارے ہاں نظام انصاف میں اتنی دیر نہ ہوا کرے۔ برسوں سے وہ سب تھوڑی سی زمین کیلئے کوشاں تھے جس پر زمیندار نے قبضہ کیا تھا۔ ہر بار ڈیوٹی پر جاتے ہوئے باپ کی زبان سے یہی الفاظ ہوتے تھے، مگر یہ عجیب انصاف تھا جس کے تحت آخری فیصلہ ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

بڑا بیٹا سیانا تھا، لیکن چھوٹا ابھی بہت چھوٹا تھا، اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ مضبوط اور توانا بازوؤں کا جو سہارا اس کو گزشتہ ایک ماہ سے اپنے گرد محسوس ہو رہا تھا آج اس سے دُور ہو جائے گا۔ لیکن بڑے بیٹے نے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ بھی ابا کو چھوڑنے بس اڈے تک جائے گا۔ بوڑھا باپ بھی یہی چاہتا تھا لیکن وہ اور اس کے دوست مصر تھے کہ بچہ تھک جائے گا اور چاچے میں اتنی ہمت نہیں ہے، بس کے اڈے تک کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی، دوستوں نے تو سائیکلوں پر سفر کرنا تھا اور ایک سائیکل کی پچھلی سیٹ پر اسے بٹھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

تب وہ سب گھر سے نکلے، ان کے سامنے بیوی نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا، مگر اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ خیر نال جاؤ اور جلدی واپس آنا۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا، وہ تو اس کا ہاتھ ہی نہیں چھوڑتی تھی، تب باپ نے مصنوعی خفگی سے کہا، اب بیٹے کو جانے بھی دو۔ بوڑھا خود تھوڑا پریشان ہو گیا تھا، اکلوتے بیٹے کی مہینوں غیر حاضری میں وہ خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، مگر گھر میں دوسروں کو دکھانے کیلئے وہ اپنے

اوپر جبر کرتا اور صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کو ڈانٹتا۔ اسے کسی کا آنسو بہانا اچھا نہیں لگتا تھا، ہاں بچہ رو دیتا تو وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتا اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا۔

سارے دوست ہنستے مسکراتے گھر سے نکلے تھے، ماں دروازے ہی میں کھڑی رہی تھی۔ شاید وہ بیٹے کو نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے آخر تک دیکھنا چاہتی تھی۔ باپ چند قدم چل کر راستہ میں آن کھڑا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں بچے کا ہاتھ تھا۔ بیوی اپنی ساس کے ساتھ گم صم کھڑی تھی۔

وہ جلد ہی نظروں سے غائب ہو گیا تھا، بعد میں اس کے دوستوں نے بتایا کہ وہ بس اڈے پر کئی گھنٹے انتظار کرتے رہے تھے، بس جسے آنا تھا، وہی سواریاں اتار کر واپس جانے والی تھی، وہ دوستوں کو اپنی یونٹ کی باتیں سناتا رہا، وہ سب خوش تھے، بچپن اور لڑکپن کے دوست اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے، ایک بار جب اس نے گھر میں ہوتے ہوئے بھی باپ کے کہنے پر پوری یونیفارم پہنی تھی تو دوست اسے دیکھنے آئے تھے۔ وہ یونیفارم میں کتنا سجیلا اور بانکا لگتا تھا، وہ اس کے کندھوں پر لگے ہوئے نشان دیکھتے رہے تھے، ان میں سے ایک نے تو اسے چھو کر بھی دیکھا تھا۔

وہ دوستوں کو فوج کی کہانیاں سناتا رہا، اس کی ڈیوٹی بہت دُور لگی ہوئی تھی، وہ دہشت گردوں کی صفائی پر مامور تھا، یہاں زندگی بہت مشکل تھی، وہ کشمیر میں کنٹرول لائن پر لڑ چکا تھا لیکن وہاں آسانی تھی۔ سرحد کے دوسری طرف دشمن تھا اور اس طرف اپنے لوگ۔ یہاں عقب سے، دائیں اور بائیں سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وزیرستان کی یہ لڑائی ایک مشکل مرحلہ تھی۔ یہاں دشمن جا بجا چھپا بیٹھا تھا اور جب اسے موقع ملتا وہ حملہ کر دیتا، اس کے کتنے ہی ساتھی اس جنگ میں شہید ہو چکے تھے، مگر وہ سب پورے ملک کیلئے، اس کے لوگوں کیلئے دہشت گردوں سے جنگ لڑ رہے تھے جنہوں نے برسوں سے عام آدمی کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جن کیلئے لڑ رہا تھا وہ سب آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں؟

بس آئی اور جلدی سواریاں اُتار کر دوبارہ مسافروں کو بٹھانے لگی۔ تب اس نے آخری دوست سے گلے ملتے ہوئے کہا، یار ہم اس ملک کو دہشت گردوں سے صاف کر رہے ہیں، خدا کیلئے آپس میں مت لڑو، ایک دوسرے سے بھائی چارہ قائم کرو، جو روکھی سوکھی ملتی ہے اسے بانٹ کر کھاؤ، کوئی بھوکا نہیں مرے گا۔

یہ ساری باتیں اس کے دوستوں نے اس کی شہادت کے بعد غمزدہ باپ کو بتائی تھیں، تب سے وہ بوڑھا ہر شخص سے ایک ہی بات کرتا ہے ''میرا بیٹا شہید ہو گیا، اس کا آخری پیغام یہ تھا کہ خدا کیلئے آپس میں مت لڑو،

ایک دوسرے سے بھائی چارہ قائم کرو، جو روکھی سوکھی ملتی ہے اسے بانٹ کر کھاؤ، کوئی بھوکا نہیں مرے گا۔

تب اس کی ویران آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگتا ہے۔

یہ ایک شہید کے گھرانے کی کہانی ہے۔ اسد اللہ غالب کی کتاب ایسی بہت سی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ غازیوں کا رزم نامہ ہے اور شہیدوں کا شاہنامہ۔

قصر ہند کا غرور خاک میں

یہ 27 اپریل 1972ء کی ایک گرد آلود دوپہر ہے۔ قصور سرحدی علاقے میں کسی مقام پر ایک پروقار تقریب اپنے جوبن پر ہے۔ تمام تر ہماہمی کے باوجود ماحول پر افسردگی کی کیفیت طاری ہے۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل عبدالمجید ملک کے اعزاز میں مقامی بریگیڈیئر کی طرف سے ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ نیم لفٹین سے لے کر کرنل اور بریگیڈیئر تک تمام افسر موجود ہیں۔ اس بھری محفل میں بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) محمد ممتاز خان (ستارہ جرأت) کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ اسی ذہین اور دلیر افسر نے اس بریگیڈ کی کمانڈ کی ہے جس نے حسینی والا میں بھارت کے بظاہر ناقابل تسخیر دفاع کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ پیالیوں اور چھری کانٹوں کی کھنک میں تمام افسروں کی نگاہیں جنرل ملک کے چمک دار چہرے پر جمی ہیں۔ زبانیں گنگ ہیں، مگر دلوں کے درمیان رابطہ قائم ہے۔ لبوں پر مہر خاموشی ہے، مگر روحیں آپس میں ہم کلام ہیں۔ بالآخر سکوت ٹوٹتا ہے اور بریگیڈیئر عبدالقادر خاں آگے بڑھ کر جنرل مجید ملک سے میرا تعارف کراتے ہیں۔ ''اردو ڈائجسٹ'' کے ذکر پر ایک معنی خیز قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ بعض نگاہوں میں ہمدردی کے جذبات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اور کچھ لوگوں کی پیشانی پر افسرانہ انداز کی شکنیں نمودار ہوتی ہیں اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی دنیا میں مست ہو جاتے ہیں۔

''سوال کیجئے''۔ جنرل مجید غیر متوقع طور پر خوشگوار موڈ میں ہیں۔

''ایک ڈویژن کمانڈر کی حیثیت سے آپ کی نظر میں حسینی والا کے اس مختصر سے علاقے کی اہمیت کیا ہے؟''۔

دشمن کے لئے یہ علاقہ ایک برج ہیڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جنگ سے پہلے ہمیں مسلسل اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ فیروز پور میں وسیع پیمانے پر فوجوں کا اجتماع ہو رہا ہے۔ نومبر کے آخر میں یہاں دو انفنٹری

ڈویژن اور ایک بکتر بند ڈویژن پہنچ چکے تھے۔ بس یہی کسر باقی تھی کہ دشمن اپنا بکتر بند ڈویژن ہیڈ ورکس کے راستے گزار کر اس علاقے میں مورچہ بند ہو جائے اور پھر اچانک لاہور پر چڑھ دوڑے۔ یقیناً یہ صورتحال پریشان کن ثابت ہوتی، لیکن ہم نے اس کی نوبت نہ آنے دی۔ ویسے بھی اس علاقے میں پیری میٹر، قصر ہند، ریلوے بند، اولیکے اور راجو کے پوسٹ کی صورت میں دشمن نے مستحکم ترین قلعہ بندیاں کر رکھیں تھیں۔ اسے اپنے اس دفاع پر بجا طور پر ناز تھا، لیکن ہم نے اسلام کی عظیم ترین حربی روایات کو مشعل راہ بنایا اور دیوانہ وار اندر ہی اندر گھستے چلے گئے اور فولاد اور سیمنٹ کے بنکروں کو دشمن کا قبرستان بنا کے رکھ دیا۔ ہمارے سربکف مجاہدوں کی برق رفتار پیش قدمی کے پیش نظر انڈین بکتر بند ڈویژن کے لاہور پر یلغار کرنے کے ارمان حسرتوں میں بدل کر رہ گئے اور دونوں انفنٹری ڈویژن فیروز پور کی دوسری دفاعی لائن بھی چھوڑ کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔

دشمن کو زمینی فوائد سے محروم کرنے کے ساتھ ساتھ حسینی والا ہیڈ ورکس کا کنٹرول بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اب بیکانیر کینال اور ایسٹرن کینال سارا سال خشک پڑی رہیں گی اور فیروز پور، فرید کوٹ اور راجستھان کی زرعی معیشت کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھے گا۔ دشمن کی دھرتی کی کوکھ کسی صورت بھی ہری نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ بھگت سنگھ اور دت کی یادگار بھی ہمارے قبضے میں ہے۔ یہ ہندوؤں اور سکھوں کا نہایت متبرک مقام ہے۔ یہاں ہر سال میلہ لگتا ہے، لیکن اب کے دشمن ستلج کے دوسرے کنارے پر بیٹھا کف افسوس مل رہا ہے۔ جنرل ملک ایک ہی سانس میں ڈھیر ساری باتیں کہہ دیتے ہیں۔

''اپنے جنگی منصوبے پر عمل درآمد کرتے وقت مشکلات بھی پیش آئی ہوں گی؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''جب معرکہ عروج پر ہو تو عموماً تمام کاغذی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور مقامی کمانڈروں کو زمینی صورتحال کے پیش نظر اپنی تدابیر پر نظر ثانی کرنا پڑتی ہے، لیکن ہمیں کسی ایسے نازک مرحلے سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ ہر کام منصوبے کے مطابق اور وقت مقررہ پر انجام پایا۔ چند چھوٹے موٹے مسائل نے سر اٹھایا بھی، مگر فوری طور پر ان کا حل تلاش کر لیا گیا۔ دشمن کی مزاحمت حد سے زیادہ تھی اور وہ کسی قیمت پر بھی اس علاقے سے دست بردار ہونے کو آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے کئی افسروں کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس کے باوجود سربکف مجاہدوں کے حوصلے جواں رہے اور وہ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے قلعہ بند دشمن پر مردانہ وار یلغار کرتے رہے۔ افسروں اور جوانوں کے اسی جذبہ ایمانی اور شوق شہادت نے جنگی

منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔''

''دشمن پر سامنے سے وار کیوں کیا گیا؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ کسی پہلو سے پیش قدمی کی جاتی اور مقابلتاً کم جانوں کی قربانی دے کر دشمن کو گھیر لیتے۔''

جنرل ملک پلیٹ سے شامی کباب اٹھا کر منہ میں ڈالنے والے ہیں۔لیکن پھر ہاتھ روک لیتے ہیں اور میرے طویل سوال پر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جواب دیتے ہیں:

''پہلو سے حملہ کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا کہ دشمن کو ہیڈ ورکس کے راستے کمک بھیجنے کا موقع مل جاتا اور وہ اپنی پوزیشن مضبوط کر لیتا۔ہم بھکی ونڈ کی طرف سے مرکزی حملہ کرتے تو ایک ایک پوسٹ کو روندتے ہوئے جب آخر میں ہیڈ ورکس کا رخ کرتے تو دشمن ''شاندار'' استقبال کے لئے تیار ہوتا۔ممکن تھا ہم پیچھے ہی دریائی رکاوٹوں میں پھنس کر رہ جاتے اور ہیڈ ورکس کے اصل دفاع پر حملے کی نوبت ہی نہ آتی۔اس طرف قدرتی رکاوٹوں کی بنا پر ٹینک بھی زیادہ دور تک پیادہ دستوں کو ساتھ نہ دے سکتے۔ظاہر ہے اس طرح نتائج بالکل برعکس نکلتے۔مہینوں کے غور وخوض کے بعد ہم نے دشمن کے سر پر وار کرنے کا منصوبہ بنایا۔یہاں پختہ سڑک پر رات اور دن میں کسی وقت بھی ٹینک استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ہیڈ ورکس ادھر سے بھی کچھ زیادہ دور نہیں، ایک ہی ہلے میں اس پر قبضہ کیا جا سکتا تھا اور ایسا ہوا بھی۔اس سے دشمن کی سپلائی لائن بھی کٹ گئی، جوابی حملہ بھی روک لیا گیا اور فرار کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔''

جنرل ملک کی توجہ پھر کھانے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔قدرے توقف کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''اگر کسی آدمی کے ہاتھ پاؤں اور ٹانگیں کاٹ دی جائیں تو بھی وہ سانس لیتا رہے گا اور زندگی کی رمق اس میں باقی رہے گی۔کیوں نہ اس کی شہ رگ ہی کاٹ دی جائے تا کہ معاملہ جلدی ختم ہو۔میرا فیصلہ بھی یہی تھا اور جنگی منصوبے کی اٹھان اس نظریئے پر تھی۔ہم نے سامنے سے دشمن کی شہ رگ پر ہاتھ ڈالا، لیکن ساتھ ساتھ اسے پورے محاذ پر فریبی حملوں میں الجھا کر ختم کر دیا۔میرے جنگی منصوبے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ حملہ اسی نفری سے کرایا گیا جو پہلے سے دفاع میں لگی ہوئی تھی۔ریزرو کو حرکت میں نہیں لایا گیا۔اس طرح میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔اول تو دفاعی پوزیشنیں خالی کرنا پڑتیں اور اگر کچھ فوج دفاع پر بھی بٹھائی جاتی تو حملہ کرنے والی نفری بہت کم رہ جاتی، حالانکہ عام اصولوں کے مطابق حملہ کرنے کے لئے تگنی تعداد کی

ضرورت پڑتی ہے مگر یہاں تو قوت کا توازن برابر بھی نہ تھا۔ بہر حال یہ خطرات مول لئے گئے اور کامیابی نے ہمارے قدم چومے۔''

''کیا جنگی منصوبہ تیار کرتے وقت دشمن کے جوابی حملے کے امکانات پر بھی غور کیا گیا؟''

''جی ہاں، تمام پہلوز یر بحث آئے۔ ہمارے اندازے کے مطابق دشمن کے جوابی حملے کے امکانی راستے یہ تھے:

1- کھیم کرن قصور روڈ

2- فیروز پور قصور روڈ

3- واچ ٹاور گٹی نمبر 9

ہمیں شک تھا کہ یہاں دشمن نے ستلج پر کشتیوں کا پل تعمیر کر رکھا ہے۔ زیادہ تر جوابی حملے کا اندیشہ ادھر ہی سے تھا، مگر دشمن نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ابھی ہیڈ ورکس اور مضافات میں ہمارا حملہ عروج پر تھا کہ ٹینکوں کی مدد سے جوابی حملہ شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی دشمن کے توپ خانے کی تمام یونٹوں نے اپنا فائر یہیں پر مرکوز کر دیا۔ اس وقت آڑ سے سر اٹھانا مشکل تھا۔ مگر وہاں کوئی آڑ بھی کب میسر تھی! ہمارے جوان سڑک کے عین درمیان ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے اور قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے انہوں نے دشمن کی جوابی یلغار کو ناکام بنا دیا۔ بوکھلاہٹ میں بھارتیوں نے ستلج کا پل بھی اڑانے کی کوشش کی۔ اس سے ان کا ایک ٹینک بھی دریا میں جا گرا۔''

ایک طرح سے میرے سوال کا یہ مکمل جواب ہے لیکن شاید جنرل ملک اس سوال کی اصل چبھن کو محسوس نہیں کر سکے۔

تقریب اختتام کو پہنچ چکی ہے، میں جلدی سے ایک اور سوال داغ دیتا ہوں:

''جنگ میں مختلف پلٹنوں کے ایکشن کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟''

جنرل مجید کمال فراست سے پہلو بچا لیتے ہیں۔ ''یہ سوال متعلقہ پلٹنوں سے پوچھئے۔ یہ رہے پنجاب والے اور وہ دیکھئے بلوچ والے۔ ہر ایک اپنا اپنا ایکشن بہتر طور پر اور تفصیل کے ساتھ بتا سکتا ہے۔''

بلوچ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل حبیب احمد (ستارہ جرأت) کا چہرہ مسرت کے جذبات سے تمتما اٹھتا ہے۔ وہ تشکر بھری نظروں سے اپنے ڈویژن کمانڈر کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کی رہنمائی میں

بلوچ رجمنٹ کی ایک نوعمر بٹالین نے اپنے جی او سی کے جنگی منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے مرکزی کردار ادا کیا ہے.....اور یوں میجر جنرل عبدالمجید ملک آنے والی نسلوں کے لئے قومی تاریخ میں ایک شاندار اور عظیم ورثے کا اضافہ کرتے ہیں۔

بلوچ رجمنٹ کی طوفانی پلٹن

کرنل حبیب کی پلٹن اپریل 71ء میں اٹھائی گئی ہے۔اس لحاظ سے یہ سب سے کم عمر یونٹ ہے،لیکن شعلہ بار کمانڈنگ آفیسر نے جوانوں کے اندر جذبہ جہاد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔عسکری اور اخلاقی تربیت اس نہج پر کی گئی ہے کہ اعلیٰ کمانڈر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کسی بھی ناخوشگوار وقت پر یہ پلٹن پرانی یونٹیوں کی بہ نسبت کہیں عمدہ اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گی.....یہ اس محنت کا نتیجہ ہے جو کرنل حبیب نے تقریباً دیوانوں کی طرح شب و روز کی ہے اور جوانوں کو اس قابل بنایا ہے کہ ان پر اس قدر اعتماد کیا جا سکے.....دہلی کے ایک سید گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ کرنل اپنے جوانوں کے لئے ایک ہر دلعزیز اور شفیق باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔وہ جرأت اور شجاعت کا پیکر ہے،جذبات و احساسات کا مجسمہ ہے،بے پناہ قوت ارادی اور عسکری صلاحیتوں کا مالک ہے،اولوالعزمی میں بے مثال ہے اور نازک ترین وقت میں بھی دانشمندانہ فیصلہ کرنے میں یکتا۔وہ صاحب شمشیر و سناں ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی ہے۔اسے سرسید احمد خاں اور خواجہ حسن نظامی ایسے مشائخ روزگار کی قرابت داری کا شرف حاصل ہے۔وہ غنیم کے سامنے کوہ آتش فشاں کی طرح پھنکارتا ہے،لیکن دوستوں کی محفل میں انکساری اور عاجزی کا رویہ اختیار کرتا ہے۔وہ گولہ و بارود کے جہنم میں طوفان کی طرح بپھرتا ہے،لیکن گل و گلزار میں ''جوئے نغمہ خواں'' کی مثال ہے۔بلوچ رجمنٹ کی اس ننھی منی بٹالین کے پہلے کرنل کو اپنے شیر دل اور سربکف سپاہیوں پر مکمل اعتماد ہے۔اسی بناء پر وہ حسینی والا محور میں مشکل ترین فریضے سے عہدہ برآ ہونے کا چیلنج قبول کرتا ہے۔بریگیڈ کی طرف سے اس پلٹن کو درج ذیل ٹاسک دیا گیا ہے:

1-ریلوے بند۔

2-قصر ہند اور اردگرد کا علاقہ۔

3-دیپال پور نہر کا شمال مغربی بند پل تک۔

اس کے علاوہ بعض دیگر کاموں کے لئے تیار رہنے کا حکم بھی دیا گیا جن کا ذکر ابھی مناسب نہیں۔ محولہ بالا ٹاسک کے پیش نظر کرنل حبیب نے اپنی بٹالین کے حملے کے لئے یہ منصوبہ تیار کیا ہے:

(1)۔ میجر زاہد یاسین (ستارہ جرأت) کی کمان میں بی کمپنی اپنی جے سی پی اور ٹورسٹ انفارمیشن بیورو کے علاقے میں حملے کی ترتیب اختیار کرے گی اور پھر آگے بڑھ کر ریلوے بند پر دشمن کے مورچہ صاف کرتی ہوئی قصر ہند پر قبضہ کرے گی۔

(ب)۔ میجر محمد حنیف ملک شہید (ستارہ جرأت) کی زیر کمان اے کمپنی کیکر پوسٹ کے بالمقابل دیپالپور نہر کے شمال مغرب بند پر حملے کی ترتیب اختیار کرے گی اور پھر سرکنڈوں اور ہاتھی گھاس میں سے گزرتے ہوئے بند کے اوپر آٹھ سو گز تک دشمن کی مزاحمت ختم کرتی ہوئی نہر کے پل پر قبضہ کرے گی۔

(ج)۔ سی کمپنی کے دو پلاٹون سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد حسین اور صوبیدار صفدر علی شاہ (تمغہ جرأت) کی قیادت میں آزادانہ طور پر جے سی پی سے قصور فیروز پور روڈ پر پیش قدمی کریں گے۔ اس طرح سڑک کے دونوں طرف دشمن کے ان مورچوں کو برباد کیا جائے گا جو نہر کے کنارے اے کمپنی پر اور ریلوے بند کی طرف بی کمپنی پر پہلو سے فائر کر رہے ہوں گے۔

(د)۔ میجر محمد اشرف کی زیر قیادت ایک ایڈہاک کمپنی کھڑی کی جائے گی جس میں سی کمپنی کا باقی ماندہ ایک پلاٹون اور ہیڈ کوارٹر کمپنی کے دو پلاٹون شامل ہوں گے۔ ہیڈ کوارٹر کمپنی کے دونوں پلاٹونوں میں اردلی، رنر، انٹیلی جنس، سگنلز اور اس قسم کا دوسرا دفتری عملہ ہے۔

ایڈہاک کمپنی کو بطور ریزرو استعمال کیا جائے گا۔ لیکن اصل حملے میں ہیڈ کوارٹر کے دو پلاٹون کرنل حبیب کے ساتھ نہر کے بند پر چلے جاتے ہیں اور ایک پلاٹون میجر اشرف کے زیر کمان بچھڑ کر قصر ہند پر جا نکلتا ہے۔ بعد میں میجر اشرف کو بریگیڈ کمان سے حکم ملتا ہے کہ وہ اپنے پلاٹون کے ساتھ ستلج کے پل اور ہیڈ ورکس کی طرف بڑھے۔

(ہ)۔ ٹینکوں کے دو ٹروپ بلوچ رجمنٹ کی مدد کے لئے دیئے جائیں گے۔ ان میں ایک ٹروپ صفر ساعت پر حرکت میں آجائے گا اور جے سی پی پر کھڑا ہو کر دشمن کے ریلوے بند کو گولہ باری سے اڑا دے گا۔ بعد میں وہ آگے بڑھ کر اے اور بی کمپنی کی مدد کرتا ہوا پل پر جا کر پوزیشن لے لے گا تاکہ دشمن کے جوابی حملے کو روکنے میں آسانی رہے لیکن حملے کے وقت پورے کا پورا اسکواڈرن سڑک پر پیش قدمی کرتا ہوا نہر کے پل

تک جا پہنچتا ہے۔

13 دسمبر کی سہ پہر کو جونہی یہ خبر ڈویژنل آپریشن میں میجر جنرل عبدالمجید ملک کو موصول ہوتی ہے کہ پاکستان کے ازلی وابدی دشمن نے اب مغربی سرحدوں پر بھی وسیع پیمانے پر یلغار شروع کر دی ہے تو وہ غصے سے دانت پیسنے لگتے ہیں اور رذیل دشمن کو عبرتناک سبق سکھانے اور اس محاذ پر اسے پہل کے فوائد سے محروم کرنے کے لئے گنڈا سنگھ والا کے علاقے میں متعین دفاعی بریگیڈ کو طے شدہ جنگی منصوبے کے تحت حرکت میں آنے کا حکم دیتے ہیں۔

بریگیڈ کمانڈر (اب میجر جنرل) محمد ممتاز خاں (ستارہ جرأت، ہلال جرأت) اس وقت بخار میں تپ رہے ہیں۔ انہیں بار بار ہسپتال جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے، لیکن وہ صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر اپنا ہیڈ کوارٹر چھوڑنے پر بالکل تیار نہیں۔ اسی حالت میں بلوچ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفسر کرنل حبیب احمد کو طلب کرتے ہیں اور حملے کی مختصر سی ہدایات دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔

وقت بہت کم ہے، حملہ آور دستوں کو ابھی منظم بھی کرنا ہے اور پھر تین چار میل کی مسافت طے کر کے جے سی پی پر بھی پہنچنا ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ دشمن کہیں پہل نہ کر دے اور بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔

کرنل حبیب کی جیپ کٹے پھٹے اور گرد آلود راستوں پر پوری رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ اس کا رخ بٹالین ہیڈ کوارٹر کی طرف ہے جہاں تمام کمپنی کمانڈر پہلے ہی جمع ہو چکے ہیں۔ ان میں میجر محمد حنیف ملک بھی ہے جو ٹھیک دو گھنٹے بعد شہادت کی خلعت سے سرفراز ہو جاتا ہے۔ اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ میجر ملک جلدی سے ریسیور کان سے لگاتا ہے۔ ان کا ایک صوبیدار نبی بخش لائن پر ہے۔ ''سر ہمیں آج حکم ملا ہے کہ جے سی پی کے سامنے نہر کے بند پر کرنل کا مورچہ تیار کرنے جائیں۔''

''ہونہہ!'' میجر حنیف ملک شرارت آمیز ہنسی ہنستا ہے۔

''سر، آپ کو شکار کا بہت شوق ہے نا، میرا خیال ہے میں آپ کی بندوق بھی لیتا چلوں تا کہ آپ وہاں آئیں، تو شکار سے جی بہلا سکیں۔''

''پگلے نبی بخش، آج شکار وافر تعداد میں میسر آئے گا۔ خدا کی قسم، مزا آ جائے گا۔''

میجر حنیف کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ ادھر لائن کے دوسرے سرے پر نبی بخش کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ صاحب کو آج مذاق کی کیا سوجھی ہے۔

اسی اثناء میں کرنل حبیب ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوتا ہے۔ تینوں کمپنی کمانڈر مودب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کرنل انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے اور پھر نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ حملے کے احکامات دے کر رخصت کر دیتا ہے تا کہ وہ جوانوں کو فوراً تیار کر کے مقام اجتماع کی طرف روانہ ہو جائیں۔

میجر حنیف ملک اپنی کمپنی میں پہنچتا ہے: صوبیدار نبی بخش ورکنگ کے لئے چند جوان اکٹھے کر رہا ہے۔ میجر نئے احکامات سناتا ہے تو جوان خوشی سے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں۔ وہ مہینوں سے اس ساعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اب ان کے تمام بندھن ٹوٹ گئے ہیں اور فرط مسرت سے اچھل پڑتے ہیں۔ صوبیدار نبی بخش اپنے پلاٹون کو جمع کرتا ہے اور انہیں صورتحال کی نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ ''ایک طرف تمہارا خون ہے اور دوسری طرف بہو بیٹیوں کی عزت کا سوال ہے۔ اگر خون کی قربانی دو گے تو عزت محفوظ رہے گی..... خون بچاؤ گے تو عزتوں کا سودا کرنا پڑے گا۔''

جوان چلا کر جواب دیتے ہیں: ''ہم اپنا خون پیش کریں گے، ہم اپنے گلے کٹوائیں گے لیکن عزتوں کا سودا نہیں ہونے دیں گے۔''

ادھر میجر حنیف ملک اپنے والد کا خط پڑھ رہا ہے جو آج ہی کی ڈاک میں اسے موصول ہوا ہے۔ اس سے پہلے میجر ملک ایک خط میں اپنی تین سالہ بچی صاعقہ سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ اسے دہلی اور آگرہ کی سیر کرائے گا ورنہ گھر واپس نہیں آئے گا۔

ایک اور مقام پر صوبیدار صفدر اپنے پلاٹون کے سامنے جہاد اور ایثار کے موضوع پر تقریر کر رہا ہے: ''موت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، ہزار گولیاں بھی جسم سے پار ہو جائیں، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ سوائے اس کے کہ گولی کسی نازک جلہ پر لگے، لیکن شہادت کی موت حیات جاودانی کا آغاز ہے اور یہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔''

مقام اجتماع پر مختلف کمپنیاں پہنچ رہی ہیں۔ کھانے کا وقت بھی ہو چکا ہے لیکن کھانے کا ہوش کسے ہے! سبھی جذبہ جہاد سے سرشار ہیں۔ بھوک پیاس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپنی ماں بہنوں کا بھی کسی کو خیال نہیں، صرف ایک دھن ہے، دشمن پر قہر خدا بن کر ٹوٹ پڑیں اور اسے پچیس سالہ شرارتوں کا مزا چکھائیں۔ صرف اسی صورت میں ان کی اپنی ہی نہیں کروڑوں ماؤں، بہنوں کی عفت و عصمت محفوظ رہ سکتی ہے۔

کرنل حبیب کی جیپ نمودار ہوتی ہے۔ جوان زور شور سے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں۔ کرنل اونچی آواز میں

مخاطب ہوتا ہے:

''میرے بچو! میرے پاس کوئی خاص حکم نہیں، اس لئے حکم نہیں کہ میرے پاس وقت نہیں۔ کمپنی کمانڈروں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ یاد رکھو جس مقدس مقصد کے لئے قوم اور ملک نے ہمیں تیار کیا ہے اسے انجام دینے کا وقت آ گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ صرف چالیس منٹ باقی ہیں اور تمہیں حملے کی جگہ (جے سی پی کا علاقہ) میں پہنچنے کے لئے دو میل کا فاصلہ بھی طے کرنا ہے۔ آگے بڑھو اور دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دو۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ جلدی کرو۔ آگے بڑھو..... دوڑو..... شاباش.....خدا حافظ!''

ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ جذب و شوق فزوں تر ہو رہا ہے۔ دسمبر کی ٹھنڈی شام ہونے کے باوجود جوانوں کا خون کھولنے لگتا ہے۔ کرنل نے جوانوں کو نعرے بازی سے روک دیا ہے تا کہ دشمن کو اچانک اور تحیر کے عالم میں جالیں۔

کرنل جیپ میں سوار ہو کر آگے چلا گیا ہے۔ پیچھے پیچھے جوان ایک قطار میں تقریباً دوڑ رہے ہیں۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ان کے پاس بہت کم وقت ہے۔ میجر حنیف ملک مقابلتاً بھاری جثّے کا ہے لیکن آج اس کی پھرتی بھی لائق دید ہے، وہ اپنی پوری کمپنی سے آگے ہے۔

مارچ کرتے وقت مختلف کمپنیوں کی ترتیب یہ ہے:۔

1- میجر زاہد یاسین کی بی کمپنی۔

2- صوبیدار صفدر علی شاہ کا پلاٹون۔

3- سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد حسین کا پلاٹون۔

4- میجر محمد حنیف ملک کی اے کمپنی

5- بٹالین کا تدبیراتی ہیڈ کوارٹر

6- میجر محمد اشرف کی ایڈ ہاک کمپنی۔

سفیدہ بند پر پہنچتے ہیں تو وہاں کرنل حبیب انتظار میں کھڑا ہے۔ بریگیڈئر کے تدبیراتی ہیڈ کوارٹرز سے کیپٹن اعجاز حسین دوڑتا ہوا آتا ہے، وہ ہانپتی لرزتی آواز میں ایک ضروری پیغام دینے لگتا ہے تو کرنل اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے: ''بیٹا پہلے سانس درست کر لو، پیغام بعد میں دے لینا۔''

اسی جگہ تمام جوان اور افسر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں جنگ میں سے کون زندہ بچ کر آئے گا اور کون شہادت کا مرتبہ حاصل کرے گا۔ کرنل حبیب ایک کمپنی کمانڈر کو بڑے جوش سے بھینچ رہا ہے۔ بعد میں صوبیدار صفدر پر نظر پڑتی ہے۔ اس کے سر پر لوہے کا ہیلمٹ نہیں ہے۔ خود کرنل کی بھی یہی حالت ہے۔ صوبیدار صفدر اپنے کمانڈر کی نظریں بھانپ لیتا ہے اور کپڑے کی ٹوپی سر سے اتار کر ہوا میں لہراتا ہے اور کہتا ہے ''جناب، یہ اس بات کی علامت ہے کہ کوئی خوف وخطر نہیں۔''

کرنل حبیب جیپ میں بیٹھ کر دوبارہ آگے کی طرف چل کھڑا ہوتا ہے۔ ابھی وہ پل سے پچاس ساٹھ گز دور پہنچا ہے کہ اپنا توپ خانہ شیلنگ شروع کر دیتا ہے۔ جیپ مزید آگے بڑھتی ہے تو اس کے اوپر سے مشین گن کے ٹریسر راؤنڈ گزرتے ہیں۔ ڈرائیور کمال ہوشیاری سے جیپ کو دائیں بائیں موڑ لیتا ہے اور فائر کی زد سے باہر نکل جاتا ہے۔ تقریباً سو گز آگے کرنل حبیب عبوری مقام پر کھڑے ہو کر بٹالین کا انتظار کرتا ہے۔ یہ جگہ کیکر پوسٹ سے کوئی دو سو گز پیچھے دیپالپور نہر کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہاں سے جوانوں کو نہر میں سے گزر کر اپنے اپنے مقصود کی طرف حملہ کرنا ہے۔

کرنل حبیب اپنے سگنلر سے دریافت کرتا ہے کہ ابھی بریگیڈ کے تدبیراتی ہیڈ کوارٹر سے اسالٹ وائر کے ذریعے رابطہ قائم ہوا ہے یا نہیں۔ واضح رہے کہ یہ تار عام ٹیلی فون لائن سے قدرے مختلف اور مضبوط ہوتی ہے۔ سگنلر نفی میں جواب دیتا ہے۔ اس اثناء میں جوان نہر عبور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کرنل چلا چلا کر جوانوں کے جذبہ جہاد کو مہمیز لگا رہا ہے۔ ''جائے گی، جائے گی، بلوچ رجمنٹ جائے گی۔''

نہر میں دو تین فٹ گہرا پانی ہے جوانوں کے لئے یہ کوئی رکاوٹ نہیں۔ نہر کے وسط میں پہنچتے ہیں۔ تو دشمن کا توپ خانہ بے پناہ فائر کھول دیتا ہے۔ گولے پانی میں پھٹ رہے ہیں۔ پانی میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ جوان چھینٹوں سے بھیگ رہے ہیں۔ گولوں کے ٹکڑوں سے انہیں زخم پر زخم آ رہے ہیں لیکن وارفتگی شوق انہیں کشاں کشاں آگے ہی آگے لئے جا رہی ہے۔

تین گبھرو مجاہد ریکالیس رائفل اٹھائے اگلے کنارے پر پہنچنے والے ہیں کہ بھاری توپ کا ایک گولہ عین ان کے درمیان پھٹتا ہے۔ تینوں جوان اسی جگہ جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حسینی والا کی دھرتی نے پاک فوج کے جیالوں کی قربانی لینا شروع کر دی ہے۔ ان میں سپاہی رفیع اللہ بھی خاک وخون میں لتھڑا پڑا ہے۔ اس کے گورے چٹے چہرے سے خون کا فوارہ پھوٹتا ہے۔ گرم گرم خون افق پر شفق کی طرح چمکنے لگتا

ہے۔ پاک فوج کے دوسرے جوان اس کے خون کی حدت محسوس کرتے ہیں، انتقام کا جذبہ شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔

جنگ میں دشمن کے جو کاغذات پکڑے گئے ہیں، ان سے پتہ چلا ہے کہ دشمن نے اس عبوری مقام کو (ڈی ایف، اس او ایس) مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ توپ خانہ اپنے پرائے کی تمیز کئے بغیر فائر ایک خاص جگہ پر مرکوز کر دیتا ہے۔ یہ فائر اس وقت دیا جاتا ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ حملہ آور کو روکنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔

بٹالین کے تدبیراتی ہیڈ کوارٹر کا رابطہ بریگیڈ کمان سے ہو چکا ہے۔ کرنل حبیب بنکر میں بیٹھا ہوا لمحہ لمحہ کی خبریں پیچھے بھیج رہا ہے۔ اس وقت وہ اپنی بٹالین کا اعصابی مرکز ہے۔ اسے پورے معرکے کے دوران میں اسی جگہ بیٹھ کر جوانوں کو کنٹرول کرنا ہے۔

ایڈہاک کمپنی کا کمانڈر میجر محمد اشرف کرنل کو سیلوٹ کرتا ہے: ''سر ! مجھے بھی حملے میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔''

''تمہاری کمپنی ریزرو میں رکھی گئی ہے تاکہ اگر کسی طرف ہمارا حملہ رک جائے تو وہاں بطور کمک بھیجا جا سکے۔''

''مجھے پیچھے بیٹھے رہنا ہرگز پسند نہیں۔ میجر اشرف اصرار کرتا ہے اور کرنل اسے حرکت میں آنے کی اجازت دے دیتا ہے۔

''میرے خیال میں میجر حنیف ملک کی اے کمپنی کا ٹاسک سب سے زیادہ دشوار ہے، بہتر یہی ہے کہ تم بھی اس کے پیچھے نہر کے شمالی مغربی بند پر پیش قدمی کرو۔'' کرنل کا یہ آخری فیصلہ ہے۔

تقریباً پانچ دس منٹ کے بعد کرنل حبیب بریگیڈ کمان کو اطلاع دیتا ہے کہ اس کی پوری بٹالین نہر پار کر کے حملے میں جا چکی ہے۔ اس کے بعد کرنل اپنا تدبیراتی ہیڈ کوارٹر چھوڑ دیتا ہے اور خود بھی اپنے ان ''بچوں'' کے پیچھے چل پڑتا ہے جنہیں اس نے مہینوں کی محنت شاقہ اور تربیت کے بعد آگ اور بارود کے قیامت خیز طوفان میں آگے بھیج دیا ہے۔ یہ ان کی کڑی آزمائش کا وقت ہے اور کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل حبیب احمد ایسی سنگین صورتحال میں انہیں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا۔

دیپالپور نہر کے کنارے

میجر محمد حنیف کی اے کمپنی کو سخت ترین کام دیا گیا ہے۔ انہیں سرکنڈوں اور خاردار جھاڑیوں کے دشوار گزار علاقے سے آگے سرحد پار کر کے آٹھ سو گز تک نہر کے بند پر دشمن کے بنکروں کو برباد کرنا ہے اور پھر نہر کا پل قبضے میں لینا ہے۔

جونہی یہ کمپنی نہر کو عبور کرتی ہے، اسے گھنے جنگل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام حالات میں یہاں حملے کی قدیم ترتیب اختیار نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جوانوں کے منتشر ہونے کی وجہ سے کنٹرول ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تین چار فٹ سے زیادہ دور تک کچھ نظر نہیں آتا۔ چہ جائیکہ رات کی تاریکی میں یہاں سے گزرا جائے اور امید یہ ہو کہ نظم و ضبط برقرار رہے جبکہ اوپر سے بے پناہ شیلنگ ہو رہی ہو اور دائیں بائیں سے خودکار ہتھیاروں کے فائر سے جھاڑی کا ایک ایک پتہ چھلنی ہو رہا ہو۔

ان مشکلات پر جنگ سے پہلے منصوبہ بندی کے مرحلے میں قابو پایا جا چکا ہے۔ پہلے تو سرکنڈے کاٹے جاتے ہیں لیکن یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل ہے، اسے چھوڑ کر سرکنڈوں کو آگ لگانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے لیکن اس طرح حملے کے وقت اپنے جوان دشمن کو صاف نظر آ سکتے ہیں۔ بالآخر میجر حنیف یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ عبوری مقام سے لے کر نہر کے کنارے کنارے سرحدی برجی تک ایک کرال ٹریک کھود لیا جائے۔ یہ کام وہ خود اپنی نگرانی میں انجام دیتا ہے۔ کرال ٹریک تقریباً چار سو گز لمبا اور چار پانچ فٹ گہرا ہے۔ اس کے اندر آدمی دشمن کی نگاہوں سے چھپ بھی سکتا ہے اور فائر سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

میجر حنیف یہاں کئی بار ریکی کر چکا ہے تاکہ زمین کے ایک ایک انچ سے واقفیت بھی ہو جائے اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر بھی رکھ سکے۔ کئی بار کرنل حبیب بھی دیگر جوانوں کے ساتھ یہاں ریکی میں شامل ہوا ہے۔ ایک روز میجر حنیف اور نائک ذوالفقار تنہا آتے ہیں۔ وہ عین سرحدی خط پر آ کر لیٹ جاتے ہیں اور سرکنڈوں سے آگے دشمن کے علاقے میں سر نکال کر دیکھتے ہیں۔ ان کا آدھا دھڑ پاکستان میں ہے اور آدھا بھارت میں۔ اچانک ایک سکھ سنتری انہیں دیکھ لیتا ہے اور وہ فوراً پیچھے ہٹ آتے ہیں۔

بہرحال ہمارے جوانوں کو مسلسل ریکی کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ دشمن نے دیپالپور نہر اور سڑک کے درمیان بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ ان کے علاوہ خاردار تاروں کی رکاوٹیں بھی موجود ہیں۔ مائن فیلڈ

اندازا 150x50 فٹ ہے۔اس میں سے گزرنے کے لئے تیس تیس گز لمبی دو تین سیڑھیاں بنالی گئی ہیں تاکہ پہلے ایک سیڑھی بچھادی جائے اور پھر اس پر چل کر دوسری سیڑھی آگے رکھ دی جائے اور بعد میں پوری کمپنی ان پر سے گزر سکے لیکن اصل حملے میں یہ ترکیب استعمال نہیں کی جاسکی۔سیڑھیاں خاصی وزنی ہیں اور پیچھے کہیں راستے ہی میں پھینک دی گئی ہیں۔

کرال ٹریک میں سب سے پہلے 27 چک شمالی (سرگودہا) کے صوبیدار محمد اقبال (ستارہ جرأت) کا پلاٹون داخل ہوتا ہے۔اسے اپنے توپ خانے کا کورنگ فائر مل رہا ہے۔جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے توپ خانہ فائر اٹھا کر آگے کر دیتا ہے۔دوسرے نمبر پر صوبیدار نبی بخش کا پلاٹون ہے۔صوبیدار اقبال اس سے رخصت ہوتے وقت کہہ گیا ہے: ''دوست، خدا حافظ! نہر کے پل پر ملیں گے۔''لیکن صوبیدار نبی بخش کوئی تیس چالیس گز آگے بڑھتا ہے کہ توپ کا گولہ اس کے سامنے پھٹتا ہے۔ایک ٹکڑا ناک کے قریب منہ پر لگتا ہے۔صوبیدار چکرا کر گر پڑتا ہے۔ پیچھے سے میجر حنیف پہنچتا ہے تو نبی بخش کو ایک طرف لٹا دیتا ہے تاکہ جوانوں کے لئے رکاوٹ نہ بنے اور ساتھ ہی یہ الفاظ میجر کے منہ سے نکلتے ہیں:

''نبی بخش، تو نے میرا ایک بازو توڑ دیا۔''

زخمی صوبیدار خون زیادہ بہہ جانے کے باعث بے ہوش ہو جاتا ہے۔

میجر حنیف آگے بڑھتا ہے.....اب تیسرا پلاٹون نائب صوبیدار لال خاں کی قیادت میں کرال ٹریک تک پہنچ جاتا ہے اور پیش قدمی شروع کر دیتا ہے۔

ادھر سب سے اگلا پلاٹون کرال ٹریک کے آخری سرے پر پہنچ چکا ہے۔صوبیدار اقبال نہر کے بند پر چڑھنے کے بجائے بائیں طرف ہو کر سرحدی برجی سے آگے جوانوں کو دشمن کے علاقے میں پھیلا کر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن چند قدم آگے جانے سے خاردار تار نظر آجاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ دائیں طرف مڑ جاتا ہے اور نہر کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں کا کنارا کٹا پھٹا اور ناہموار سا ہے۔نہر کی کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر لگے ہیں۔اس سے بند کے اوپر کئی نشیبی جگہیں بن گئی ہیں۔ان سے ہمارے جوانوں کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ دشمن کے مورچے مقابلتاً بلند جگہ پر ہیں اور ہمارے جوان نشیب میں سے رینگ کر آگے نکل جاتے ہیں۔صوبیدار اقبال بند کے اوپر ایک پگڈنڈی پر چلنے لگتا ہے۔ پگڈنڈی کے ساتھ ایک جھاڑی کے نیچے ننگا مائن پڑا ہے۔ایک سپاہی محمد زراعت کا پاؤں پھسل کر اس پر جا پڑتا ہے۔زوردار دھماکہ ہوتا ہے اور

زراعت کا ایک پاؤں ٹخنے سے جدا ہو جاتا ہے۔

مائنوں کی حفاظتی تار ختم ہو جاتی ہے تو صوبیدار اقبال کو ایک جھرجھری سی آتی ہے۔ ظاہر ہے اب دشمن کے مضبوط بنکر شروع ہونے والے ہیں اور ہمارے مجاہدوں کی یہ حسرت پوری ہونے والی ہے کہ وہ ناپاک دشمن کا سر کچل سکیں۔ صوبیدار اقبال بند سے دائیں طرف نیچے اترتا ہے تو اسے دشمن کا کرال ٹریک مل جاتا ہے۔ وہ اپنے پلاٹون کے ساتھ اس میں کود پڑتا ہے۔ اب وہ اس کی آڑ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ انتہائی سرعت سے دشمن کے عقب میں پہنچ جائیں۔ اس طرح دشمن خواہ کتنا ہی دلیر کیوں نہ ہو، گھبرا جاتا ہے اور مزاحمت ختم کر دیتا ہے۔

کوئی پچاس گز آگے صوبیدار اقبال کو بائیں طرف بلند کنارے پر ایک پختہ بنکر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مغربی جانب کے فاکس ہول سے نہر کے دوسرے کنارے کی طرف بے تحاشا فائر ہو رہا ہے۔ دشمن کو ہمارے حملے کا زیادہ تر خطرہ نہر کے مغربی کنارے کی طرف سے ہے۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں کہ پاک فوج کے جوان سرکنڈوں کے جنگل، خاردار جھاڑیوں، تاروں کی رکاوٹ، بارودی سرنگوں اور بے شمار دوسری مشکلات میں سے گزر کر نہر کے شمالی مغربی کنارے پر بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

ایس ایس جی کا یہ صوبیدار اس بنکر کو برباد کر کے ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتا ہے، کیونکہ اس کا فائر نہر کے دوسری جانب پنجاب رجمنٹ کے حملے میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ پورے پلاٹون کو ذرا پیچھے رکنے کا اشارہ کر کے اپنے ساتھ حوالدار عبدالغنی، نائک ذوالفقار، نائک یار محمد اور سپاہی محمد ایوب کو لے کر بنکر کے سامنے پوزیشنوں میں لگا دیتا ہے۔ سب سے پہلے وہ خود اپنی رائفل سے ڈیڑھ میگزین فائر کرتا ہے۔ ساتھ ہی نائک یار محمد سپرانرگا سے بنکر کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ فائر کرتے وقت اس کا ہاتھ معمولی سا زخمی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نائک ذوالفقار بنکر کے دروازے میں سے گرینیڈ پھینکتا ہے اور بنکر خاموش ہو جاتا ہے۔

اب یہ پلاٹون مزید آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑی دور چل کر کرال ٹریک نہر کی تہہ کی طرف مزید دائیں جانب کو مڑ جاتا ہے تو یہ لوگ اس میں سے نکل کر ایک نشیب میں آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ یہیں پر صوبیدار اقبال تھرموس سے گرم گرم چائے پیتا ہے۔ تین اور جوان بھی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جنگ کے اعصاب شکن ماحول میں قدرے سکون اور اطمینان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ باقی ماندہ دونوں پلاٹون بھی ان کے ساتھ آ ملے ہیں۔ پیش قدمی دوبارہ شروع ہوتی ہے، نیچے سے کانٹے چبھ رہے ہیں، آسمان سے گولوں کی

بارش ہو رہی ہے۔ بائیں طرف نہر کے بلند کنارے سے اور دائیں طرف پیری میٹر سے زبردست فائر آ رہا ہے، لیکن آگ کے اس طوفان میں کسی جوان کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔

کٹی ہوئی شہ رگ کی آواز

پیچھے کمپنی کمانڈر میجر حنیف ملک اپنے وائرلیس آپریٹر اور چند ایک دوسرے جوانوں کے ہمراہ برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک جگہ وہ کرال ٹریک سے بائیں طرف ہو لیتا ہے۔ اس کا اردلی ابھی کہنا ہی چاہتا ہے کہ صاحب، ادھر نہ جائیں خاردار تاروں کا جال لگا ہوا ہے کہ میجر کی پتلون تاروں میں الجھ کر تقریباً پھٹ جاتی ہے۔ میجر دامن چھڑا کر دوبارہ صحیح راستہ اختیار کرتا ہے۔ اب وہ نائک لال خاں کو قریب بلا کر کہتا ہے: صوبیدار اقبال اکیلا آگے چلا گیا ہے، تمام جوانوں کو تیزی سے اس کے پیچھے بھیجو۔ نہیں تو اقبال خطرے میں آ جائے گا۔''

لال خاں یہ پیغام آگے پاس کرنے ہی والا ہے کہ صرف تین فٹ دور گولہ پھٹتا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا میجر حنیف ملک کو سر میں لگتا ہے، ایک اور ٹکڑا گردن میں اندر تک دھنس جاتا ہے اور شہ رگ میں بڑا سا سوراخ ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی اسی گولے سے نائک رب نواز اور لانس نائک غلام خاں موقع پر شہید ہو جاتے ہیں، سگنلر محبوب انوار اور سرفراز خاں اور ایک حوالدار نواز کو معمولی زخم آتے ہیں۔ نواز اسے اٹھا کر نہر کے بند کے اوپر کیکر کے درخت کے ساتھ اپنے ایک مورچے میں لٹا دیتا ہے۔ میجر ابھی تک ہوش میں ہے اور اسے پتہ چل گیا ہے کہ اس کا کمانڈنگ آفیسر بذات خود حملے میں شریک ہو چکا ہے۔ وہ اپنے اردگرد جمع ہونے والے جوانوں کو چلا چلا کر آگے بڑھنے کی ہدایت کرتا ہے: ''جب کرنل آگے جا سکتا ہے تو تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ خدا کا نام لو اور میدان جہاد میں کود جاؤ۔''

ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ بولتے بولتے میجر حنیف ملک کی آواز کٹی ہوئی شہ رگ سے نکلنے لگتی ہے..... تھوڑی دیر بعد گردن کے اس سوراخ میں سے جھاگ سی نمودار ہوتی ہے اور اسلام کا یہ عظیم مجاہد کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے حیات جاودانی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اچانک اس کے ہونٹوں پر خوشگوار سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور اقبال کے مرد مومن کی تعبیر ''چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست''

وقت کی میزان پر درست ثابت ہوتی ہے۔

تقریباً اسی وقت صوبیدار محمد اقبال نہر کے پل پر قابض ہو چکا ہے۔ راستے میں ایک جگہ اس پر بائیں طرف بلندی سے فائر آتا ہے۔ اس کا خیال ہے یہ فائر قصر ہند سے کیا جا رہا ہے لیکن ذرا آگے بڑھتے ہیں تو انہیں ایک مضبوط بنکر دکھائی دیتا ہے جو نہر کے بلند کنارے پر بنا ہوا ہے۔ سپاہی ایوب بازوکا سے بنکر کو نشانہ بناتا ہے۔ یار محمد انرگا فائر کرتا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ نائک ذوالفقار ہینڈ گرینڈ پھینک کر اسے خاموش کر دیتا ہے۔ صوبیدار اقبال بھی رینگ رینگ کر قریب ہو جاتا ہے تاکہ دشمن زیادہ مزاحمت کرے تو جھپٹ کر اس کا کام تمام کر دے۔ یہاں کیکر کا ایک بلند درخت ہے۔ اس کے اوپر دشمن کی آبزرویشن پوسٹ بنی ہوئی ہے۔ اس درخت پر بھی سٹین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ ماری جاتی ہے۔

آگے ایک ٹینک شکن توپ کا مورچہ ہے لیکن اس وقت خالی پڑا ہے۔ یہاں دشمن سامنے آنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس اثناء میں پیچھے سرکنڈوں کو آگ لگ جاتی ہے مگر یہ لوگ اس سے خاصے آگے ہیں۔

اب ایک دمدمہ ان کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ سپاہی ایوب اپنے بازوکا، کا ٹریگر دباتا ہے۔ یار محمد انرگا فائر کرتا ہے۔ دمدمہ خاموش ہو جاتا ہے۔ پلاٹون آگے بڑھتے ہیں۔ اب وہ عین پیری میٹر کے مقابل پہنچ گئے ہیں۔ ادھر سے ہر قسم کے خودکار ہتھیاروں کا فائر آ رہا ہے، آر آر گنوں نے بھی تباہی مچا رکھی ہے۔ دشمن کے توپ خانے کی شیلنگ بھی شدت اختیار کر لیتی ہے۔ صوبیدار اقبال اور اس کے ساتھی فائر کو دیکھتے ہوئے اپنی پوزیشن تبدیل کر لیتے ہیں۔ اسی دوران میں سپاہی لطف اللہ شہید ہو جاتا ہے۔

نہر کے بند کی چوڑائی یہاں آ کر بہت کم ہو گئی ہے اور صرف ایک ابھرا ہوا کنارہ باقی رہ جاتا ہے۔ چاروں طرف درختوں کی بہتات ہے۔ ارنڈ کے پودے بھی کثرت سے ہیں۔ صوبیدار اقبال نے ایک ارنڈ کے نیچے پوزیشن لے رکھی ہے۔ ایک گولے کی چمک میں اسے نہر کا پل نظر آ جاتا ہے۔ یہی اس کی منتہائے مقصود ہے۔ اس وقت اسے جو مسرت حاصل ہوتی ہے، زندگی بھر اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ جنگ سے پہلے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں کرنل حبیب صوبیدار سے کہتا ہے: ''جو شخص نہر کے پل پر پہنچے گا، اس کے لئے اعلیٰ ترین اعزاز کی سفارش کروں گا۔''

''سر! میں سب سے پہلے وہاں پہنچوں گا۔'' اقبال اپنا عزم ظاہر کرتا ہے۔

''پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ جوانوں کو بھی ساتھ لے لر جاؤ۔'' سینئر جے سی او صوبیدار محمد اقبال کو اس وقت

یہ باتیں صرف اس لئے یاد آ رہی ہیں کہ ان سے نہر کے پل کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور ساتھ ہی کمانڈنگ آفیسر کی ایک آرزو پایہ تکمیل تک پہنچتی دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ اعزاز اور تمغوں وغیرہ کا خیال کسی کو بھی نہیں۔۔ ساری فوج دشمن کی ننگی جارحیت کا سر کچلنے کے لے ءحرکت میں آتی ہے۔ افسر سے لے کر جوان تک ہر شخص فرض کی پکار پر لبیک کہہ رہا ہے۔ محض تمغوں کے لئے کوئی دیوانہ ہی جان کی بازی لگا سکتا ہے۔

آر آر کا ایک ایک گنر، صوبیدار اقبال کو میجر حنیف ملک کی شہادت کی خبر سناتا ہے۔ صوبیدار اقبال جس کا دماغ، مقصود پر پہنچنے کے باعث خوشی کے جذبات سے معمور ہے، یکبارگی چکرا کے رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف کمپنی کا سیکنڈ ان کمانڈ ہونے کی وجہ سے نئی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑتا ہے۔

صوبیدار اس صدمے سے سنبھلتا ہے اور پوری کمپنی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے جو اس وقت تک پل پر پہنچ چکی ہے۔

وہ پل پر اپنا قبضہ مستحکم بنانے کے لئے کمپنی کی تنظیم نو کرتا ہے:۔

☆ حوالدار عبدالعزیز کا پلاٹون سڑک پار کر کے نہر کے ریگولیٹر تک پل کے بائیں طرف بٹھا دیا جاتا ہے۔

☆ حوالدار سلطان خاں کا پلاٹون پل کے ساتھ دائیں طرف پوزیشنیں سنبھال لیتا ہے۔

☆ حوالدار سلطان احمد کو نہر کے بند کے پیچھے نشیب میں سڑک کی جانب پوزیشن لینے کا حکم ملتا ہے لیکن اسے سختی سے ہدایت ہے کہ فائر کرتے وقت احتیاط برتے کیونکہ اس جانب قصر ہند پر میجر زاہد یاسین کی کمپنی اور سڑک کے اوپر صوبیدار صفدر اور لیفٹیننٹ محمد حسین کے پلاٹون برسر پیکار ہیں۔

ابھی یہ سب لوگ اپنی اپنی منزل کا رخ بھی نہیں کر پاتے کہ دشمن ایک بار پھر اپنا تمام تر فائر اور توپ خانے کی شیلنگ اسی جگہ مرکوز کر دیتا ہے۔ قیامت کا سماں ہے، زمین سرخ ہو رہی ہے، فضا میں بارود کی بو بسی ہوئی ہے، بڑے بڑے پتھر ریزہ ریزہ ہو کر دور دور تک گر رہے ہیں۔ اس جہنم زار میں جوان بدستور اپنی اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ گولہ باری سے ایک انچ زمین بھی محفوظ نہیں۔ اچانک ایک گولہ پھٹتا ہے، یہاں صوبیدار اقبال، اس کا اردلی اور حوالدار سلطان خان ایک دوسرے کے ساتھ پوزیشن لئے ہوئے ہیں۔ پہلے دونوں مجاہد معجزانہ طور پر محفوظ رہتے ہیں مگر گولے کے چند ایک ٹکڑے حوالدار سلطان خاں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ ادھر نہر کے پل کے بائیں طرف ایک بیرک کے دروازے پر توپ کے گولے سے تین جوان شہید ہو جاتے

ہیں۔ان میں سپاہی اختر اور محمد اقبال کے علاوہ جواں ہمت نائک ذوالفقار بھی شامل ہے جس نے پورے معرکے میں دشمن کے بنکروں میں ہینڈ گرینیڈ پھینک کر کمپنی کی پیش قدمی کو ممکن بنایا ہے۔ سیز فائر کے بعد نائک ذوالفقار کو لازوال کارناموں کے اعتراف میں تمغہ جرأت کا اعزاز دیا جاتا ہے۔انہی شہیدوں کو پانی پلانے کے لئے ایک سپاہی محمد بوٹا اپنی پوزیشن سے اٹھتا ہے۔قریب ہی ایک نلکا ہے۔وہ پانی لے کر شہیدوں کی طرف بڑھ رہا ہے کہ پیپل کے ایک درخت کے قریب گولہ پھٹنے سے خود بھی شہید ہو جاتا ہے۔ پل کے دائیں طرف ایک سپاہی محمد اسلم اس طرح شہید ہوا پڑا ہے جیسے ٹیک لگا کر ستا رہا ہو۔صوبیدار اقبال اسے اس پوزیشن میں دیکھ کر کہتا ہے: ''اسلم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ یہ وقت ستانے کا نہیں، سیدھی طرح پوزیشن لو۔'' مگر کوئی جواب نہیں آتا تو صوبیدار آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑتا ہے لیکن اس کی روح تو قفس عنصری سے پرواز کر کے اعلیٰ علیّین میں پہنچ چکی ہے۔صوبیدار اقبال کے جوان قربانی پر قربانی دے رہے ہیں۔ وہ پل پر اپنا قبضہ کسی صورت بھی چھوڑنا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف پیری میٹر کے مورچے نہر کے پار صرف پچیس تیس گز دور ہیں۔وہاں سے بے تحاشا فائر بھی آ رہا ہے اور غلیظ گالیاں بھی۔

کرنل میدان کارزار میں

بلوچ رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل حبیب احمد اپنے آپ کو افسر سے عام سپاہی بنا لیتا ہے۔ کتابی اصولوں کے مطابق اسے محاذ جنگ سے سو دو سو گز پیچھے اپنے تدبیراتی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے رہنا چاہئے تا کہ لمحہ بہ لمحہ جنگ کی بدلتی ہوئی صورتحال کو احسن طریقے سے کنٹرول کر سکے لیکن اس وقت سب کتابیں بند کی جا چکی ہیں۔عقل بالائے بام محو تماشا ہے اور جذبہ وجنوں حسینی والا کے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں کود جاتا ہے۔ عشق مصلحتوں کی دیوار پھاند لیتا ہے اور ایک کرنل جوانوں کے دوش بدوش شجاعت کے جوہر دکھانے لگتا ہے۔

کرنل حبیب احمد نہر میں اترتا ہے تو پہلے وہ گہرے پانی کی طرف جا نکلتا ہے۔ پھر چکر کاٹتے ہوئے عام راستے پر آ جاتا ہے جہاں پانی کی گہرائی کچھ زیادہ نہیں۔ دوسرے کنارے کے قریب پہنچ کر بند پر چڑھتا ہے تو گولہ باری کے دھوئیں کی وجہ سے صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا، چنانچہ کچھ آگے جا کر بند پر عموداً چڑھ جاتا ہے۔ وہ

کرال ٹریک ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتا۔ اچانک اس کی نظر ایک زخمی پر پڑتی ہے، وہ اسے شانے سے پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے: ''نبی بخش..... تم..... تم زخمی ہو..... مارو اس دشمن کو جس نے میرے بچے کو زخمی کر دیا ہے..... تم نہیں مر سکتے..... میں تمہارا انتقام لوں گا..... پاک فوج تمہارا انتقام لے گی..... تمہارا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔'' کرنل حبیب، نبی بخش کو تسلی دے کر آگے بڑھتا ہے تو اچانک خیال آتا ہے، اس وقت سرحدی برجی تک نہر کے بند پر پنجاب رجمنٹ کے جوانوں نے دفاعی پوزیشنیں لے رکھی ہیں۔ شاید انہیں ہماری پیش قدمی کی خبر نہ ہو اور وہ پیچھے سے فائر کر کے اپنے ہی جوانوں کا نقصان کرتے رہیں۔ اس خدشے کے پیش نظر وہ دوبارہ بند کے اوپر چڑھتا ہے اور اپنے آخری دفاعی مورچے میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں ٹینک شکن گن لگی ہوئی ہے۔ اس سے ایک گولہ فائر ہونے ہی والا ہے کہ کرنل، گن کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایک جوان اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے ورنہ بیک بلاسٹ سے کرنل زخمی ہو جاتا۔ کرنل حبیب پنجاب رجمنٹ کے ان جوانوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ سامنے فائر نہ کریں۔ اس کے بعد وہ اسی مورچے کے قریب، بائیں طرف بند سے نیچے اتر جاتا ہے۔ آگے کرال ٹریک بھی دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی آڑ میں وہ آگے بڑھتا ہے۔ اب اس کے ساتھ اس کے دو وائرلیس آپریٹر، سگنلر، انٹیلی جنس حوالدار اور بیٹری کے کمانڈر میجر بشیر بھی مل گئے ہیں۔ انجینئرز کا ایک سیکشن بھی ہمراہ ہے۔ اچانک دو تین جوان مائن پھٹنے سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ اسی اثناء میں دائیں طرف سے فائر آتا ہے۔ کرنل سمیت تمام جوان ادھر دوڑتے ہیں تاکہ فائر کرنے والے ہاتھ قلم کر سکیں۔ لیکن وہ خاردار جھاڑیوں میں پھنس جاتے ہیں۔ دشمن کا کوئی مورچہ دکھائی نہیں دیتا۔

کرنل حبیب جھاڑیوں سے نکلنے کے لئے ایک جوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور لگا رہا ہے کہ ایک برسٹ آتا ہے اور وہ جوان اور اس کے دو ساتھی وہیں گر پڑتے ہیں۔ ایک اور جوان کرنل سے کہتا ہے: ''سر میرے پیچھے آئیں۔'' وہ کوئی دو قدم آگے بڑھتے ہیں کہ ایک سنگل شاٹ آتا ہے اور یہ جوان بھی لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ گولی چلنے سے رائفل میں جو سیٹی ہوتی ہے، اس سے کرنل کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فائر نہر کے دوسرے کنارے سے آ رہا ہے۔ مزید پیش قدمی کے بعد کرنل حبیب ایڈہاک کمپنی کے دو پلاٹونوں سے مل جاتا ہے۔ ان کی کمان صوبیدار غلام علی اور صوبیدار سردار خاں کر رہے ہیں۔ ایڈہاک کمپنی کا کمانڈر میجر محمد اشرف ایک پلاٹون کے ساتھ بچھڑ کر قصر ہند کی طرف جا نکلا ہے جہاں میجر زاہد یاسین اپنی بی کمپنی کے ساتھ

پہلے ہی حملہ کر چکا ہے۔

بائیں طرف نہر کے بند پر کرنل کو ایک مورچہ دکھائی دیتا ہے۔ صوبیدار اقبال شاید اسے بائی پاس کر گیا ہے۔ اس میں سے بے تحاشا فائر آ رہا ہے۔ فائر کی سمت اور بلندی کا اندازہ ٹریسر راؤنڈوں سے ہو رہا ہے۔ کرنل حکم دیتا ہے کہ یہ بنکر خاموش کر دیا جائے۔ اس پر صوبیدار غلام علی گرینیڈ پھینک کر دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہاں دشمن کے چار پانچ سپاہیوں کی گلی سڑی لاشیں فائر بندی تک پڑی رہتی ہیں۔ آگے چل کر دوبارہ نہر کے دوسرے کنارے سے فائر آتا ہے جس سے انٹیلی جنس حوالدار یونس زخمی ہو کر گر پڑا ہے۔ یہیں میجر زاہد یاسین وائرلیس پر پیغام بھیجتے ہیں کہ قصر ہند پر قبضہ ہو چکا ہے۔ کرنل حبیب کا ڈرائیور نائک شہباز خاں بھی پہنچ جاتا ہے۔ کرنل پوچھتا ہے: ''تم بھی آ گئے، جیپ کی حفاظت کون کرے گا؟'' شہباز جواب دیتا ہے: 'سر، میں وہاں تنہا کھڑا تھا، کچھ اور نہ سوجھا تو آپ کے پیچھے چلا آیا۔'' ابھی یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ شہباز زخمی ہو جاتا ہے۔ کرنل آگے بڑھ چکا ہے۔ دشمن کے فائر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے کرنل کا اردلی لانس نائک بوستان خان شہید ہو جاتا ہے۔ کرنل کے دونوں وائرلیس آپریٹر پیچھے رہ گئے ہیں..... بیٹری کمانڈر میجر بشیر ابھی تک ساتھ دے رہا ہے۔ کرنل اس کے سیٹ پر بریگیڈ کمان کو اطلاع دیتا ہے: ''بلوچ رجمنٹ نے قصر ہند فتح کر لیا ہے۔'' اسی لمحے ایک گولے سے میجر بشیر زخمی ہو کر گر پڑتا ہے۔ وائرلیس سیٹ تباہ ہو جاتا ہے۔ کرنل حبیب، صوبیدار سردار اور صوبیدار غلام علی بدستور آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ دشمن کے آرٹلری فائر میں پھنس گئے ہیں۔ گولوں کی ایک دیوار ان کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے۔ صوبیدار اقبال خوش قسمت ہے کہ اس کی زد میں سے نکل چکا ہے۔ دشمن اپنا فائر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے جوان بھی رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ کرنل حبیب برابر انہیں جوش دلا رہا ہے: ''شاباش! میں تمہارا کمانڈر تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ بلوچیو، مجاہدو، آگے بڑھو۔''

اچانک ''ست ست سری اکال'' اور ''جے ہند'' کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ کرنل حبیب احمد سوچتا ہے شاید دشمن جوابی حملے کے لئے نعرے لگاتا بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ نعرے ایک ہی جگہ سے بلند ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دشمن پیری میٹر میں بیٹھا شیخی بگھار رہا ہے۔ دشمن پر دہشت طاری کرنے کے لئے کرنل بھی اپنے جوانوں کو زور زور سے نعرے لگانے کا آرڈر دیتا ہے اور پاکستان زندہ باد، بلوچ رجمنٹ زندہ باد، نعرہ

تکبیر اور نعرہ حیدری کی گونج سے دشمن کے دل دہل جاتے ہیں۔

اب سرکنڈوں کو آگ لگ چکی ہے اور وہ تیزی سے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ جلد ہی اس نے پاک فوج کے جوانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ زخمی اور شہید اس میں جل رہے ہیں۔ صوبیدار غلام علی اور صوبیدار سردار اپنی ذاتی حفاظت کی پروانہ کرتے ہوئے انہیں آگ سے باہر نکالتے ہیں۔ کرنل حبیب بھی اس آگ میں پھنسا ہوا ہے۔ اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ بائیں طرف دشمن کے مورچے ہیں اور ان کے پیچھے مائن فیلڈ ہے۔ آگ چڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس دوران میں کرنل کو چیخیں سنائی دیتی ہیں: ''مجھے بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔'' کیمبل پور کے سپاہی یار محمد کے کپڑوں میں آگ لگ چکی ہے اور وہ بری طرح مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ کرنل حبیب اس جوان کی مدد کے لئے آگے بڑھتا ہے تو ایک طرف سے کوئی جوان چلا کر کہتا ہے: ''مت جاؤ ادھر..... اس کے ایمونیشن کو آگ لگ جائے گی..... گرینیڈ اور سپرانر گے پھٹنے والے ہیں..... مت جاؤ۔'' لیکن کرنل حبیب فرض کی پکار پر لبیک کہہ رہا ہے، وہ اپنے بچے کو زندہ جلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح ممتا اپنے لخت جگر کی ذرا سی تکلیف پر بلبلا اٹھتی ہے، اسی طرح لیفٹیننٹ کرنل سید حبیب احمد کا دل تڑپ رہا ہے۔ وہ جان کی بازی لگا کر بھی اس جوان کو بچا لینا چاہتا ہے۔ کرنل اس کے پاس پہنچتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے کپڑے پھاڑنے لگتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح آگ کو مزید پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے، بہر حال کرنل آگ کی حدت کی پروا کئے بغیر یار محمد کے کپڑے پھاڑ کر دور پھینک دیتا ہے۔ اس کارروائی میں اس کی ایک انگلی بری طرح جھلس جاتی ہے لیکن جونہی اس جوان کو نار نمرود سے نجات ملتی ہے، اسلحہ پھٹنا شروع ہو جاتا ہے، مگر اب تمام لوگ اس کی زد سے باہر ہیں۔

یہ جوان آج بھی زندہ ہے اور کرنل حبیب کو اسے دیکھ کر جو راحت اور مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

آگ کی وجہ سے کرنل اور اس کے جوانوں کو سو ڈیڑھ سو گز تک سرک سرک کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ پتلونیں گھس جاتی ہیں۔ کانٹے چبھ رہے ہیں، لیکن جوان کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے اور تگ و دو کر کے آگ کے حصار سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ادھر کرنل کا ایک وائرلیس آپریٹر غلام جیلانی پہنچ جاتا ہے۔ اس کے سیٹ پر میجر زاہد یاسین سے دوبارہ رابطہ قائم ہوتا ہے تو کرنل بتاتا ہے: ''میں نہر کے پل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔'' میجر زاہد یاسین اپنے کمانڈنگ آفیسر کو بریگیڈ کمان کا یہ پیغام بھیجتا ہے: ''میجر

اشرف کو حکم ملا ہے کہ وہ آپ سے ملاپ کرے اور ہیڈ ورکس اور ستلج کے پل پر آگے بڑھ کر قابض ہو جائے''۔ کرنل پیغام ملنے کے بعد میجر اشرف کو تلاش کرتا ہے لیکن جوان اسے پہچان نہیں سکتے کیونکہ وہ چند دن قبل ہی سٹاف کالج سے یہاں تعینات ہوا ہے۔

عین اسی وقت ہمارے ٹینک نہر کے پل کے پیچھے آ کر پوزیشن لے لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کرنل نے ان ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ جے سی پی پر سنی تو اپنے ایک صوبیدار لال حسین (سگنل) کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہے کہ ٹینک اندھا دھند فائر شروع نہ کر دیں کیونکہ پاک فوج کے جوان آگے تک پہنچ چکے ہیں۔ اس کے بعد نہر کے بند پر انہیں ایک ٹینک اپنی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تقریباً پندرہ بیس گز دور آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ وہ سرکنڈوں میں نقل و حرکت دیکھ کر فائر نہ کر دے۔ کرنل حبیب اپنے ایک صوبیدار غلام علی کو بھیجتا ہے کہ پتہ کرو کہ یہ ٹینک اپنا ہے یا دشمن کا؟ وہ دور سے اس کی نالی کا رخ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اپنا ٹینک ہے۔ کرنل اسے دوبارہ بھیجتا ہے کہ ٹینک کمانڈر کو کہو یہاں بلوچ رجمنٹ کا کرنل اور کئی دوسرے جوان موجود ہیں، وہ ادھر فائر نہ کرے۔ غلام علی بھاری خطرہ مول نہ لے کر ٹینک کمانڈر کو پیغام پہنچا دیتا ہے۔

نہر کے پل کے نزدیک ایک بنکر ہے۔ کرنل اس کے پیچھے سے ہو کر سڑک پر چڑھتا ہے۔ ابھی تک اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا کہ واقعی وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ وہ دور سے سڑک کو بند وغیرہ سمجھ کر سوچ رہا ہے کہ ہم کسی غلط جگہ پر آ نکلے ہیں لیکن سڑک اور پل کو آنکھوں سے دیکھ کر اس کے دل میں والہانہ مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

بریگیڈ کمانڈر کے حکم کے مطابق کرنل نے صوبیدار غلام علی اور صوبیدار سردار کو اپنے طور پر ہیڈ ورکس پر قبضہ مستحکم کرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ جوان ایک دوسرے سے کہتے ہیں: ''اٹھو کرنل صاحب حکم دے رہے ہیں۔'' ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ ہیں کرنل کو اپنے درمیان دیکھ کر ان کے حوصلے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں۔ وہ اونچی آواز سے ایک دوسرے کو پکار رہے ہیں: ''آگے بڑھو، کرنل صاحب حکم دے رہے ہیں۔'' کرنل سوچتا ہے اس کی یہاں موجودگی کا علم دشمن کو نہیں ہونا چاہئے کیونکہ خدشہ ہے کہ دشمن اس جگہ کو نشانہ بنا لے گا۔ اس پر کرنل جوانوں سے کہتا ہے: ''میرا نام مت لو۔'' لیکن پھر خیال آتا ہے: ''ٹھیک ہے، دشمن کو پتہ لگنا چاہئے کہ کرنل بھی یہاں تک پہنچ سکتا ہے۔'' وہ جوانوں کو جوش دلانے کے لئے زور زور سے نعرے لگانے لگتا ہے۔

نہر کے پل کے قریب دشمن کے بنکر میں کرنل اپنا بٹالین تدبیراتی ہیڈکوارٹر قائم کر لیتا ہے۔ کیپٹن پرویز اقبال ریئر لنک یہاں لاتا ہے۔ وہ رات بھر میجر زاہد یاسین کے ساتھ قصر ہند پر رہا ہے۔ اس وائرلیس سیٹ پر کرنل اپنا اتا پتہ بریگیڈ کمان کو بتاتا ہے۔ تقریباً 4 بجے صبح میجر عبدالرؤف خاں اور کیپٹن اعجاز حسین خاں تازہ ترین صورتحال سے باخبر ہونے کے لئے یہاں پہنچتے ہیں۔ بعد میں بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) محمد ممتاز خاں (ستارہ جرأت، ہلال جرأت) ہاتھ میں صرف چھڑی تھامے نہر کے پل پر آتے ہیں۔ بے انتہا گولہ باری جاری ہے۔ دشمن دریا پار سے مقررہ نشانوں پر مشین گن کی فائرنگ کر رہا ہے۔ بلوچ رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سید حبیب احمد (ستارہ جرأت) گلوگیر آواز میں کہتا ہے: ''ممتاز! میرے بچے اپنی جانوں پر کھیل گئے ہیں، دیکھو، 4/دسمبر کے سورج کی پہلی کرن میں میرے شہیدوں کا لہو رچا بسا ہے۔''

فیروز پور کے دروازے پر

حسینی والا کے معرکہ حق و باطل میں کودنے والی بلوچ رجمنٹ کے دو پلاٹونوں کو قصور فیروز پور روڈ پر پیش قدمی کا حکم دیا گیا ہے۔ ایس ایس جی (کمانڈو) کے صوبیدار صفدر علی شاہ کی کمان میں ایک پلاٹون دیپالپور نہر عبور کر کے جے سی پی کی طرف بڑھتا ہے تو دشمن کے فائر کی زد میں آ جاتا ہے لیکن اسلام کے یہ عظیم مجاہد جرأت و عزیمت اور ہمت و شجاعت کی نئی اور لازوال تاریخ رقم کرنے کے لئے سربکف، منزل کی جانب لپک رہے ہیں۔ زندگی کے لئے، راستی کے لئے اور حق رسی کے لئے موت سے کھیل رہے ہیں۔

ان کی چال میں کوندے کی سی لپک ہے۔ ان کے نعروں میں بجلی کی کڑک ہے۔ فرض کی پکار کا جواب دل کی دھڑکنوں سے ''لبیک لبیک'' کہہ کر دیا جا رہا ہے۔ نگاہیں شوق شہادت سے بے قرار ہیں اور چوڑے چکلے سینے مئے توحید سے سرشار۔

منصوبے کے مطابق جے سی پی پر متعین بھارتی کوارٹر گارڈ کو پنجاب رجمنٹ کا ایک پلاٹون اپنے جواں ہمت اور جواں سال افسر میجر ظفر اقبال ثالب کی رہنمائی میں ٹھکانے لگا چکا ہے۔ اس طرح بلوچ رجمنٹ کے راستے میں حائل پہلی رکاوٹ ختم ہو چکی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اصل حملہ بلا تاخیر شروع کیا جا سکتا ہے، ورنہ ممکن ہے صوبیدار صفدر یہیں الجھ کر رہ جائے اور معینہ وقت میں اپنے مقصود تک نہ پہنچ سکے۔

بلوچ رجمنٹ کے مٹھی بھر مجاہدین جے سی پی پر بھارتی علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو

انہیں اپنے راستے میں دو بند پھاٹک دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پاکستان کی جانب ہے اور دوسرا بھارت کی طرف۔ جوان ایک لمحہ کے لئے رک سے گئے ہیں۔ وہ پھاٹک کی رکاوٹ دور کرنے کی ترکیب سوچ رہے ہیں۔ کچھ لوگ اوپر سے کودنے کی کوشش کرتے ہیں تو صوبیدار صفدر کہتا ہے: ''اوپر مت چڑھو، دشمن کا فائر بلندی سے گزر رہا ہے، اس سے زخمی ہو جاؤ گے۔ پھاٹک کے دائیں بائیں سے آگے بڑھو۔''

اس اثناء میں وہ خود دائیں طرف سے ہو کر پاکستانی کوارٹر گارڈ کے برآمدے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں رکھے ہوئے پھولوں کے گملوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ادھر ادھر پھینک دیتا ہے تا کہ دوسروں کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔

اس دوران میں موضع بازار تحصیل ہنگو کا نائیک اسد اللہ خاں بنگش بائیں طرف سے ہو کر بھارتی کوارٹر گارڈ کے سامنے سے گزرتا ہوا سڑک پر پیش قدمی کرتا ہے۔ گارڈ روم کے سامنے ایک ہندو سنتری کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہے۔ قریب ہی ایک سکھ صوبیدار کرسی سمیت پیچھے کی طرف گرا پڑا ہے اور زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ موت قہقہہ زن ہے۔ یہ لوگ اس سے آنکھیں چرا گئے ہیں لیکن پاک فوج کے جری مجاہد موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہے ہیں۔

پندرہ بیس گز آگے سڑک کے آر پار ایک مائن نیکلس بچھا ہوا ہے۔ دشمن کا یہ معمول ہے کہ وہ سرِ شام کئی جگہوں پر ایسے مائن رکھ دیتا ہے اور صبح ٹریفک کھلنے سے پہلے انہیں اٹھا لیتا ہے۔ یہاں نائیک اسد اللہ خاں بنگش کا سیکشن رک جاتا ہے۔ صوبیدار صفدر دوڑ کر پہنچتا ہے اور صورتحال پر غور کرنے کے بعد ایک جست لگا کر پار ہو جاتا ہے۔ باقی جوان بھی اپنے نڈر اور بے خوف پلاٹون کمانڈر کی پیروی کرتے ہیں۔ اب سارا پلاٹون سڑک کے اوپر اور دائیں بائیں پھیل گیا ہے۔ وہ یوں دوڑ رہا ہے جیسے جسمانی تربیت کا کوئی مظاہرہ ہو۔ توپوں کی گھن گرج، مشین گنوں کی چنگھاڑ اور دوسرے خودکار ہتھیاروں سے گولیوں کی بارش ان پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو رہی۔ آسمان پر اور فضا میں برق تپاں کا عالم ہے اور زمین دہکتے ہوئے الاؤ کی مانند ہے لیکن غازیانِ دین کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتے۔

کچھ دور آگے سڑک کے دائیں طرف دکانیں وغیرہ ہیں۔ بند کواڑوں کے پیچھے سے بزدل بھارتی شہری چلا چلا کر رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں: ''ہم سول آدمی ہیں، ہم تمہارے دشمن نہیں، ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔'' مسلمان فوج کبھی نہتوں اور پرامن شہریوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتی۔ اس عظیم روایت کی پاسبانی کرتے

ہوئے صوبیدار صفدر جوانوں کو حکم دیتا ہے: ''ان سے تعرض نہ کرو اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔''

سڑک کے بائیں طرف نشیب ہے۔ یہاں ایک کرال ٹرینچ کھدا ہوا ہے۔ ایک بھارتی سپاہی اس میں چھپ کر فائر کر رہا ہے۔ سپاہی محمد ولایت سراغ لگا کر اسے جہنم رسید کر دیتا ہے۔ آگے کھڑے ہو کر فائر کرنے کے لئے ایک بنکر دکھائی دیتا ہے۔ نائیک اسد اللہ خاں اپنے سیکشن کو منظم کر کے اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ دشمن کی مزاحمت حد سے زیادہ ہے۔ پٹھان نائیک کو تھوڑی دیر سنگینوں کی لڑائی بھی لڑنا پڑتی ہے۔ اس مورچے کے بالمقابل سڑک کے دائیں طرف ٹینک شکن توپ ''ریکالیس رائفل'' کا مورچہ بنا ہوا ہے لیکن اس میں گن موجود نہیں۔ تقریباً اسی جگہ پلاٹون حوالدار زر محمد کو دونوں رانوں میں گولیاں لگتی ہیں، زخموں سے خون بہنے لگتا ہے، لیکن موضع گلور تحصیل کہوٹہ کے جنجوعہ خاندان کا یہ جوانمرد حوالدار اف تک نہیں کرتا۔ اس کے قدم ذرا بھی نہیں ڈگمگاتے۔ صوبیدار صفدر اس کے زخموں کی نوعیت دیکھ کر اسے واپس جا کر مرہم پٹی کرنے کا حکم دیتا ہے، لیکن زخموں سے چور حوالدار زر محمد کم از کم اس وقت اپنے بالا افسر کے حکم کی تعمیل کرنے کے موڈ میں نہیں اور وہ برابر اپنے پلاٹون کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے۔

تقریباً اڑھائی سو گز پیش قدمی کے بعد بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس کی ایک بارک نظر آتی ہے۔ زمانہ امن میں یہ جگہ دشمن کا کمپنی ہیڈ کوارٹر ہے۔ اب جنگ کی حالت میں یہاں کس قدر نفری جمع ہو گی، پاک فوج کے مٹھی بھر جیالوں کو اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ عددی کثرت اور قلت کے جھمیلوں میں پڑنا ہی نہیں چاہتے۔ تائید ایزدی اور بے پناہ جذبہ جہاد انہیں وہ قوت بخشتا ہے کہ وہ ہمالہ سے بھی ٹکرا جاتے ہیں اور تلاطم خیز سمندروں کا رخ بدل کے رکھ دیتے ہیں۔

بارک ایریا، صوبیدار صفدر کا منتہائے مقصود ہے۔ احکام کے مطابق اسے یہاں ٹھہرنا ہے اور پیچھے آنے والے محمد حسین کے پلاٹون کو آگے بڑھانا ہے، بہرحال بارک ایریا میں دشمن سے نپٹنے کے لئے پلاٹون جنگی تکنیک کے مطابق چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ نائیک اسد اللہ خاں کا سیکشن ابھی تک سڑک کے بائیں طرف نشیب میں پیش قدمی کرتا رہا ہے۔ موضع سامل دارا ضلع ہزارہ کے حوالدار گلزار کا سیکشن بارک کے شروع میں دشمن کے ایک مشین گن مورچے پر حملہ آور ہوا ہے۔ بنکر کے اندر چار پانچ سکھ ہیں اور وہ اپنی پوزیشن پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ حوالدار گلزار اپنے تین ساتھیوں سمیت جست لگا کر مورچے کے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ دشمن ان کی اس جرات اور بے خوفی سے بوکھلا کر مورچے سے باہر نکل آتا ہے۔ گلزار سنگین تان کر ایک

فوجی پر لپکتا ہے تو وہ آگے سے رائفل تھام لیتا ہے۔ گلزار رائفل چھوڑ دیتا ہے اور ایک زوردار ٹھوکر مار کر دشمن کو چاروں شانے چت گرا دیتا ہے۔ اس عرصے میں سیکشن کے باقی جوان بھی میدان میں آ کودتے ہیں اور سنگینوں سے دشمن کو چھلنی چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ حوالدار گلزار آگے بڑھنے سے پہلے ایک رائفل پکڑتا ہے۔ تاریکی کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں بھارتی رائفل آ جاتی ہے۔ رات بھر وہ اسی ہتھیار سے لڑتا رہتا ہے اور اسے تبدیلی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

مسلیو ! میں لڑنا نہیں چاہتا

ایک اور سیکشن کمانڈر حوالدار خضر محمد کو حکم ملتا ہے کہ وہ بارک کے بائیں طرف درختوں میں پوزیشن سنبھال لے تا کہ بارک کے اندر باقی ماندہ پلاٹون کا عقب محفوظ رہے اور سڑک کے راستے دشمن کی کسی بھی جوابی کارروائی سے نپٹا جا سکے۔ دو سیکشنوں کے ساتھ صوبیدار صفدر، بارک کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک لمبا تڑنگا سکھ نوجوان رائفل تھامے ہینڈز اپ کر دیتا ہے۔ ''مسلیو ! میں لڑنا نہیں چاہتا۔'' اس کی زبان پر التجا ہے۔ صوبیدار صفدر ابھی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس کا کیا کیا جائے کہ کسی طرف سے فائر آتا ہے اور سکھ دھڑام سے نیچے گر کر تڑپنے لگتا ہے۔ مشین گن کا ایک برسٹ اس کے جسم سے گزر گیا ہے۔

دریں اثناء پندرہ بیس سکھ سپاہی بارک سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں، پاک فوج کے جوانوں نے فرار کی تمام راہیں بند کر رکھی ہیں، وہ انہیں چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اب صوبیدار صفدر اپنے جوانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ کمروں کے اندر داخل نہ ہوں بلکہ کھڑکیوں روشندانوں سے گرینیڈ پھینک کر دشمن کو تباہ کر دیں۔ اس حکم پر فوراً عمل ہوتا ہے۔ کھڑکیاں توڑ توڑ کر گرینیڈ پھینکے جا رہے ہیں۔ مرتے ہوئے دشمن نے چیخ و پکار سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

دوسری طرف موضع میرا شمس تحصیل گوجر خاں کے حوالدار خضر محمد کو اپنی پوزیشن سے چار پانچ گز دور شیشم کے درخت کے نیچے ایک بھارتی سایہ نظر آتا ہے۔ خضر کی چھٹی حس اسے خبردار کر دیتی ہے کہ یہ شخص پاک فوج سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ اپنا کوئی جوان ابھی سڑک پر آگے نہیں گیا..... خضر تحکمانہ لہجے میں سوال کرتا ہے:

''کون ہے؟''

پنجابی میں جواب ملتا ہے: ''کوئی گل نئیں اپنے ای آں'' (کوئی بات نہیں اپنا آدمی ہوں)۔ حوالدار خضر

کڑک کر اسے ہینڈز اپ کا حکم دیتا ہے اور وہ سایہ تابع فرمان بچے کی طرح ہاتھ بلند کر دیتا ہے۔ پتہ چلتا ہے وہ بھارتی میجر ہے۔ خضر محمد اسے بارک کی طرف چلنے کا آرڈر دیتا ہے تا کہ اپنے صوبیدار کے سامنے پیش کرے۔ ابھی وہ سڑک کے درمیان ہی پہنچ پاتے ہیں کہ قصر ہند کے اوپر سے مشین گن کا برسٹ آتا ہے اور سکھ میجر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔ حوالدار صرف چند قدم پیچھے ہے، اسے خراش تک نہیں آئی۔ سچ ہے موت بہادروں سے کنی کترا کر گزر جاتی ہے۔

میں آگے بڑھنے کے لئے والنٹیئر ہوا ہوں

تقریباً اسی وقت ریلوے بند اور قصر ہند کی جانب سے زبردست فائر آنے لگتا ہے۔ صوبیدار صفدر جوانوں کو بارک کی نشیبی جگہوں میں لیٹ جانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ خود بارک کے سامنے سنتری پوسٹ میں کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں سے وہ صورتحال کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتا ہے۔ اسے دشمن کی جانب سے ذرا سکون ملتا ہے تو خیال آتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد ان کے پیچھے ٹینک آنے والے ہیں، انہیں سڑک پر بچھی ہوئی بارودی سرنگوں کا کوئی علم نہیں۔ اس طرح ان کا بہت نقصان ہوگا۔ اس خیال سے وہ اپنے وائرلیس آپریٹر تحصیل شکر گڑھ کے سپاہی عبدالمجید کو حکم دیتا ہے:

''پیچھے میجر محمد اشرف سے رابطہ قائم کرو کہ وہ ٹینکوں کو خبردار کر دیں۔''

لیکن میجر اشرف کا آپریٹر ملکوال ضلع گجرات کا رہنے والا سپاہی خادم حسین زخمی ہو چکا ہے، اس لئے پیغام نہیں بھیجا جا سکا۔ اب صوبیدار صفدر آواز دیتا ہے: ''ایک والنٹیر چاہئے''۔ موضع بھٹی گوجراں تحصیل چکوال کا سپاہی محمد علی جس کا دل بھی اس کی مونچھوں کی طرح بڑا ہے، دوڑ کر آگے آتا ہے۔ صوبیدار حکم دیتا ہے: ''پیچھے جے سی پی پر جاؤ، پندرہ منٹ تک اپنے ٹینک آئیں گے، انہیں مائن نیکلس سے خبردار کر دو۔''

سپاہی محمد علی جواب دیتا ہے: ''صاحب میں آگے جانے کے لئے والنٹیر ہوا ہوں، پیچھے جانے کے لئے نہیں۔ ایک بار جہاں قدم رکھ چکا ہوں، اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

صوبیدار صفدر اس کے جذبے کی قدر کرتا ہے اور پھر اسے معاملے کی اہمیت بتاتا ہے۔ سپاہی محمد علی پیچھے روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ خاصی دیر جے سی پی پر انتظار کرنے کے بعد اپنے پلاٹون سے دوبارہ آملتا ہے۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد حسین کا پلاٹون بارک ایریا میں قدرے تاخیر سے پہنچتا ہے کیونکہ راستے میں وہ دشمن کے

زبردست فائر کی زد میں آجاتا ہے لیکن اس کے بہادر جوان آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ صوبیدار صفدر کے پلاٹون کا ٹاسک مکمل ہو چکا ہے، لیکن دوسرے پلاٹون کے ٹاسک کو مکمل کرنے کے لئے وہ آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک جوان کو رائفل پر انرگا چڑھانے میں دقت ہو رہی ہے۔ وہ صوبیدار سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ صوبیدار صفدر گرینیڈ کھول کر ربڑ کی واشل نکال رہا ہے اور ساتھ ساتھ چل بھی رہا ہے۔ ٹیلی فون کے تار اس کے پاؤں میں الجھ جاتے ہیں۔

صوبیدار صفدر، حوالدار زر محمد کی مدد سے تاروں سے خلاصی حاصل کرتا ہے۔ اس اثناء میں تمام جوان آگے سڑک پر رک گئے ہیں۔ یہاں پھر سڑک کے عین اوپر مائن فیلڈ ہے۔ یہ دس بارہ فٹ چوڑا ہے۔ تمام مائن ایک دوسرے سے نہایت باریک تاروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ذرا سی گڑبڑ سے بیک وقت سب کے سب اڑ سکتے ہیں۔

صورتحال انتہائی نازک ہے۔ سڑک کے اوپر اور دائیں بائیں ہر طرف مائن ہیں۔ کسی جانب سے بھی آگے بڑھنے کا راستہ نہیں۔ جوانوں کے چہروں پر تردد کے آثار نمودار ہو گئے ہیں۔ صوبیدار صفدر صورتحال کی نزاکت کو بھانپ لیتا ہے اور ان الفاظ میں جوانوں کو جوش دلاتا ہے:

''دین حق کے پرستار مجاہدو! اس وقت مادر وطن کی سالمیت خطرے میں ہے۔ کروڑوں ماؤں بہنوں اور بہو بیٹیوں کی عصمت وعفت خطرے میں ہے۔ اپنے وطن کی حفاظت اور اپنی ماں بہنوں کے سروں پر آنچل قائم رکھنے کے لئے آگے بڑھو۔''

یہ کہہ کر صوبیدار صفدر مائنوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ خالی جگہوں پر احتیاط سے پاؤں رکھتا ہوا مائن فیلڈ پار کر جاتا ہے۔ اس کے پیچھے تمام جوان حرکت میں آجاتے ہیں۔ دشمن کی بچھائی ہوئی بارودی سرنگیں سرفروشان اسلام کا راستہ نہیں روک سکیں۔ کسی جوان کو خراش تک نہیں آئی۔ خدا کا فضل شامل حال ہے اور تائید ایزدی قدم قدم پر جوانوں پر سایہ فگن ہے۔

کچھ دیر پہلے چاند طلوع ہو چکا ہے لیکن فضا ابھی تک دھندلائی ہوئی ہے۔ گولے بارود کے دھوئیں کی دبیز چادر سی تن گئی ہے۔ روشنی کے غباروں اور توپوں کے گولوں کی چمک سے نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں۔ دشمن پاک فوج کا ہلہ روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ اس کا بہترین انفنٹری بریگیڈ یہاں مورچہ بند ہے۔ سکھ، گورکھے اور ہندو فوجی کالی مائی کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ ان کے اعلیٰ افسر دریا پار محفوظ مقامات سے

وائرلیس پر انہیں آرڈر پر آرڈر جاری کر رہے ہیں کہ علاقہ مت چھوڑو۔ بھارتی فوج اپنی بساط کے مطابق کوشش کر رہی ہے لیکن اس میں پاک مجاہد کی ضرب حیدری سہنے کی استطاعت نہیں۔

بارک ایریا سے خاصا آگے ریلوے بند، سڑک سے آن ملتا ہے۔ یہاں ایک سنگ میل نصب ہے۔ یہ فیروز پور کی قربت کا احساس دلا رہا ہے۔ یہاں سڑک کے دونوں جانب دو مضبوط بنکر بنے ہوئے ہیں۔ ان میں دست بدست لڑائی کی نوبت آتی ہے۔ جوانوں کے ہاتھ سنگینیں چلاتے چلاتے سوج جاتے ہیں۔

یہ مقام دوسری پلاٹون کا منتہائے مقصود ہے۔ صوبیدار صفدر اپنے جوانوں کو مناسب پوزیشنوں میں بٹھا دیتا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب اور ریلوے بند کی آڑ لے کر گائیڈ بند پر موجود دشمن کے فائر کا جواب دیا جاتا ہے۔ صوبیدار صفدر موقع پا کر حوالدار زر محمد کی مرہم پٹی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ حوالدار خضر محمد اپنا رومال پھاڑ کر زخموں پر کس کر باندھ دیتا ہے۔ ایک بار پھر پلاٹون کمانڈر صوبیدار صفدر، زخمی حوالدار کو پیچھے چلے جانے کا حکم دیتا ہے۔ زر محمد کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ اپنے صوبیدار کی پیٹی تھام کر کہتا ہے:

''صاحب! میں آخر دم تک آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔' اسی اثناء میں آگے پل کی جانب سے بوٹوں کی ٹھک ٹھک کی آواز آتی ہے۔ صوبیدار صفدر یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ بی کمپنی کا کمانڈر میجر زاہد یاسین (ستارہ جرأت) خراماں خراماں چلا آ رہا ہے جیسے یہ رزم گاہ نہیں پریڈ گراؤنڈ ہو۔

''میں اس وقت تک قصر ہند پر قبضہ نہیں کر سکتا جب تک دشمن کا پیچھے سے راستہ بند نہ ہو''۔ میجر زاہد یاسین گونج دار آواز میں کہتا ہے۔

''اسی لئے میں اپنا ایک سیکشن نائیک علی اصغر کی کمان میں نہر کے پل پر بٹھا آیا ہوں۔ تم لوگ بھی فوراً وہاں پہنچو اور نہر کے پل پر قبضہ مستحکم کرو۔''

میجر زاہد اسی آن بان کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا اپنی کمپنی کی طرف چلا جاتا ہے..... صوبیدار صفدر اپنے پلاٹونوں کو لے کر نہر کی جانب بڑھتا ہے۔ اب انہیں سڑک کے ساتھ ریلوے بند پر دشمن کی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر بنکر بنے ہوئے ہیں۔ بند کے مشرقی جانب ایک گہرا کرال ٹرینچ کھدا ہے جس سے تمام مورچے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ان مورچوں میں گرینیڈ پھینک پھینک کر دشمن کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔ خود صوبیدار مختلف بنکروں میں نو گرینیڈ استعمال کرتا ہے۔

دشمن کی مزاحمت کو کچلتے ہوئے صوبیدار صفدر علی کے دونوں پلاٹون نہر کے پل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں

لائل پور کا رہنے والا نائیک اصغر اپنی قلیل سی نفری کے ساتھ پہلے ہی ڈٹا ہوا ہے۔ صوبیدار صفدر اپنی پوزیشن، گائیڈ بند پر تھوڑی دور تک پھیلا دیتا ہے۔

بلوچ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سید حبیب احمد (ستارہ جرأت) کو اس کامیابی کی اطلاع دینے کے لئے صفدر ایک بار پھر والینٹر مانگتا ہے۔ اب کوٹ عیسیٰ خاں ضلع ڈیرہ غازی خاں کا جی دار پٹھان حاجی محمد اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ وہ جے سی پی کے راستے دیپالپور نہر میں عبوری مقام پر اپنے کرنل کو تلاش کرتا ہے۔ منصوبے کے مطابق کرنل کو اپنے تدبیراتی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ یہیں ہونا چاہئے لیکن وہ تمام کتابی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر شاہراہ عشق پر روانہ ہو چکا ہے۔ حاجی محمد کسی کو پیغام دیئے بغیر واپس لوٹتا ہے اور اپنے پلاٹون سے آ ملتا ہے۔

گائیڈ بند کی طرف صوبیدار صفدر علی شاہ کی پوزیشنوں کے سامنے سرکنڈوں کے جھنڈ سے ایک بھارتی وائرلیس آپریٹر ہینڈز اپ کئے باہر نکلتا ہے۔ صوبیدار کی نظر اس کے ہاتھوں پر پڑتی ہے۔ چاندنی میں نہائی ہوئی رات میں چمکتا ہوا پستول صاف نظر آ جاتا ہے۔ صوبیدار صفدر ہاتھ بڑھا کر پستول اس سے چھین لیتا ہے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا یہ لوڈ ہے یا نہیں۔ اس کا رخ ایک طرف کر کے ٹریگر دباتا ہے۔ تڑاخ سے گولیاں نکلتی ہیں۔ اگر یہ پستول بروقت دکھائی نہ دیتا تو یہ بھارتی فوجی ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ پوچھ گچھ پر وہ اپنا نام پریتم سنگھ بتاتا ہے۔ پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیئے جاتے ہیں۔ حوالدار (اب نائب صوبیدار) کبیر اسے سڑک کی طرف لے جاتا ہے۔ پریتم سنگھ موقع پا کر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اور کبیر اسے گولی کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ بھارتی سپاہی کو پیٹھ پر کاری زخم آتا ہے اور وہ کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ حوالدار کبیر واپس اپنی پوزیشن پر آ جاتا ہے۔

کیا وہ زندہ ہے، یا وہ مر چکا ہے

صوبیدار صفدر کے دونوں پلاٹون ایک وسیع جگہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا آپس میں ملاپ قائم رکھنے کے لئے وہ اونچی آواز میں آرڈر وغیرہ دیتا ہے۔ اس سے دشمن کو اس کی پوزیشن کا علم ہو جاتا ہے۔ گائیڈ بند کی طرف سے راکٹ لانچر کا ایک گولہ اس کے بالکل قریب پھٹتا ہے۔ وہ اندازہ لگاتا ہے کہ اگلا گولہ عین سر کے اوپر پڑے گا۔ اس لئے وہ حفاظتی تدبیر اختیار کرتا ہے اور بند کے ساتھ دشمن کے کرال ٹرینچ میں لیٹ جاتا

ہے۔عین اس موقع پر دوسرا گولہ اس کے اوپر کرال ٹرینچ کے کنارے گرتا ہے۔ دھوئیں اور گرد وغبار کا ایک بگولہ سا اٹھتا ہے۔ مٹی اور پتھر اس کے اوپر گرتے ہیں اور وہ اس میں دب کر رہ جاتا ہے۔ بارود کی بو اور گولہ پھٹنے کے دھماکے سے اس کے اعصاب بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے تقریباً آٹھ دس گز کے فاصلے پر حوالدار کبیر نے پوزیشن لے رکھی ہے، آگے حوالدار خضر ہے، وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ صوبیدار شہید ہو گیا ہے۔ کبیر اپنی جگہ سے اٹھتا ہے، صوبیدار صفدر کی کمر اور ٹانگوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھتا ہے اور خضر کے پاس پہنچ کر کہتا ہے: ''حوالدار صاحب، صوبیدار شہید ہو گیا ہے۔ کوئی بات نہیں، ایسا وقت آ سکتا تھا، تم پلاٹون کی کمان سنبھالو۔'' حوالدار خضر سپاہی محمد اسرائیل کو حکم دیتا ہے: ''جاؤ، صوبیدار کی ڈسک اتار لاؤ۔'' یہ کمسن جوان موضع دھنا کہ موہڑہ تحصیل کہوٹہ کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ نائب صوبیدار سید اکبر سیالکوٹ کے محاذ پر داد شجاعت دے رہا ہے۔ اسرائیل، صوبیدار صفدر کے گلے سے ڈسک اتارتا ہے۔ اس عرصے میں صوبیدار پر نیم غشی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ وہ سب کی آوازیں سن رہا ہے۔ وہ بولنا بھی چاہتا ہے لیکن اس کی زبان ساتھ نہیں دیتی۔ وہ سوچتا ہے کیا وہ شہید ہو گیا ہے یا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ بار بار اپنی قوت مجتمع کر کے بولنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا۔ پھر سوچتا ہے کہ شاید وہ مر چکا ہے، اس لئے دوسرے لوگوں کو پکارنے سے قاصر ہے لیکن اگر وہ واقعی مر چکا ہے، تو اسے ان لوگوں کی آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں۔ چاندنی میں نہائی ہوئی رات اسے کیسے نظر آ رہی ہے۔ گولے اور بارود کی بو اس کے نتھنوں میں کیوں گھسی جا رہی ہے۔ بالآخر اس کے ذہن سے دہشت کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں تو وہ حوالدار خضر کو آواز دیتا ہے۔

حوالدار دوڑ کر اس کے پاس آتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے بازو سے پکڑ کر مٹی کے ڈھیر سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یکدم زور لگانے سے صوبیدار صفدر کا بایاں کندھا درد کرنے لگتا ہے۔ وہ پانی مانگتا ہے جس پر خضر اپنی بوتل اس کے منہ سے لگا دیتا ہے اور وہ منہ کے اندر گھسی ہوئی مٹی اور ریت سمیت ساری بوتل غٹا غٹ پی جاتا ہے۔ اب اس کے جسم میں پوری قوت عود کر آئی ہے۔ وہ خضر کی مدد سے مٹی کے ڈھیر سے باہر نکلتا ہے۔ یہ ساری کارروائی تین چار منٹ کے مختصر سے عرصے میں عمل میں آتی ہے۔ ایک دفعہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لینے کے بعد اس کا حوصلہ فضا کی وسعتوں کو چیرتا ہوا فلک کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔ وہ کرال ٹرینچ سے نکل کر بند کے اوپر چڑھتا ہے اور پتھروں کے ڈھیر سے گزرتا ہوا نہر کے پل پر پہنچ جاتا ہے۔

وہاں نائیک شیر دل شہید (ستارہ جرأت) پوزیشن لئے ہوئے ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا سامنا ایک سکھ سے ہوا ہے۔ وہ مائنوں سے بھری ہوئی ٹرالی لے کر نہر کے پل کے اس طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیر دل گتھم گتھا ہو کر اس کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے اور ٹرالی پل کے نیچے پھینک دیتا ہے۔ پل کے پرلی طرف پندرہ بیس سکھ نمودار ہوتے ہیں۔ ایک سکھ نائیک انہیں ماں بہن کی گالی دے کر آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے لیکن بزدل دشمن ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ نائیک شیر دل ایک سپاہی سے مشین گن لیتا ہے اور سڑک کے اوپر رکھ کر دشمن کے اس دستے پر فائر کھول دیتا ہے۔ دشمن کی صفوں میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اکثر مکئی کے دانوں کی طرح بھن کر جہنم رسید ہوتے ہیں۔ باقی زخمی حالت میں چیخ پکار شروع کر دیتے ہیں۔

اس وقت ہیڈ ورکس کے دائیں طرف دیپالپور نہر اور دریائے ستلج کے درمیان واقع پیری میٹر سے زبردست فائر آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ غلیظ گالیاں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ ان میں ایک گالی ایسی ہے جسے سن کر صوبیدار صفدر کا خون کھول اٹھتا ہے اور وہ سوچتا ہے: ''یا خدا! یہ گالی بھی ہمارے حصے میں آنی تھی۔''

دوسری طرف بلوچ رجمنٹ کی اے کمپنی اپنے کمپنی کمانڈر میجر محمد حنیف ملک کی شہادت کے بعد سینئر صوبیدار محمد اقبال کی کمان میں نہر کے پل پر پہنچ جاتی ہے اور مناسب دفاعی پوزیشن اختیار کر لیتی ہے۔ اسی اثناء میں پنجاب رجمنٹ کے میجر ظفر اقبال ثالب بھی ایک پلاٹون کی نفری کے ساتھ یہاں پہنچ گئے ہیں اور نہر کے پل کے اس طرف پوزیشن سنبھال لیتے ہیں۔ عین اس وقت دشمن کے توپ خانے کا بے پناہ فائر گرنے لگتا ہے۔ ایک ایک انچ پر چھوٹی بڑی توپوں کے گولے پھٹ رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ دشمن جوابی یلغار کرنے والا ہے۔

دشمن کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے صوبیدار اپنے جوانوں کو مناسب پوزیشنوں میں بٹھا دیتا ہے۔ چونکہ اس کا وائرلیس سیٹ کام نہیں کر رہا، اس لئے تمام تر ہدایات وہ زبانی دے رہا ہے۔ وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا رہا ہے۔ بھارت کی کور آرٹلری نے قیامت مچا رکھی ہے۔ صوبیدار جانتا ہے اگر اس وقت ذرا بھی سستی کا مظاہرہ ہوا تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ اگر اس کی دفاعی پوزیشن کو روندتے ہوئے دشمن آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اسے دور دور تک روکنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ چند نازک لمحات ہیں جو حسینی والا کی تاریخی لڑائی کا پانسا پلٹنے والے ہیں۔

ہمارے جوان اس اعصاب شکن فائر سے بے پروا ہو کر تاریخ کے سینے پر بے مثال شجاعت کی مہر ثبت کر

رہے ہیں۔صوبیدار ایک ایک جوان کا نام لے لے کر ہدایات دے رہا ہے۔دشمن اتنا قریب ہے کہ وہ سب کچھ سن رہا ہے۔اسے صوبیدار کے نام کا پتہ چل جاتا ہے اور وائرلیس پر جعلی پیغام دیتا ہے: ''صفدر یہ بریگیڈ کنٹرول ہے، تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ دشمن کے دباؤ کے پیش نظر پوزیشنیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ آؤ۔'' لیکن صوبیدار جانتا ہے اسے آگے ہی آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ایک بار ایڈوانس کا حکم دے کر پیچھے بھی بلایا جاسکتا ہے، چنانچہ وہ وائرلیس پر مذکورہ پیغام دینے والے کو بے نقط سناتا ہے۔اس پر بھارتی وائرلیس آپریٹر اس فریکوئنسی سے دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔

سر! اگر میں فائر نہ کرسکا.....

اسی اثناء میں ہیڈ ورکس کی طرف سے بھارتی ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔صوبیدار اس وقت گائیڈ بند پر ہے۔ٹینکوں کی آواز زبان حال سے بھارت کے جوابی حملے کا الارم دے رہی ہے۔صوبیدار عالم وارفتگی میں نہر کے پل کی جانب دوڑتا ہے۔اس کے پیچھے دوسرے جوان بھی ہیں۔وہ پل کے قریب پہنچتا ہے تو ٹینکوں کی آواز قریب سے قریب تر ہوجاتی ہے۔

اسم بامسمیٰ نائیک شیر دل چلا چلا کر پکار رہا ہے: ''جس کے پاس انرگا ہے، ادھر سڑک پر آجائے۔'' چک 376 ڈبلیو بی تحصیل لودھراں کا لانس نائیک محمد شریف (تمغہ جرأت) اس پکار پر لبیک کہتا ہے اور اپنی رائفل پر انرگا چڑھا کر پل کے سامنے سڑک کے عین بیچ میں لیٹ جاتا ہے۔اس کی اس بے خوفی پر تقدیر بھی عش عش کر اٹھتی ہے۔صوبیدار صفدر نے سڑک کے ساتھ بائیں طرف لسوڑھے کے درخت کے نیچے پوزیشن لے رکھی ہے۔وہ لانس نائیک محمد شریف کو اس کی ڈاڑھی کی وجہ سے پہچان کر حکم دیتا ہے: ''شریف، سڑک کے اوپر کیوں لیٹے ہو؟ دائیں بائیں پوزیشن لو۔''

بھارتی ٹینک اس وقت تک دریا کا پل عبور کر کے نہر کے پل کے قریب پہنچ چکا ہے۔لانس نائیک محمد شریف براہ راست اس کی مشین گن کی زد میں ہے۔اس کے ساتھ ایک جوان اور بھی ہے مگر آج اس کا نام بتانے والا کوئی نہیں۔وہ گمنام شہید کی حیثیت سے تاریخ کی پیشانی پر ستارہ بن کر چمکتا رہے گا۔

ٹینک اور قریب آگیا ہے۔لانس نائیک شریف اپنے صوبیدار کو لاجواب کر دیتا ہے۔وہ کہتا ہے:

''صاحب، میں نے یہ ہتھیار زیادہ استعمال نہیں کیا، مجھے یہیں لیٹا رہنے دیں۔ اگر میں اسے فائر نہ کر سکا تو کم از کم جب ٹینک میرے اوپر سے گزرے گا تو یہ ضرور پھٹے گا اور میرا مشن تکمیل کو پہنچ جائے گا۔''

بے تیغ لڑنے والے مومن کی آن ملاحظہ ہو جہاں آر آر گنیں کارگر نہیں رہتیں، وہاں رائفل سے فائر ہونے والے ایک عام سے گرینیڈ کی حیثیت کیا ہے! لیکن شریف شہید جیسے غازیان اسلام، دستہ شمشیر کی بجائے نصرت ایزدی اور قوت بازو پر ایمان رکھتے ہیں۔

دشمن کے مایہ ناز بکتر بند ڈویژن کا ہراول ٹینک نہر کے پل پر پہنچتا ہے تو اس کا عملہ ''جے ہند، جے ہند'' کے نعرے لگاتا ہے۔ عین اس موقع پر دائیں بائیں اور سامنے سے پانچ چھ انرگے فائر ہوتے ہیں۔ ٹینک ایک دھماکے سے پھٹتا ہے اور بھارت کا غرور خاک میں مل جاتا ہے۔ ٹینک کا عملہ باہر کود کر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو نائب صوبیدار رب نواز کے پلاٹون کا مشین گنر نمبر ون سپاہی مصری خان ایک ہی بوچھاڑ سے اسے بھون کر رکھ دیتا ہے۔

بھارت کی اپنی فیکٹریوں میں تیار شدہ پہلا حملہ آور وجنتا ٹینک ستلج کے رتیلے کنارے پر حسرت و یاس کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ وہ فیروز پور اور فرید کوٹ کے باغات سے اس زعم میں چلا تھا کہ پاک فوج کے دفاع کو توڑتا ہوا لاہور کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کرے گا۔ اسے توقع تھی کہ 65ء میں جس جم خانہ میں وہ شراب کا جام نہ چڑھا سکا، اب ضرور وہاں فتح کا جشن منائے گا لیکن بدر واحد کے غازیوں کی ایک ہی ضرب محمدی سے بیالیس میل دور حسینی والا کے کارزار میں اس کے اپنے خون کا جام چھلک اٹھا ہے۔ اس تباہی اور بربادی سے دشمن پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ وہ جھنجھلا کر ایک اور ٹینک آگے بڑھا دیتا ہے۔ پاک وطن کے سرفروش مجاہد اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہیں۔ دشمن موج در موج ان پر ہلا بول رہا ہے لیکن یہ کھلی جگہوں پر سینہ تانے کھڑے ہیں اور وار پر وار سہہ رہے ہیں۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد حسین، صوبیدار صفدر، حوالدار زر محمد، نائیک شیر دل، لانس نائیک محمد شریف، سپاہی مصری خاں، سپاہی امجد بیگ اور کئی دیگر گمنام مجاہد اپنی رائفلوں پر دوسرا نرگا گرینیڈ چڑھا لیتے ہیں۔ اگلا وجنتا ٹینک ان کے رینج میں آتا ہے تو ایک ساتھ ٹریگر دباتے ہیں.....دوسرے وجنتا کا غرور بھی خاک میں مل گیا ہے لیکن اس کی مشین گن ٹھیک حالت میں ہے اور گولیوں کا مینہ برسا رہی ہے۔ اس سے نائیک شیر دل اور سڑک کے عین بیچ میں لیٹا ہوا لانس نائیک محمد شریف سخت زخمی ہو جاتے ہیں مگر وہ بدستور اپنی اپنی جگہ پر ڈٹے

ہوئے ہیں اور دشمن کے نئے حملے کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ان کے زخموں سے مسلسل خون بہہ رہا ہے اور وہ بالآخر وطن کی آن پر قربان ہو جاتے ہیں۔قوم اپنے ان عظیم سپوتوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بالترتیب ستارہ جرأت اور تمغہ جرأت کا اعزاز بعد از شہادت پیش کرتی ہے۔ لاہور پر حریصانہ نظریں جمانے والا بھارتی بکتر بند ڈویژن صرف دو ٹینک برباد کرانے کے بعد تمام عزم وحوصلہ کھو بیٹھتا ہے۔دشمن کو اب یہ فکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح تباہ شدہ ٹینک کو ریکور کر لے تا کہ اس کی ہزیمت کا تماشا دنیا کو نہ دکھایا جا سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے دریا پار سے بے پناہ فائر اس جگہ پر مرکوز کر دیتا ہے تا کہ پاک فوج کے جوان اپنی جگہ سے سر نہ اٹھا سکیں اور اس فائر کی آڑ میں ٹینکوں کو پیچھے لایا جا سکے۔یہی وہ وقت ہے کہ بلوچ رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سید حبیب (ستارہ جرأت) دیپالپور نہر کے کنارے اس فائر میں پھنس کر رہ گیا ہے۔

دسمبر کی چاندنی رات زندگی کا مجاہدانہ رقص دیکھ رہی ہے۔ وہ زندگی جو اس طرف ایک ایسا مقدس فرض بن چکی ہے جس کی تکمیل کے لئے مجاہدین پاک پروارفتگی کی کیفیت طاری ہے.....اور ایک زندگی اس طرف بھی ہے جسے موت کی دہشت نے بدحواس کر دیا ہے.....چاند دشمن کو زہر خند کے ساتھ دیکھ رہا ہے جو بہاروں پر خزاں کی ویرانیاں مسلط کرنا چاہتا ہے اور زندگی کی رعنائیوں پر نحوستوں کے سائے بکھیرنا چاہتا ہے.....چاند کی کرنیں ان مجاہدین پر سکینت طاری کر رہی ہیں جو جلتی آگ اور رقص کناں شعلوں میں کود چکے ہیں۔ سنسناتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھ رہے ہیں اور توپوں کے ہیبت ناک دھماکوں سے بے خوف ہو کر منزل تک پہنچنا اپنا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔

ستلج کا پل ڈائنامیٹ کر دو.....!

دشمن کے توپ خانے کا فائر پوری شدت سے جاری ہے، درختوں کی شاخیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ غنچے راکھ بن رہے ہیں، پتھر ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ رہے ہیں۔آتش وآہن کے اس طوفان میں گوشت پوست کے انسان مضبوط چٹانوں کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔انہیں اپنے خدا کے وعدوں پر، اپنی ذات پر اور اپنے مقصد کی سچائی پر پورا اعتماد ہے۔ایمان کی طاقت اور کلمہ طیبہ کی برکت ان کے لئے ڈھال بن چکی ہے۔ رحمت ایزدی ان پر سایہ فگن ہے۔

اسی قیامت خیز فائر کی آڑ میں دشمن اپنے تباہ شدہ ٹینکوں کو ریکور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری طرف فیروز پور میں بھارتی کمانڈر اپنے جوابی حملے کی ناکامی پر سر پیٹ لیتا ہے۔ اسے اب یہ فکر نہیں کہ جوابی حملہ دوبارہ منظّم کیا جائے بلکہ یہ پریشانی لاحق ہے کہ پاک فوج کی برق رفتار پیش قدمی کو کیسے روکا جائے؟ اور آخر وہ بزدلانہ فیصلہ کرتا ہے اور بوکھلاہٹ میں اپنے آپریشن روم سے یہ سگنل دیتا ہے۔

''دریائے ستلج کے پل کو ڈائنامیٹ سے اڑا دو۔''

بھارتی فوج کا ایک انجینئر سگنل وصول کرتے ہی پل پر لگے ہوئے ڈائنامیٹ کا بٹن دبا دیتا ہے۔ ایک دھماکہ ہوتا ہے اور بھارت کی طرف پل کا کچھ حصہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس اثناء میں ایک بھارتی ٹینک دریا سے پار لے جایا جا چکا ہے۔ دوسرا ٹینک عین اس جگہ پہنچتا ہے جہاں سے سڑک ٹوٹ جاتی ہے۔ نتیجتاً اوندھے منہ دریا میں گر پڑتا ہے۔

بھارت نے اس جنگ میں دیوہیکل سنچورین ٹینکوں کو استعمال نہیں کیا، ان کا غرور 65ء میں چونڈہ کی خاک میں مل گیا تھا، اب کے دشمن اپنی فیکٹریوں میں تیار کردہ جنتا ٹینک میدان میں لایا ہے لیکن کرنل حبیب کی بلوچ رجمنٹ نے ستلج کے کنارے اس کا گھمنڈ بھی توڑ کر رکھ دیا ہے۔ دشمن کا پہلا جوابی حملہ پسپا کر دینے کے بعد صوبیدار صفدر دوسرے متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے کچھ جوانوں کو نہر کے پل کے آگے ہیڈ ورکس کے بائیں طرف نہر کے ریگولیٹر پر بٹھا دیتا ہے۔ یہاں دشمن کے پختہ بنکر بھی بنے ہوئے ہیں لیکن اپنے جوانوں کو سختی سے منع کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کے اندر ہرگز داخل نہ ہوں۔

دسمبر کی خنک چاندنی رات بھیگ رہی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خبروں کے آخری بلٹین بھی جنگ کے بارے میں خاموش ہیں۔ صرف ان الفاظ پر اکتفا کر کے پوری قوم کو اپنی شیر دل افواج کے عظیم اور تابناک کارناموں سے اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے:

''آج سہ پہر بھارت نے پوری مغربی سرحد پر اچانک حملہ کر دیا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق لڑائی زوروں پر ہے۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کم از کم حسینی والا میں بھارتی حملے کی شدت کو ختم کیا جا چکا ہے۔ پاک فوج کے جوان ''تفصیلات'' اپنے گرم اور جواں خون سے مرتب کر رہے ہیں اور اب اس پوزیشن میں ہیں کہ ستلج کی موجوں سے کھیلتے ہوئے آگے بڑھیں اور دشمن پر کاری وار کر کے اسے مشرقی پنجاب کے میدانوں

سے بھگا دیں۔

چاند ابھی تک محو نظارہ ہے۔ایک حقیقی انسانی ڈرامہ.....آگ اور خون کا ڈرامہ.....دہکتے ہوئے لوہے کے ٹکڑوں کی بارش میں جرات وایثار کا ڈرامہ.....اس کی چشم وا کے سامنے ہے۔عین اس وقت پھر ایک بار ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔پاک فوج کے جانباز چوکنے ہو جاتے ہیں کہ شاید دشمن پھر آ رہا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد پتہ چلتا ہے کہ اپنے ٹینک پہنچ گئے ہیں۔صوبیدار صفدر دوڑ کر پیچھے آتا ہے تا کہ ٹینکوں کی رہنمائی کر کے انہیں آگے لے آئے۔

اپنے ٹینکوں کا ایک ٹروپ ریلوے بند اور سڑک کے مقام اتصال پر کھڑا ہے۔صوبیدار ان کے قریب پہنچتا ہے تو پہلے ٹینک کا کمانڈر اس سے کوڈ ورڈ پوچھتا ہے۔وہ جواب دیتا ہے:''مجھے کوڈ ورڈ کا پتہ نہیں، میں بلوچ رجمنٹ کا صوبیدار ہوں۔میرے جوان نہر کے پل سے آگے ہیڈ ورکس کے ساتھ پوزیشن لئے ہوئے ہیں۔میں یہاں تمہاری راہنمائی کے لئے آیا ہوں۔کیونکہ راستے میں سڑک پر بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔''ٹینک کمانڈر دفعدار (اب نائب رسالدار) عالم شیر کہتا ہے:''اچھا کلمہ سناؤ۔'' صوبیدار صفدر اونچی آواز میں کلمہ طیبہ پڑھتا ہے..... عالم شیر اسے قریب آنے کی اجازت دیتا ہے اور پھر اس کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے۔سڑک پر بچھے ہوئے مائن فیلڈ پر مشین گن کا برسٹ مارتا ہے اور راستہ صاف ہو جاتا ہے۔نہر کے پل پر پہنچ کر ٹینکوں کا ٹروپ اپنے داؤ استعمال کر کے دشمن پر فائر شروع کر دیتا ہے۔

اس عرصے میں بلوچ رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر کرنل حبیب بھی نہر کے پل پر پہنچ جاتا ہے۔دوسری طرف میجر زاہد یاسین اور میجر محمد اشرف مشترکہ کارروائی کے بعد قصر ہند پر قبضہ مکمل کر چکے ہیں۔اب میجر محمد اشرف بریگیڈ کمانڈر کے نئے احکامات کے تحت اپنے ایک پلاٹون کے ساتھ ہیڈ ورکس پر پہنچ کر پوزیشن لے لیتا ہے۔وزیر آباد کا رہنے والا کیپٹن ضیاء اللہ اپنے حوالدار میجر عطا محمد کے ہمراہ پوری رجمنٹ کو برستی گولیوں میں اسلحہ سپلائی کر رہا ہے۔کسی جوان کو ایک لمحے کے لئے بھی اسلحہ کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔

دشمن کے جوابی حملے کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔صوبیدار صفدر ٹینکوں کو آگے بڑھ کر ہیڈ ورکس کے سامنے پوزیشن لینے کی درخواست کرتا ہے۔ایک ٹینک حرکت میں آتا ہے، وہ نہر کے پل پر پہنچتا ہے، تو ایک خالی ڈرم میں سے ایک سکھ مائن ہاتھ میں پکڑے باہر نکلتا ہے اور لپک کر مائن ٹینک کے نیچے پھینک دیتا ہے۔ٹینک کا ایک چین بھک سے اڑ جاتا ہے۔ساتھ ہی اس سکھ فوجی کے جسم کے ٹکڑے دور دور تک بکھر جاتے

ہیں۔اس خالی ڈرم پر صوبیدار کی کئی بار نظر پڑی ہے لیکن اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ اس میں دشمن چھپ سکتا ہے کیونکہ سڑک کے کنارے اور پلوں کے نزدیک عام طور پر ڈرم نصب ہوتے ہیں۔سکھ کی یہ جرات یقیناً لائق داد ہے لیکن اس کی قربانی کسی کام نہیں آتی کیونکہ بھارتی حکومت خواہ مخواہ انہیں جنگ کی آگ میں جھونک کر مروا رہی ہے۔

باقی ماندہ ٹینک نہر کا پل عبور کر کے ہیڈ ورکس کے دائیں بائیں پھیل جاتے ہیں اور دشمن کی دریا پار پوزیشنوں پر اندھا دھند فائر شروع کر دیتے ہیں۔اس سے دشمن پر اور بھی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے شاید پاکستان نے اپنا بکتر بند ڈویژن میدان میں اتار دیا ہے اور وہ بھی رات کے وقت۔دریا کے اس طرف بھارتی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا ہے۔دوسرے کنارے پر بھی دشمن میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ٹینکوں کی اس دلیرانہ کارروائی سے بھارتی جرنیلوں کو مزید جوابی کارروائی کی جرأت نہیں ہوتی۔

پاک فوج رات بھر ہیڈ ورکس پر ڈٹی رہتی ہے۔صبح صوبیدار صفدر نہر کے پل پر اپنے کمانڈنگ آفیسر سے ملتا ہے تو کرنل حبیب فرط جذبات سے اسے گلے لگا لیتا ہے۔

دشمن دریا پار اپنے زخم چاٹ رہا ہے اور ان کے اعلیٰ افسر اپنے ماتحتوں کی جواب طلبی کر رہے ہیں لیکن پاک فوج کی اس بلوچ رجمنٹ کو اپنے بریگیڈ کمانڈر (اب میجر جنرل) محمد ممتاز (ستارہ جرأت اور ہلال جرأت) اور جی او سی میجر جنرل عبدالمجید ملک کے سامنے سرخروئی نصیب ہوئی ہے۔4/دسمبر کا سورج اپنی کرنیں میدان جنگ پر بکھیرتا ہے تو بھارتی ہوائی جہاز مکھیوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں۔صوبیدار صفدر اپنے سی او کرنل حبیب کے ساتھ جے سی پی کے نزدیک ہوائی حملے میں پھنس جاتا ہے۔قریب ہی ایک زیر تعمیر بلڈنگ کی بنیادیں کھدی ہوئی ہیں۔صوبیدار کو اپنے سی او کی حفاظت زیادہ عزیز ہے۔وہ درخواست کرتا ہے:''صاحب آپ ان بنیادوں میں پناہ لے لیں۔میں باہر کھڑا ہو کر ہوائی جہازوں پر نظر رکھوں گا کہ وہ کس طرف سے حملہ کرتے ہیں۔'' چنانچہ جب بھارتی جہاز حملے کے لئے غوطہ لگا کر ان کے اوپر آتا ہے تو صوبیدار کہتا ہے:''پوزیشن لے لیں، صاحب۔''جہاز راکٹ گرانے کے بعد اوپر اٹھ جاتا ہے تو یہ لوگ اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔خاصی دیر تک یہ شغل جاری رہتا ہے۔

دن کے گیارہ بجے ہیں۔صوبیدار صفدر ہیڈ ورکس کے قریب کھڑا ہے، اسے دیپالپور نہر میں سے ایک سکھ اپنی طرف آتا دکھائی دیتا ہے، دونوں ایک دوسرے کو بیک وقت ''ہینڈز اپ'' کا حکم دیتے ہیں۔سکھ نے

بائیں ہاتھ میں رائفل تھام رکھی ہے جبکہ صوبیدار نہتا ہے۔صرف ایک دستی بم اس کے پاس ہے،لیکن اتنا وقت نہیں کہ وہ اس کی پن نکال سکے۔ وہ اسے پتھر کی جگہ استعمال کرتا ہے اور زور سے سکھ کو دے مارتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ سکھ تھوڑا سا بوکھلا جائے گا تو وہ آگے بڑھ کر اسے قابو کر لے گا لیکن نشانہ خطا جاتا ہے۔صوبیدار نسبتاً بلند جگہ پر ہے اور سکھ نشیب میں۔ جونہی دشمن رائفل گھما کر دائیں ہاتھ میں لیتا ہے اور سیدھی کرتا ہے، صوبیدار بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے جھپٹتا ہے اور رائفل کے اگلے سرے پر اپنا دایاں ہاتھ مارتا ہے۔نشانہ پھر چوک جاتا ہے اور اس کا انگوٹھا رائفل کی فورسائیٹ سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا ہے۔تاہم رائفل کا سلنگ ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور زور لگا کر نالی کا رخ زمین کی طرف کر دیتا ہے۔اس اثناء میں سکھ ٹریگر دبا چکا ہے اور گولیاں دونوں کے قدموں کے درمیان زمین میں دھنس جاتی ہیں۔اب صوبیدار اپنا ہاتھ رائفل کے بٹ پر مارتا ہے اور اسے مضبوطی سے تھام کر دونوں ہاتھوں سے رائفل کو بائیں طرف گھما دیتا ہے۔ساتھ ہی وہ پاؤں کی ایک زوردار ضرب سے بھارتی سورما کو چاروں شانے چت گرا دیتا ہے۔ایک سپاہی صابر حسین قریب کھڑا ہے، پہلے تو وہ سکھ کو اپنی رائفل کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ریت پھنسنے کی وجہ سے اس کی رائفل کا ک نہیں ہوتی، پھر وہ دوڑ کر آگے آتا ہے اور سکھ پر قابو پانے میں صوبیدار کی مدد کرتا ہے۔ پوچھ گچھ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سکھ بھارتی توپ خانے کا او پی نشان سنگھ ہے۔اسے ایک جیپ میں بٹھا کر پیچھے لے جاتے ہیں کہ جیپ پر براہ راست ایک گولہ پڑتا ہے جس سے صوبیدار صفدر شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ جیپ الٹ جاتی ہے اور بھارتی قیدی موقع پر ہلاک ہو جاتا ہے۔ رجمنٹ کے ایک صوبیدار میجر جلال کو بھی زخم آئے ہیں۔ سپاہی صابر حسین کی ایک ٹانگ زخمی ہوتی ہے۔صوبیدار صفدر کو ہسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔زخم بھرنے کے بعد وہ سبجرہ کا دفاع کرتے ہوئے کمال پور گاؤں میں دوبارہ زخمی ہو جاتا ہے۔صحت یاب ہونے پر وہ آج پھر ستلج کے کنارے مورچے میں ڈٹا ہوا ہے۔

لاہور کی طرف پیش قدمی کے منصوبے!

دن بھر کا تھکا ہارا سورج مغرب کی پہنائیوں میں ڈوب چکا ہے، شفق کی سرخی ابھی تک باقی ہے اور شوال کا چاند پندرھویں منزل میں قدم رکھنے سے پہلے ذرا دم لے رہا ہے۔تھوڑی ہی دیر بعد جرات وعزیمت کی تاریخ کا ایک عہد آفریں باب کھلنے والا ہے، حوصلے اور ولولے نئی آن سے نکھرنے والے ہیں۔ جذبے انگڑائیاں

لے کر بیدار ہونے والے ہیں اور جوان، گرم خون ایک نئے بانکپن کے ساتھ بہار دینے والا ہے۔

انتظار کے لمحات ختم ہو چکے ہیں۔ صبر کا نازک آبگینہ چھلک اٹھا ہے۔ اب مزید تاب نہیں۔ وقت کی نبض رک سی گئی ہے..... ''بزن'' کا اشارہ ہوتا ہے۔ زمانہ ایک مختصر سے وقفے میں صدیوں کی مسافت طے کر لیتا ہے۔

قرون اولیٰ کے مسلمان غازیوں اور شہیدوں کی جرأت و سرفروشی کی روایات دہرائی جا رہی ہیں۔ سرحد پاک کا چپہ چپہ اپنے مجاہدوں کی لازوال قوت حیدری کی گواہی دے رہا ہے۔ وہ عظیم معرکے جو اس ایک رات میں سر ہوئے اور وہ لافانی کارنامے جو گوشت پوست کے معمولی انسانوں نے انجام دیئے۔ ان گنت اور لاتعداد ہیں۔

معرکے کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس علاقے کے نشیب و فراز ذہن میں رکھ لیجئے۔ لاہور، فیروز پور روڈ پر بیالیسویں سنگ میل پر مشترکہ کسٹم چوکیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ ان سے بھی میل ڈیڑھ میل آگے دریائے ستلج پر ہیڈ ورکس ہے جو ایک قریبی بھارتی گاؤں حسینی والا کے نام سے موسوم ہے۔ ہیڈ ورکس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن اور سڑک کے پل بنے ہوئے ہیں۔ قریب ہی مشرق میں ایک پرانے پل کی برجیاں بھی کھڑی ہیں۔ ان کے دونوں سروں پر دو ٹاور ہیں جو انگریزی دور میں پل کی حفاظت کا کام دیتے تھے اور تقسیم ہند کے بعد بھارت نے انہیں انتہائی مضبوط قلعوں میں تبدیل کر دیا۔ دریا کے اس طرف کا ٹاور قصر ہند کہلاتا ہے اور پار والا فخر ہند۔ قصر ہند کے سامنے سیاہ رنگ کے پتھر سے ایک یادگار بنی ہوئی ہے۔ یہاں دو مشہور زمانہ انقلابیوں بھگت سنگھ اور دت کی آخری رسوم ادا کی گئی تھیں۔

اس وقت پاک فوج جس علاقے پر قابض ہے، 1960ء سے پہلے وہ پاکستان میں شامل تھا لیکن جب دوبارہ حد بندی ہوئی تو نئے سمجھوتے کے تحت بھارت کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد ہی قصر ہند کے سامنے یادگار تعمیر کی گئی ورنہ 60ء سے قبل یہاں ہمارے رینجرز کی محض ایک سرحدی چوکی ہوا کرتی تھی۔

3 دسمبر 1971ء کی رات کو اصل معرکہ قصر ہند اور ہیڈ ورکس کے قرب و جوار میں لڑا گیا اور اس کے نتیجے میں دشمن کے لئے سڑک کے راستے لاہور کی طرف پیش قدمی کے امکانات مسدود کر دیئے گئے۔ اس کے باوجود دشمن ہیڈ ورکس کے مشرق سے پیدل فوج کے ذریعے جوابی حملہ بآسانی کر سکتا تھا کیونکہ دریا میں پانی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یوں بھی ادھر سے فیروز پور اور قصور کا درمیانی فاصلہ مقابلتاً کم ہے۔ اس طرف سے

دشمن کی پیش قدمی کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا تھا کہ ہیڈ ورکس اور قصر ہند کی طرف لڑنے والے پاک فوج کے دستے بالکل کٹ کے رہ جاتے، چنانچہ دشمن کو ادھر سے بھی دریا کے پار دھکیلنے کے لئے کارروائی کی گئی اور اولیکے بند، اولیکے پوسٹ، راجو کے پوسٹ اور شامیکے پوسٹ کے معرکے تاریخ کے سینے پر نقش ہو گئے۔

حسینی والا سیکٹر کا پورا علاقہ دریائی ہے۔ ستلج کی مختلف شاخوں کو ہیڈ ورکس پر اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ سیلاب کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے متعدد بند اور حفاظتی پشتے تعمیر کئے گئے ہیں جنہیں دشمن نے جارحانہ مقاصد کے لئے اور بھی مضبوط کر رکھا ہے۔ بندوں کے درمیان دور دور تک سرکنڈوں، سروٹوں اور نرسلوں کا جنگل چلا گیا ہے۔ بعض مقامات پر انسان تو کیا، کسی حیوان کا گذر بھی ناممکن ہے۔ جہاں کہیں کھلی جگہ ہے، دشمن نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں یا خاردار تاروں کی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ اونچے بندوں کے ایک طرف اس قدر گہرا کرال ٹریک کھودا گیا ہے کہ آدمی کورینگ کر چلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ سیدھا ہو کر مختلف مورچوں کے درمیان آ جا سکتا ہے۔ بندوں کے اوپر مشین گنوں، مارٹروں اور ٹینک شکن توپوں کے پختہ مورچے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کنکریٹ اور لوہے کے بنکر بھی ہیں جن پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔ یہ تمام دمدمے اور بنکر اس طرح کیموفلاج کئے گئے ہیں کہ انسان ان کے اوپر بھی چڑھ جائے، تب بھی صورتحال کی نزاکت کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ یہاں دنوں اور ہفتوں کا نہیں، مہینوں کا ساز و سامان اور گولہ بارود جمع کر دیا گیا ہے اور نمبر 35 انڈین انفنٹری بریگیڈ کی بہترین فورس جھونک دی گئی ہے۔ اس میں نمبر 15 پنجاب رجمنٹ (پٹیالہ) اور بارڈر سکیورٹی فورس کی نمبر 25 بٹالین بھی شامل ہے۔ بھارت کو اپنے اس دفاعی حصار پر ناز ہے۔ مزید کمک کے لئے فیروز پور میں دو انفنٹری ڈویژن اور ایک بکتر بند ڈویژن بھی تیار کھڑے ہیں تا کہ لاہور کی طرف ''مارچ'' کرنے میں آسانی رہے لیکن بھارت بے خبر ہے کہ اسے کن ''جنوں'' سے واسطہ پڑا ہے۔ بدر و حنین کے غازی اور قادسیہ دیرموک کے میدانوں کو لتاڑنے والے اسلام کے عظیم اور جری فرزند فیروز پور اور دلی کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے ہیں۔

قصر ہند اور پیری میٹر کے معرکوں کی تفصیلات آئندہ چھوڑتے ہوئے اس وقت ان چار دفاعی کارروائیوں کا حال سنئے جن سے دس مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے اور مستحکم قلعہ بندیوں میں محفوظ دشمن کا کچومر نکل گیا۔ یہیں پر نمبر 35 انڈین انفنٹری بریگیڈ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ چند ایک بھارتی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے لیکن دریائے ستلج کی مختلف شاخوں میں ڈوب کر مر گئے۔ ان کی لاشیں ہفتوں تک

دریا کے رتیلے کناروں پر پڑی سڑتی رہیں۔

اب یا پھر کبھی نہیں

حسینی والا سیکٹر میں سب سے پہلے پنجاب رجمنٹ کی جس کمپنی کو دشمن کے خلاف حرکت میں آنے کا حکم ملتا ہے، اس کی کمان کیپٹن کرامت علی شاہ کے ہاتھ میں ہے۔ بھرے بدن اور مضبوط جثّے کا یہ نوجوان افسر اپنے جوانوں کی روح رواں ہے۔ سرکنڈوں اور خاردار تاروں کے درمیان رینگنے سے پہلے وہ ہر ایک جوان کو موقع کی نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ ''اب یا پھر کبھی نہیں'' کا اصول ذہن نشین کراتا ہے، لیکن جوانوں کے جذبے کو ابھارنے کے لئے یہ الفاظ محض رسمی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی جان کی بازی لگا دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ انہیں انتظار کے شدید کرب سے گزرنے کے بعد دشمن سے پنجہ آزمائی کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عظیم سے عظیم تر کامرانیوں کا اہل ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

اس کمپنی کو آگے بڑھ کر اولیکے بند پر دشمن کی پوزیشنوں کو روندنے کا ٹاسک دیا گیا ہے۔ اللہ کے یہ شیر دل مجاہد اکتالیسویں سنگ میل کے قریب سانده بند کی طرف سے حرکت میں آتے ہیں اور اولیکے بند کو ملانے والے دو پشتوں پر پھیل کر دشمن کی طرف رینگنے لگتے ہیں۔ کیکر کے درخت، نرسلوں کے جھنڈ، پانی کے کھڈ، خاردار تاریں اور بارودی سرنگیں ان کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوتیں۔ سربکف جوان کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ دشمن کے پہلے مائن فیلڈ میں سے بخیر و عافیت گزر جاتے ہیں۔ آگے پندرہ بیس گز دور انہیں دشمن کی نقل و حرکت دکھائی دیتی ہے۔ ایک نئے تجربے سے دوچار ہونے کے تصور سے جوانوں کے دل ایک لمحے کے لئے زور زور سے دھڑکنے لگتے ہیں۔ مصلحتوں کا غبار ان کی نظروں کے سامنے سے چھٹ جاتا ہے اور دلوں پر سکینت طاری ہو جاتی ہے۔ پھر انہیں اپنی ایک ماں بہن کی عفت و عصمت کا نہیں، کروڑوں پاکستانیوں کی عزت و ناموس کا خیال آتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ انتقام کا جذبہ شدید تر ہو جاتا ہے۔ ایک فلک شگاف نعرہ تکبیر بلند ہوتا ہے۔ جوان عقابی شان سے جھپٹتے ہیں۔ بارودی سرنگیں بچھانے میں مصروف دشمن کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بوکھلا کر چلاتے ہیں: ''ادھر نہ آنا، ادھر نہ آنا، آگے بارودی سرنگیں ہیں۔'' اور پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ تعداد میں آٹھ دس ہیں۔ ہماری پلاٹون کی نفری بھی اتنی ہی ہے۔ پلاٹون کمانڈر نائب صوبیدار روم حسین شاہ کے دل میں مقابلے

کی حسرت باقی رہ جاتی ہے۔

حسینی والا سیکٹر کا پہلا شہید

نائب صوبیدار اپنے جوانوں کے ہمراہ اوطیکے بند پر پوزیشن سنبھال لیتا ہے تا کہ اگر دشمن کا جوابی حملہ ہو تو اسے پسپا کر دیں۔ ابھی وہ مورچے کھود رہے ہیں کہ ہا کی سپر کی طرف سے مشین گنوں، 3 انچ دہانے کی مارٹروں اور بے شمار خود کار اسلحے کا فائر ان پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ ہمارے جوان بند کی آڑ میں ہو جاتے ہیں۔ کچھ دشمن کے کرال ٹریک میں چوکس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بارش کی طرح گولیاں برس رہی ہیں۔ توپ خانے کا فائر بھی قیامت ڈھا رہا ہے۔ دشمن ''جے ہند'' کے نعرے لگاتا ہوا روم حسین شاہ کی پلاٹون پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہمارے جوان، بند پر کسی کور کے بغیر لیٹے ہوئے ہیں اور بھارتی سورما، بنکروں اور دمدموں کی آڑ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ نائب صوبیدار کمال حاضر دماغی اور جرات سے کام لے کر دشمن کا پہلا حملہ پسپا کر دیتا ہے، لیکن ہمارے جوان ابھی سانس لینے نہیں پاتے کہ دشمن تازہ دم نفری کے ساتھ پھر حملہ آور ہوتا ہے اور اندھا دھند فائر کی آڑ میں ہماری پوزیشنوں میں گھس آتا ہے۔ دست بدست جنگ ہونے لگتی ہے۔ سنگینیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں، گرینیڈ پھٹ رہے ہیں اور آٹو میٹک و کرس مشین گنیں چنگھاڑ رہی ہیں۔ عددی طاقت اور بے پناہ گولہ باری کے بل بوتے پر بڑھنے والے بھارتی، کٹ کٹ کر گر رہے ہیں۔ ''رام'' کی دہائی دی جا رہی ہے۔ دشمن ایک بار پھر زخم چاٹتا ہوا بے شمار لاشیں پیچھے چھوڑ کر بھاگ نکلا ہے۔ اب وہ مورچوں میں بیٹھ کر گولہ باری شروع کر دیتا ہے۔ نائب صوبیدار دشمن کو ٹھکانے لگانے کے لئے پلاٹون کے ہمراہ آگے بڑھتا ہے۔ نعرہ تکبیر اور نعرہ حیدری کے شور میں وہ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ نائب صوبیدار آگے بڑھ بڑھ کر وار کر رہا ہے۔ ناگاہ مارٹر کا ایک گولہ عین اس کے قریب پھٹتا ہے۔ زخم کاری لگا ہے۔ خون کا فوارہ پھوٹ نکلتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی اس کے حملوں کی تندی و تیزی لائق دید ہے۔ آخر وہ چکرا کر گر پڑتا ہے۔ کلمہ طیبہ اس کے لبوں پر ہے اور ہاتھوں سے پلاٹون کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جان، جاں آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔ حسینی والا سیکٹر کا پہلا شہید نائب صوبیدار روم حسین شاہ ہے۔ حیات سرمدی بڑھ کر اس کے جسد خاکی کو چوم لیتی ہے۔ اس کے ساتھ نائیک تاج اور ایک جوان ثواب الدین زخمی ہو گئے ہیں۔

اس اثناء میں ایک اور پلاٹون صوبیدار منظور حسین کی سرکردگی میں اوطیکے بند پر بائیں جانب پہنچ چکی

ہے۔ آگے ایک مشین گن بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ کمپنی کمانڈر کیپٹن کرامت بنفس نفیس صورتحال کا جائزہ لیتا ہے۔ توپ خانے کا آبزرور کیپٹن اختر بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ تمام جنگی اصولوں اور ذاتی حفاظت کے طریقوں کو پس پشت ڈال کر پیدل فوج کی اگلی صفوں میں موجود ہے۔ مشین گن پوسٹ کو تباہ کرنے کے لئے توپ خانے کا فائر کرایا جاتا ہے مگر بنکر اس قدر مضبوط ہے کہ گولوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کمپنی کمانڈر اب صوبیدار منظور حسین کے پلاٹون کو مشین گن تباہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ پلاٹون سر تسلیم خم کرتا ہے۔ سیکشن کمانڈر لانس حوالدار لال بادشاہ آگے بڑھتا ہے۔ اس عرصے میں دشمن کی کورآرٹلری قیامت خیز گولہ باری شروع کر دیتی ہے۔ ایک گولہ سیکشن کمانڈر نائیک محمد یوسف کے قریب پھٹتا ہے۔ اسے خاصے گہرے زخم آتے ہیں۔ فیلڈ پٹی باندھ دی گئی ہے۔ یوسف لڑنے کے قابل نہیں۔ کمپنی کمانڈر اسے پیچھے جانے کی اجازت دیتا ہے لیکن وہ سادگی سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ آزمائش اور مصیبت کی اس گھڑی میں اپنے جوانوں سے علیحدہ ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے ساتھ سپاہی میو خاں اندھا دھند گولہ باری کے باوجود گن پر جما بیٹھا ہے اور دشمن پر کارگر فائر کر رہا ہے۔ پھٹتے ہوئے گولوں کے گرد و غبار اور دھوئیں کے باوجود اس کی ہر گولی اپنی قیمت وصول کر رہی ہے۔

معرکہ عروج پر ہے۔ اللہ اکبر کا نعرہ مشین گنوں کی چنگھاڑ پر بھی حاوی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے صورتحال دھندلا سی گئی ہے۔ ہر ایک اپنے طور پر دشمن سے نبرد آزما ہے۔ عین اس وقت ایک گولہ صوبیدار منظور حسین کی پوزیشن کے قریب پھٹتا ہے۔ دھوئیں کا مرغولہ بلند ہوتا ہے۔ جوانوں کا خیال ہے کہ صوبیدار بھی شہادت کے منصب پر سرفراز ہو چکا ہے۔ صوبیدار منظور اپنی خیریت کی اطلاع دیتا ہے تو وہ فرط خوشی سے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں۔

لانس حوالدار لال بادشاہ پہلو بدل بدل کر مشین گن پوسٹ پر حملے کر رہا ہے۔ دشمن بڑی بہادری سے مورچے میں ڈٹا ہوا ہے اور فائر کے ساتھ ساتھ فحش گالیوں کی بوچھاڑ بھی کر رہا ہے۔ ہمارا ایک جوان مشین گن پوسٹ کی طرف بڑھتا ہے تو مشین گن کی پوری باڑھ اس کے جسم کو چھید کے رکھ دیتی ہے۔ وہ پوسٹ کے عین سامنے گر پڑتا ہے۔ چھریرے بدن کا لانس حوالدار لال بادشاہ یہ منظر دیکھ کر غیظ و غضب میں پھنکارنے لگتا ہے۔ دشمن سے انتقام کا جذبہ اور شدید ہو جاتا ہے لیکن پہلے زخمی ساتھی کو محفوظ مقام پر بھی منتقل کرنا ہے۔ لال بادشاہ جرأت اور بے لوث قربانی کا لازوال مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور توپوں

کے دہانے سے برستی ہوئی آگ میں زخمی جوان کو پیچھے لے آتا ہے۔اسی پر اکتفا نہیں، لیڈرشپ کا بلند معیار پیش کرتے ہوئے وہ دوبارہ مشین گن پوسٹ کی طرف رینگنے لگتا ہے۔تاک کر ایک ہینڈ گرینیڈ مورچے کے فاکس ہول میں پھینکتا ہے۔زوردار دھماکے کے ساتھ مشین گن پھٹ جاتی ہے، ساتھ ہی تین بھارتی تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتے ہیں۔

ایک ایک کر کے دشمن کی تمام رکاوٹیں دور کی جا چکی ہیں۔ پنجاب رجمنٹ کے یہ جیالے مجاہد مختلف دستوں میں بٹ کر بچے کھچے دشمن کا صفایا کر رہے ہیں۔اولیکے بند، ہاکی سپر اور قصر ہند کے بائیں طرف ''بنکر گاؤں'' تک پٹرول بھیجے جاتے ہیں۔دشمن کی مزاحمت ختم ہو جاتی ہے تو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں حسینی والا سیکٹر کی سب سے پہلی کامیابی کا سگنل موصول ہوتا ہے۔

چاند طلوع ہو چکا ہے۔مدھم مدھم روشنی میں بنکر گاؤں کے دیہاتی جانیں بچا کر ستلج کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ان میں کچھ بھارتی فوجی بھی شامل ہیں لیکن پاک فوجی پیٹھ دکھا کر بھاگنے والوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

پہلی جنگ اور پہلا مرحلہ

یکم دسمبر کو اسی پوسٹ سے بھارتیوں نے ہمارے ایک جوان کو مکاری سے اغوا کر لیا تھا۔اس کے ساتھی انتقامی کارروائی کے طور پر دشمن کے بھی کسی سپاہی کو ہتھیانا چاہتے ہیں، لیکن آرڈر نہ ہونے کی بناء پر وہ کمال صبر و ضبط سے کام لے رہے ہیں۔ ہماری ایک پلاٹون کی کمان سیکنڈ لیفٹیننٹ فیض مختار قریشی کر رہا ہے۔وہ ابھی چند دن قبل کاکول اکیڈمی سے سیدھا یہاں پہنچا ہے۔اسے عملی میدان میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسے ایک طرف اپنے اور جوانوں کے درمیان اعتماد کی فضا قائم کرنی ہے، دوسری طرف یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی ثابت قدم رہ کر اور ہوش و حواس برقرار رکھ کر صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ جنگ چھڑتے ہی وہ ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوتا ہے جس سے اس کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں اور جوان اس پر اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ بھارتیوں کی طرف سے فائر کھلنے کے بعد ہمارا ایک سپاہی جلد بازی میں مشین گن کا ٹریگر دبا دیتا ہے، حالانکہ ابھی تک انہیں کسی قسم کی کارروائی کرنے کا حکم نہیں ملا۔دشمن کی طرف سے اندھا دھند فائر آ رہا ہے اور ہمارے مورچوں کے اردگرد ایک انچ جگہ بھی محفوظ نہیں۔ایسے عالم میں پلاٹون کا کمانڈر اور تجربہ کار سپاہی سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔شش و پنج کی سی کیفیت

ہے کہ کون جان ہتھیلی پر رکھ کر گولہ باری میں اس سپاہی کے پاس جائے اور فائرنگ بند کر دینے کو کہے۔ لیفٹیننٹ قریشی ایک لمحے کے اندر فیصلہ کرتا ہے اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے اس سپاہی کی طرف رینگنے لگتا ہے جو ہڑبڑا کر فائر کر رہا ہے۔ آرام سے اسے سمجھاتا ہے اور سپاہی کی گن خاموش ہو جاتی ہے۔

بھارتی سپاہی، اولیکے بند اور اولیکے پوسٹ کے محفوظ مورچوں، پختہ دمدموں اور آر سی سی کے بنکروں میں بیٹھے متواتر فائرنگ کر رہے ہیں۔ آٹومیٹک رائفلیں، ہلکی مشین گنیں، وکرس مشین گنیں، 2 اور 3 انچ دہانے کے مارٹر، آگ اور لوہے کی بارش کر رہے ہیں۔ پیچھے سے چھوٹے بڑے توپ خانے کا اندھا دھند فائر بھی آ رہا ہے۔ اس اثناء میں ہمارے جوانوں کو حکم ملتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے سامنے اولیکے بند پر قبضہ کر لیں تا کہ قصر ہند اور پیری میٹر میں لڑنے والی بھارتی فوج کو اس طرف سے کمک نہ پہنچ سکے اور ساتھ ہی راجو کے اور شامیکے پوسٹوں میں موجود دشمن اس طرف سے کٹ کے رہ جائے۔ اس منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کی ذمہ داری لیفٹیننٹ قریشی اور صوبیدار عبدالرحمان کے پلاٹونوں پر ڈالی جاتی ہے۔ اشارہ ملتے ہی ہمارے جوان بند کے اوپر نو مین لینڈ پار کرتے ہیں۔ آگے بھارتی فوج نے خاردار تاروں کا جال سا بن رکھا ہے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بارودی سرنگیں بھی بچھی ہوئی ہیں۔ پاک فوج کے جانباز سنت ابراہیمیؑ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے نار نمرود میں کود جاتے ہیں۔ ان کی پیش قدمی کا اور کوئی راستہ نہیں، کیونکہ بند کے دائیں طرف پانی سے لبریز گہری جھیل ہے۔ ناچار وہ بارودی سرنگوں کو پھلانگتے ہوئے اولیکے بند اور ساندہ بند کے ٹی جنکشن پر پہنچتے ہیں اور راجو کے پوسٹ کو جانے والے بند پر دور دور تک پوزیشنیں لے لیتے ہیں۔ تائید ایزدی سے کسی جوان کو خراش تک نہیں آتی۔ میجر چیمہ کی کمپنی نے ایک نوجوان افسر کی رہنمائی میں پہلا مرحلہ بخیر و خوبی طے کر لیا ہے۔ ہمارے جوان آگے بڑھ کر اولیکے پوسٹ کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن پابندیوں کی زنجیروں نے ان کے قدم روک رکھے ہیں اور وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔

کمپنی کمانڈر اپنے جوانوں کے چہروں سے ان کے اندرونی اضطراب کا اندازہ لگا لیتا ہے اور افسران بالا سے آگے بڑھنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ خاصی تگ و دو کے بعد اسے مثبت جواب موصول ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک آدھی رات گزر چکی ہے۔ سامنے دشمن کو تازہ ترین صورتحال کے مطابق منظم ہونے کا موقع مل چکا ہے۔ وہ ذہنی طور پر مقابلے کے لئے تیار ہے۔ کچھ بزدلی دکھا کر راہ فرار اختیار کر چکے ہیں مگر دو اڑھائی سو سپاہی مورچوں میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سکھ اور گورکھے بھی ہیں۔ ان کا تعلق بھارت کے مشہور

انفنٹری بریگیڈ سے ہے۔ان کی ہمت کی داد جس قدر بھی دی جائے کم ہے، کیونکہ انہیں علم ہو چکا ہے کہ ہیڈ ورکس اور پیری میٹر کے گردونواح میں بھارتی فوج گاجر مولی کی طرح کٹ کر ختم ہو چکی ہے اور اس صورت میں ان کا یہاں جمے رہنا خودکشی کے مترادف ہے۔ وہ دور سے ہمارے جوانوں کو غلیظ گالیاں نکال رہے ہیں۔ مذہب، خدا اور رسولؐ کے خلاف دریدہ دہنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پاکستان اور بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ پر رکیک فقرے کس رہے ہیں۔

دشمن کی ان حرکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میجر چیمہ جوانوں کو حملے کے لئے منظم کرتا ہے۔ لیفٹیننٹ مختار قریشی اور صوبیدار رحمٰن کی پلٹنیں پیچھے دفاعی مورچوں میں رکھی جاتی ہیں تاکہ وہ حملہ آور دستے کو فائر کور بھی دیں، دشمن کو اپنی طرف متوجہ بھی رکھیں اور کسی دوسری سمت سے دشمن کے جوابی حملے کو روک سکیں۔ مٹھی بھر جوانوں کے لئے بیک وقت یہ سب کام انتہائی کٹھن ہیں لیکن ان کا جذبہ ایمانی ناقابل تسخیر ہے۔ وہ ان تمام مقاصد سے عہدہ برآ ہونے کا مصمم عہد کرتے ہیں۔ سانده پوسٹ اور اولیکے پوسٹ کو سیدھ میں ملانے والے پشتے پر حوالدار نواب خاں کا ایک سیکشن موجود ہے۔ نائب صوبیدار عجب خاں بھی فائر کور دینے والے پلاٹون میں شامل ہے۔

میں پیچھے نہیں رہ سکتا.....!!!

میجر چیمہ حملے کی قیادت خود کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کل اکیس جوان ہیں۔ ان میں کمپنی کا سیکنڈ ان کمانڈ صوبیدار غازی خان بھی شامل ہے۔ کمانڈر اسے پیچھے رہنے کی اجازت دیتا ہے لیکن غازی خان اس پر بالکل تیار نہیں، اس کا بھائی نائیک خاکی خان 26 مارچ کو مشرقی پاکستان میں شہید ہو گیا تھا، وہ اس کی شہادت کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ میجر چیمہ ایک بار پھر اسے پیچھے رہنے کے لئے کہتا ہے۔ صوبیدار غازی خان جواب دیتا ہے: ''سر جہاں آپ اور میرے دوسرے بیس ساتھی موت کے منہ میں داخل ہو رہے ہیں، وہاں میں پیچھے رہوں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میری سروس میں نو دس ماہ باقی ہیں۔ جاتے جاتے میں بزدلی کا یہ راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ میری زندگی اور موت آپ کے اور جوانوں کے ساتھ ہو گی۔''

روانگی سے قبل میجر چیمہ آخری ہدایات دیتا ہے: ''تم اس مورچے میں بیٹھو گے، تم ادھر فائر کرو گے، تم یہ چال چلو گے..... پھر اس کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں۔ صوبیدار غازی خاں قریب ہی کھڑا ہے۔ وہ میجر

کے الفاظ صاف طور پر سن رہا ہے۔

''الٰہی، ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں۔ اپنی بے بہا رحمتوں کے دروازے ہم پر کھول دے، ہمیں زندگی دے تو عزت کی اور موت دے تو بھی آبرو کے ساتھ۔ رب ذوالجلال، تو ہمارے حوصلوں کو استقامت بخش اور ہماری ہمتوں کو نئی جولانیاں عطا فرما۔'' صوبیدار غازی زیر لب آمین کہتا ہے۔

پاک فوج کے بائیس جوان کروڑوں ماؤں بہنوں کی ناموس کی حفاظت کے لئے قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ ایک قطار میں یوں چل رہے ہیں جیسے پریڈ گراؤنڈ میں سلامی کے چبوترے کے قریب سے گزر رہے ہوں۔ ان کی چال میں وہی تمکنت ہے اور ان کے چہروں کا بانکپن بھی اسی طرح قائم ہے۔ وردی کی پھبن بھی لائق دید ہے اور تنا ہوا سینہ ہمالہ کی علامت بنا ہوا ہے۔

اولیکے بند کے ساتھ ساتھ بائیں طرف سروٹوں اور جھاڑ جھنکار میں وہ متواتر آگے بڑھ رہے ہیں۔ دشمن کا تمام تر فائر ان کی پچھلی دفاعی پوزیشنوں پر گر رہا ہے۔ یہ لوگ گولیوں کے سائے میں خاموشی سے منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ اچانک نائیک بشیر احمد ''چاندی'' رک جاتا ہے۔ وہ سب سے آگے جا رہا ہے۔ پیچھے اس کا سیکشن ہے، درمیان میں میجر چیمہ، اس کے ایک پہلو پر صوبیدار غازی اور دوسرے پہلو پر نائب صوبیدار گل مست خان ہے۔ میجر کا سگنلر نور محمد بھی قدم سے قدم ملائے پیچھے آ رہا ہے۔

نائیک بشیر کے راستے میں مائن فیلڈ کے اردگرد لگی ہوئی خاردار تار حائل ہے۔ وہ اشارے سے صورتحال کی وضاحت کرتا ہے۔ صوبیدار غازی کہتا ہے: ''اگر ہم بارودی سرنگوں سے ڈر گئے تو قوم کے سامنے کیا جواب دیں گے۔''

میجر چیمہ کی رائے ہے: ''بارودی سرنگوں سے صرف دس فیصد نقصان اٹھانا پڑتا ہے، لہٰذا اللہ کا نام لو اور ان میں سے گزر جاؤ۔''

دریں اثناء نائیک بشیر مائنوں کے ساتھ ساتھ ایک نیم پختہ سڑک تلاش کر لیتا ہے۔ مارچ دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں بند ذرا سا خم کھا کر بالکل اولیکے پوسٹ کے سامنے آ جاتا ہے۔ مشین گنوں کے ٹریسر راؤنڈ ہمارے جوانوں کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ میجر خیال کرتا ہے کہ وہ فائر کی زد میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو ذرا بیٹھ جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ نائیک بشیر چاندی ایک ادائے بے نیازی سے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہتا ہے: ''سر فائر بلندی سے گزر کر آگے جا رہا ہے، ہمیں اس سے کوئی

خطرہ نہیں۔''

پیش قدمی جاری رہتی ہے۔ایک جگہ دشمن کے کچھ مورچے نظر آتے ہیں۔ان میں ایک مشین گن کا نیم پختہ دمدمہ بھی شامل ہے۔سپاہی شیر محمد ادھر اشارہ کر کے کہتا ہے:''وہ رہی اولیکے پوسٹ۔'' نائب صوبیدار گل مست جواب دیتا ہے:''پوسٹ ابھی نہیں آئی، آگے بڑھو، راستے میں ہی دشمن سے مت الجھو۔''

پہلے مورچے میں صوبیدار غازی ایک ہینڈ گرینیڈ پھینکتا ہے۔اچانک کسی سمت سے چار پانچ بھارتی فوجی اسے آن دبوچتے ہیں۔دست بدست لڑائی ہوتی ہے۔غازی چاروں شانے چت گر جاتا ہے۔ایک بھارتی سپاہی اس کے پیٹ کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور فوجی داؤ کے مطابق اس کا رشتہ حیات منقطع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔صوبیدار غازی کو بائیں ہاتھ دس پندرہ گز کے فاصلے پر نائیک خوبان گل دکھائی دیتا ہے۔اسے نام لے کر آواز دیتا ہے، تو بھارتی سپاہی بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جاتے جاتے وہ ایک ہینڈ گرینیڈ غازی پر پھینکتے ہیں۔گرینیڈ پھٹتے نہیں پاتا کہ غازی جلدی سے اچک کر اسے بھارتیوں پر دے مارتا ہے۔ایک دھماکہ ہوتا ہے اور چاند کی روشنی میں چار پانچ لاشیں بند کے اوپر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔

صوبیدار غازی سنبھل کر اٹھتا ہے۔اس کے ہاتھ میں اسٹین گن ہے۔اب وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا ہے۔سامنے ایک سایہ سا نظر آتا ہے۔وہ احتیاط کے طور پر اپنی اسٹین گن اس کی طرف سیدھی کر دیتا ہے دونوں قریب ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔

غازی، حوالدار کنال گل کو دشمن کا سپاہی سمجھ کر شاید ٹریگر دبا ہی دیتا مگر اتفاق سے دست بدست لڑائی کے بعد اسٹین گن جام ہو چکی ہے ورنہ نتائج افسوس ناک ہوتے۔دونوں ایک دوسرے سے معذرت چاہتے ہوئے دشمن سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں۔

بند کے اوپر دوسرے مورچے کی طرف میجر غلام حسین چیمہ بڑھ رہے ہیں۔انہوں نے اسٹین گن تان رکھی ہے۔اچانک مورچے سے ایک سکھ کود کر باہر آ جاتا ہے اور اپنی گن کا رخ میجر چیمہ کی طرف کر دیتا ہے لیکن میجر چیمہ پہل کر چکا ہے۔سکھ لڑکھڑا جاتا ہے۔تاہم وہ بھی ٹریگر دبا چکا ہے، گولیاں میجر کے پہلو سے کتراتی ہوئی نکل جاتی ہیں اور وہ بال بال بچ جاتا ہے۔

میجر چیمہ تیسرے مورچے پر حملہ کرتا ہے۔بھارتی فوجی، گن چھوڑ کر مورچے میں دبک گیا ہے۔میجر اسے بالوں سے پکڑ کر باہر گھسیٹنا چاہتا ہے، یہ تگ و دو دھینگا مشتی کا روپ دھار لیتی ہے۔نائب صوبیدار گل مست

خاں کی نظر میجر پر پڑتی ہے، وہ یہ سوچ کر کہ کہیں بھارتی فوجی، میجر پر غالب نہ آ جائے اندازے سے دشمن پر فائر کر دیتا ہے۔ گولیاں میجر کے دونوں ہاتھوں کے درمیان سے گزرتی، پیشانی کو چھوتی ہوئی دشمن کے سر میں جا لگتی ہیں۔ ساتھ ہی اس کی مزاحمت ختم ہو جاتی ہے۔ گل مست خاں نے بھاری خطرہ مول لے کر فائر کیا ہے۔ ممکن تھا گولی دشمن کی بجائے میجر کو لگ جاتی۔ خصوصاً جنگ کی ہیجانی کیفیت میں تو ایسے مواقع زیادہ ہوتے ہیں مگر خدا کی مدد شامل حال ہے اور پاک فوج کے جوانوں کی تربیت بھی کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں اوسان بحال رکھ سکیں۔

وطن پاک کے جواں ہمت سپاہی دشمن کے مورچے صاف کر رہے ہیں۔ وہ ہر مورچے میں گرینیڈ پھینکتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اگر اندر کوئی بھارتی فوجی موجود ہے تو وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔

ٹی جنکشن کے دائیں طرف بند کے عین اوپر چوتھا مورچہ ہے۔ اس میں ایک رخ پر مارٹر فٹ ہے تو دوسرے رخ پر وکرس مشین گن تڑتڑ فائر کر رہی ہے۔ نائب صوبیدار گل مست خان مورچے کے منہ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے، جیب سے ہینڈ گرینیڈ نکالتا ہے، فائرنگ پن جدا کرتا ہے اور اللہ کا نام لے کر بم اندر پھینک دیتا ہے۔ بھارتی سپاہی تڑپتا ہوا مورچے کے باہر آن گرتا ہے۔ اس اثناء میں سپاہی سعد اللہ نیازی مشین گن پر جھپٹ چکا ہے۔ وہ ایک گرینیڈ مورچے کے اندر دے مارتا ہے، یوں او لیکے پوسٹ کی طرف جانے والے پشتے کے سرے پر تمام رکاوٹیں صاف ہو جاتی ہیں۔ میجر چیمہ اپنے جوانوں کو سیدھا پشتے پر لے جانے کی بجائے دائیں طرف نیچے اتر جاتے ہیں۔ چند گز چل کر دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی پوسٹ دکھائی دیتی ہے۔ یہاں ایک ٹاور بھی ہے جہاں سے ایک مشین گن ہماری ساندہ پوسٹ پر فائر کر رہی ہے۔ میجر چیمہ اسے برباد کرنے کا حکم دیتا ہے تو سپاہی میر عالم اپنی گن کا رخ اوپر کی طرف کر دیتا ہے۔

دشمن کے دفاعی حصار میں

پیش قدمی جاری ہے۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھا جا رہا ہے کیونکہ ان کے دائیں طرف بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ اب وہ ایک چھوٹے سے خوبصورت باغیچے میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ دشمن کے عقب میں پہنچ چکے ہیں۔ پوسٹ کے دونوں طرف آر سی سی کے دو بنکر ہیں جن میں مشین گنیں پوری ہیبت سے چنگھاڑ رہی ہیں۔ اپنے جوان فائر سے بچتے بچاتے پوسٹ پر ہلہ بول دیتے ہیں۔ میجر چیمہ پہل کر کے راکٹ لانچر

سے بنکر کو ہٹ کرتا ہے۔ ساری پوسٹ لرز اٹھتی ہے۔ بھارتی فوجی بنکر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

تقریباً اسی وقت صوبیدار غازی خاں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک بھارتی فوجی اس کے پیٹ پر چڑھ گیا تھا۔ اس کا جی متلانے لگتا ہے اور پھر قے شروع ہو جاتی ہے۔ میجر چیمہ اسے ایک محفوظ جگہ پر لٹا کر اوپر کمبل ڈال دیتا ہے۔ برستی گولیوں میں اس کے لئے چائے تیار کی جاتی ہے۔ صوبیدار غازی کی طبیعت سنبھلتی ہے تو جوانوں کے دوش بدوش پھر لڑائی میں شریک ہو جاتا ہے۔

پوسٹ کے پچھلے بنکر میں ابھی تک دشمن ڈٹا ہوا ہے۔ بنکر کے آہنی دروازے اندر سے بند ہیں۔ اسے خاموش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ فاکس ہول کے راستے گرینیڈ پھینکا جائے لیکن بنکر کے سامنے جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے جوان یکے بعد دیگرے گرینیڈ اندر پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دیوار دوہری ہونے کی بنا پر دشمن کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ سارے گرینیڈ بیرونی حصے میں گر کر پھٹ جاتے ہیں۔ سپاہی بشیر جونیئر کسی اور جانب سے بنکر کے قریب پہنچتا ہے اور ہاتھ بڑھا کر گرینیڈ اندر پھینک دیتا ہے اور بنکر خاموش ہو جاتا ہے۔ آگے پیپل کا ایک درخت ہے، اس کے نیچے بھی ایک دمدمہ ہے۔ یہاں سپاہی کمال الدین دشمن کو گولی مار کر جہنم رسید کر دیتا ہے۔

پشتے پر دونوں طرف پتھر ہی پتھر ہیں۔ بیچ میں ایک تنگ سی پگڈنڈی دریا کی طرف جا رہی ہے۔ پشتے کے ساتھ ساتھ کرال ٹریک بھی کھدا ہوا ہے لیکن ہمارے جوان ایک قطار میں دریا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پشتے کے سرے پر پختہ سیڑھیاں دریا کے اندر اترتی ہیں۔ میجر چیمہ ان سیڑھیوں پر پہنچتا ہے تو دشمن کی مارٹر گنوں پر نگاہ جا پڑتی ہے۔ وہ چلا کر آرڈر دیتا ہے ''جوانو پشتے پر پھیل جاؤ اور حملہ کر دو۔'' ایک ایک کر کے یہاں بھی تمام مورچے صاف کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے جوان دریا کے کنارے مورچے کھود کر پوزیشنیں لے لیتے ہیں۔

میجر چیمہ، صوبیدار غازی اور سگنلر نور محمد پوسٹ کے ٹاور پر چڑھتے ہیں۔ میجر چیمہ سجدہ شکر بجالاتا ہے۔ غازی خان اور نور محمد کی جبین بھی رب ذوالجلال کے حضور جھکی ہوئی ہیں۔ میجر چیمہ سر اوپر اٹھاتا ہے تو اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو جھلملا رہے ہیں۔ یہی حال تمام جوانوں کا ہے۔

پوسٹ پر قبضہ مکمل ہونے کے بعد بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو فتح کی خوش خبری دی جاتی ہے۔ اس اثناء میں ساندہ پوسٹ پر متعین لیفٹیننٹ قریشی اور صوبیدار رحمٰن کی پلٹنیں بھی آگے طلب کر لی گئی ہیں۔ کامیابی کی خوشی میں

میجر چیمہ خود چائے تیار کر کے تمام جوانوں کو پیش کر رہا ہے.....اس نے کمل اوڑھ رکھا ہے تا کہ پہچان نہ ہو سکے۔ایک جوان تو چائے واپس کرتے ہوئے درشت لہجے میں حکم دیتا ہے: ''چائے ٹھنڈی ہے، گرم کر کے لاؤ۔'' میجر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ جوان کو پتہ چلتا ہے تو معذرت کرتا ہے۔ میجر چیمہ جواب میں مسکرا دیتا ہے۔

او لیکے پوسٹ بھارتی فوج کا ایک زبردست دفاعی حصار ہے۔ بارودی سرنگوں، پختہ دمدموں، لوہے اور سیمنٹ کے بنکروں میں گھری ہوئی یہ پوسٹ بظاہر ناقابل تسخیر نظر آتی ہے۔لیکن اللہ کے شیر ایک ضرب حیدری کے ساتھ اس دفاع کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔ بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی ان کے سامنے پر کاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مر مٹنے کا عہد

اور یہ داستان ہے پاک فوج کے ان مٹھی بھر جانبازوں کی جنہوں نے راجو کے پوسٹ پر دشمن کی آہنی قلعہ بندیاں روند ڈالیں۔ یہاں بھی پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی دفاعی پوزیشن میں ڈٹی ہوئی ہے۔اس کی کمان نوجوان اور ہنس مکھ ارشد زماں کر رہا ہے۔ اسے سختی سے ہدایت ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی پوزیشن نہ چھوڑے.....ممکن ہے دشمن قصر ہند اور پیری میٹر میں اپنا حشر دیکھ کر اس طرف سے جوابی یلغار کرے۔ یہاں سرحد مقابلتاً کافی اندر ہے اور آسانی سے آگے بڑھ کر قصور اور فیروز پور روڈ کو کاٹا جا سکتا ہے۔اسی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے میجر ارشد کو خالصتاً دفاعی ٹاسک دیا گیا ہے لیکن جب رات کے وقت ہیڈ ورکس کی لڑائی تقریباً ختم ہو چکی ہے تو دشمن پر آخری وار کرنے کے لئے میجر ارشد کی کمپنی کو بھی ایڈوانس کا حکم مل جاتا ہے۔ وہ اپنی فورس کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ایک حصہ دفاعی پوزیشن میں بیٹھا رہتا ہے۔ دوسرا حصہ آگے بڑھ کر ایک پہلو سے دشمن کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔اس کی کمان حوالدار جاوید کے ہاتھ میں ہے۔ تیسرا حصہ میجر ارشد ساتھ لے کر دشمن کی راجو کے پوسٹ کی طرف بڑھتا ہے۔اس نے حوالدار جاوید کی پوزیشنوں کے قریب سے دشمن کے بند کا رخ کیا ہے۔ چلنے سے پہلے اس نے پر جوش تقریر کر کے جوانوں سے اپنے

مقصد کے لئے مر مٹنے کا عہد لیا ہے۔

حوالدار جاوید کی فائرنگ سے دشمن ایڈوانس مورچوں سے بھاگ کر پیچھے جا چھپتا ہے۔ میجر ارشد اور اس کے ساتھی بند کے دائیں طرف نیچے نیچے جا رہے ہیں تا کہ دشمن کے فائر سے محفوظ رہ سکیں۔ وہ مختلف بندوں کی ایک مثلث عبور کرتے ہیں کہ مارٹر کے دو گولے ان کے بالکل قریب

بنکروں میں جا چھپا ہے۔ پاک فوج کی ایک کمپنی میجر ارشد کی کمان میں ایک اور معرکے میں سرخرو ہوتی ہے۔ اس ایکشن میں توپ خانے کا آبزرور کیپٹن طاہر منہاس بھی پیدل فوج کے دوش بدوش شجاعت دکھاتا رہا ہے۔

پنجہ آزمائی کی ادھوری خواہش

حسینی والا سیکٹر کا سب سے مختصر لیکن سب سے اہم ایکشن بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی سرانجام دیتی ہے۔ اس کی کمان میجر مبارک کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کمپنی بھکی ونڈ، حاکو والا اور کمال پور کی طرف یعنی سہجرہ نیک Neck پر دفاعی پوزیشن سنبھالے ہوئے ہے۔ اسے ایک طرف فیروز پور کی طرف اور دوسری طرف کھیم کرن، مہدی پور کی طرف سے دشمن کی جارحیت کا خطرہ درپیش ہے۔ پاک فوج کے یہ جیالے جوان دونوں چیلنج قبول کرتے ہیں۔

فیروز پور کی طرف سے دریا پار کر کے دشمن جوابی حملہ کر سکتا ہے، چنانچہ اسے زمین کے جنگی فوائد سے محروم کرنے کے لئے میجر چیمہ، پلاٹون کمانڈر صوبیدار نذر حسین کو شامیکے پوسٹ پر قبضہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ہمارے جوان پوسٹ پر عقب سے پہنچ جاتے ہیں لیکن دشمن وہاں سے بھاگ چکا ہے۔ 14 دسمبر کو میجر چیمہ چاندی والا گاؤں پر ایک حملے کی کمان کر رہا ہے۔ دشمن یہاں بھی سامنے آنے کی جرات نہیں کر سکا۔ پنجہ آزمائی کرنے کی خواہش اللہ کے شیر مجاہدوں کے دل ہی میں رہ جاتی ہے۔

ان چار معرکوں کے نتیجے میں دشمن سے تقریباً دس مربع میل کا علاقہ چھینا جا چکا ہے لیکن سیکٹر کمانڈر میجر جنرل مجید ملک کا کہنا ہے کہ ہماری کامیابی کو گزوں اور میلوں میں نہ ناپئے بلکہ یہ دیکھئے کہ ہم نے دشمن کی لاہور پر یلغار کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں اور اس طرح پاکستان کو تباہ کرنے کی بھارتی خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ امر شہیدوں کو سلام، شیر دل غازیوں کو سلام!!

جب قصر ہند سرنگوں ہوا

تین دسمبر کی خنک چاندنی رات جنگوں کی تاریخ میں ایک نئے درخشاں باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کی

پیشانی پر غازیوں اور شہیدوں کے گرم لہو کے قطرے جھومر کی طرح دمکنے لگتے ہیں۔لہو کے یہ قطرے پاک سرزمین کی ہریالی کو ایک نیا بانکپن بخشتے ہیں۔لہو کے ان قطروں میں غازیان اسلام کی وہ زندہ و پائندہ روایت جھلک رہی ہے جس کا حسن بدر واحد اور قادسیہ و یرموک کے میدانوں نے نکھارا ہے اور جسے کشمیر، چونڈہ اور واہگہ کی خاک نے نمو عطا کی ہے۔آج حسینی والا کے میدان میں دشمن نے اس روایت کو للکارا ہے اور دین حق کے پرستار مجاہد اس کے لئے موت کا پیغام بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں..... پاک فوج کی بلوچ رجمنٹ کی ایک زندہ دل بٹالین کو فخر حاصل ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے مستحکم ترین حصار کو آناً فاناً روند ڈالے۔میجر زاہد یاسین ستارہ جرات اسی بٹالین کی بی کمپنی کی کمان کر رہا ہے۔اس کا مقصودہ مقام وٹارگٹ قصر ہند ہے۔یہ قلعہ نما عمارت چاروں طرف سے سیلابی بندوں سے گھری ہوئی ہے جن پر کنکریٹ کے بنکر، موٹے موٹے شہتیروں، لوہے کی چادروں سے بنے ہوئے دمدمے، گہرے کرال ٹرینچ دور دور تک چلے گئے ہیں۔کھلی جگہ پر بارودی سرنگیں ہیں۔بنکروں اور دمدموں میں وکرس مشین گنیں نصب ہیں جو ذرا سی حرکت پر بے تحاشا فائر کرنے لگتی ہیں۔قصر ہند کا یہ حصار کسی بھی کمانڈر کی ذہانت، کسی بھی انسان کی مردانگی اور کسی بھی فوجی کی سپہ گری کی صلاحیت کے لئے کھلا چیلنج ہے۔کسی جانب کوئی ایسا چور دروازہ نہیں جہاں سے پاک فوج اس دفاع میں گھس سکے، لیکن ایک بات جس پر ہمیشہ دشمن اسلام مار کھاتا چلا آ رہا ہے، یہ ہے کہ وہ اللہ کے سپاہی کی قوت کا غلط اندازہ لگاتا ہے۔وہ ہمیشہ بھول جاتا ہے کہ عشق، مادی خطرات سے خائف نہیں ہوتا، وہ نار نمرود میں یوں کود جاتا ہے جیسے گل وگلزار ہو، وہ نیل کی موجوں سے یوں کھیلتا ہے جیسے وہ کسی برساتی نالے کی حیثیت رکھتا ہو۔

میجر زاہد یاسین کی کمپنی اس تاریخی یلغار کے لئے دیپالپور نہر کو عبور کرتی ہے تو اس کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سید حبیب احمد (ستارہ جرأت) کے دل کی دھڑکنیں سراپا دعا بن جاتی ہیں۔اپنا توپ خانہ دشمن پر قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑا ہے۔دشمن نے بھی جوابی فائر سے قیامت برپا کر دی ہے۔فیروز پور کی جانب سے میدانی اور رتو کی گردوارہ کی طرف سے درمیانی توپ خانے کی آگ آ رہی ہے۔اس قیامت خیز فائر کی وجہ سے بی کمپنی کا ایک پلاٹون نائب صوبیدار محمد خاں کی قیادت میں پیچھے رہ جاتا ہے۔میجر زاہد کے سامنے دو راستے ہیں یا تو اس کا انتظار کرے یا دشمن کو تیاری کی مہلت دیئے بغیر اپنے توپ خانے کے فائر کی آڑ میں آگے بڑھے۔سوچ بچار کے بعد دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور پلاٹون کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔

جائنٹ کسٹمز پوسٹ پر یہ کمپنی ایک دومنٹ کے اندر اندر حملے کی ترتیب اختیار کرتی ہے۔ اگر چہ یہ علاقے حملے کی روایتی ترتیب کے لئے موزوں نہیں جس میں دشمن پر پھیل کر حملہ کیا جاتا ہے، تاہم اس کمپنی کو جے سی پی سے ریلوے بند کی محدود سی جگہ میں ایسی ترتیب اختیار کرنے کی سہولت حاصل ہے۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام اپنے جوان ٹورسٹ انفارمیشن بیورو اور مسجد کے قریب سے سڑک پار کر کے ریلوے بند پر ہلا بول دیتے ہیں۔ نائب صوبیدار محمد حنیف کا پلاٹون دائیں طرف پھیل گیا ہے لیکن کچھ دور جا کر بارودی سرنگوں کی وجہ سے اسے سکڑنا پڑا ہے۔ نائب صوبیدار گل شاہ دوران (تمغہ جرات) کا پلاٹون ایک قطار کی صورت میں دشمن پر جھپٹتا ہے۔ میجر زاہد بھی اپنے کمپنی ہیڈکوارٹر اور توپ خانے کے فارورڈ آبزرویشن آفیسر لیفٹیننٹ افضل نواز گھمن شہید (ستارہ جرات) کے ساتھ سیدھا ریلوے بند پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ان کے بالکل سامنے ایک ریکالیس گن اندھا دھند فائر کر رہی ہے۔ گولہ نکلتے وقت پیدا ہونے والی چمک سے قریب و جوار کا سارا علاقہ روشن ہو جاتا ہے۔ قریب ہی ایک مشین گن بھی در دسر بنی ہوئی ہے۔ اس کا فائر بند ھے نشانے پر آ رہا ہے جس سے ہمارے جوانوں کی پیش قدمی رک جاتی ہے۔ نائیک شاہ نواز اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے رینگ رینگ کر آگے بڑھتا ہے۔ پہلے وہ سپرانر گا سے مشین گن پوسٹ کو ہلا کے رکھ دیتا ہے، پھر ایک جست لگا کر مورچے کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور ہینڈ گرینیڈ سے بھارتی فوجیوں کو اڑا دیتا ہے۔

لیفٹیننٹ افضل نواز توپ خانے کا افسر ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ پیدل فوج کو حسب ضرورت فائر کور دے لیکن وہ معرکے کی شدت کے پیش نظر اپنے آپ کو اسی کام تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ساتھ ساتھ دشمن پر بھی بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا ہے۔ ایک مورچے سے چند سکھ فوجی ہینڈز آپ کئے باہر نکل آتے ہیں۔ لڑائی کے ابتدائی مرحلے میں کوئی شخص دشمن کو کو قیدی بنانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس وقت تمام تر توجہ دشمن کی کمر توڑنے پر مرکوز ہے لیکن سیالکوٹ کے اس جواں سال افسر کی جرات رندانہ ملاحظہ ہو، وہ ان سکھ فوجیوں کے ہاتھ ان کی پگڑیوں سے باندھ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قصر ہند پہنچ کر وہ ان سے پوچھ گچھ کرے گا اور قیمتی معلومات پیچھے اپنے ہیڈکوارٹر کو پاس کر دے گا تا کہ دشمن کے دوسرے ٹھکانوں پر بھی کارگر گولہ باری کی جا سکے لیکن ذرا چل کر وہ ایک اور بنکر پر فائر کرتا ہے، ساتھ ہی مشین گن کا برسٹ آتا ہے اور اس کا جسم چھلنی چھلنی ہو جاتا ہے، وہ زمین پر گرتا ہے۔ خون فوارے کی صورت میں بہہ رہا ہے اور زمین سرخ ہو رہی ہے۔ اس کے

باوجود وہ دشمن پر پھر جھپٹتا ہے اور ایک ہینڈ گرینیڈ سے دشمن کو بنکر کے اندر ہی موت کی نیند سلا دیتا ہے لیکن عین اس وقت وہ بھی خلعت شہادت سے سرفراز ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک مددگار لانس نائیک سراج الاسلام بھی اسی بنکر کے فائر سے زخمی ہو کر تھوڑی دیر بعد شہید ہو جاتا ہے۔

افضل نواز شہید ہی نے نہیں، پورے معرکے میں توپ خانے کے اور افسروں نے بھی اس غیر معمولی جرات و ایثار کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک موقع پر تمام فارورڈ آبزرویشن آفیسر شہید یا زخمی ہو جاتے ہیں اور توپ خانے کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں رہتا۔ اس وقت آرٹلری کے کمانڈنگ آفیسر کرنل آصف خورشید افضل بذات خود بریگیڈ کے تدبیراتی ہیڈ کوارٹر میں وائرلیس سیٹ کا کنٹرول سنبھال لیتا ہے اور پیدل فوج کی بھیجی ہوئی اطلاعات کے پیش نظر غیر نظری فائر کروانے لگتا ہے۔ یوں رات بھر دشمن کا سر دبائے رکھتا ہے۔ کرنل آصف کا یہ کارنامہ جنگ کا پانسہ اپنے حق میں پلٹنے میں انتہائی ممد ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح انجینئر کور کی ایک کمپنی نے میجر محمد نواز کی قیادت میں پیدل فوج کے دوش بدوش کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ حملہ شروع ہونے سے قبل صرف دو دن میں انہوں نے طویل سرحد کے ساتھ ساتھ بارودی سرنگیں بچھائی ہیں۔ جنگ میں دشمن کے مائن فیلڈ میں سے گزرنے کے لئے انہوں نے پیدل فوج کی رہنمائی بھی کی ہے۔ 5 اور 6 دسمبر کی رات انہوں نے ہیڈ ورکس پر ایک ایسی کارروائی کی ہے جو جرأت و عزیمت کی زندہ و جاوید مثال ہے۔ اس کارروائی میں اولیکے پوسٹ کا ہیرو میجر غلام حسین چیمہ (تمغہ جرأت) بھی شریک ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حسینی والا محور میں فاتح پاک فوج کا ہراول دستہ میجر انور کی انجینئرز کمپنی ہی ہے۔

میجر زاہد یاسین انتہائی برق رفتاری سے ریلوے بند پر دشمن کے بنکروں کا دفاع ملیامیٹ کرتا ہوا نہر کے پل کی طرف بڑھتا ہے۔ جب وہ ریلوے بند اور سڑک کے مقام اتصال پر پہنچتا ہے تو چار پانچ سکھ ایک مورچے سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے جوانوں کی آٹومیٹک رائفلوں سے گولیاں تڑتڑ نکلتی ہیں۔ ایک جوانمرد جوش میں آ کر سپرانر گا فائر کر دیتا ہے۔ دھواں چھٹتا ہے تو سامنے دشمن کی لاشیں تڑپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

نہر کے پل پر لانس نائیک (اب نائیک) اصغر کا سیکشن پوزیشنوں میں بٹھا دیا جاتا ہے تاکہ دشمن کی کمک اور رسد کا راستہ مسدود کر دیا جائے۔ چاند طلوع ہو چکا ہے اور اس کی خنک کرنوں میں ستلج کا پانی چمک رہا

ہے۔ گولہ باری ابھی یہاں تک نہیں پہنچی۔ پیری میٹر بھی یوں خاموش ہے جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ دراصل وہاں دشمن پاک فوج کے بڑھتے ہوئے حملے کو روکنے کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اس پر سکون ماحول میں یہ جگہ ایک عجیب سا شاعرانہ منظر پیش کر رہی ہے۔

نائیک اصغر کو نہر کے پل پر بیٹھا کر میجر زاہد اپنے جوانوں کو واپس قصر ہند کی طرف بھیج دیتا ہے اور خود خراماں خراماں سڑک پر آنے والے پلاٹون کمانڈر صوبیدار صفدر علی شاہ (تمغہ جرأت) کے پاس پہنچتا ہے۔ اسے بھی آگے نہر کے پل تک پیش قدمی کرنے کا حکم دیتا ہے اور پھر اسی آن بان کے ساتھ قصر ہند کی جانب مارچ کرتا ہے۔

بی کمپنی نے قصر ہند کو جانے والی سڑک پر بھی دشمن کے مورچے خالی کروا لئے ہیں۔ اب یہ لوگ کرال ٹرنچ میں پوزیشن لے لیتے ہیں۔ یہ جگہ قصر ہند سے بمشکل پندرہ بیس فٹ دور ہے۔ دشمن ابھی تک قلعے کے اندر پوری طرح سرگرم ہے۔ میجر زاہد انہیں گھیرے میں لینے کے لئے اپنے نائب صوبیدار گل شاہ دوران کو حکم یتا ہے کہ وہ بنکر گاؤں کی طرف جانے والے بند پر اپنے پلاٹون کو لے جائے۔ گل شاہ دوران کے جوان ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں آہنی گیٹ کے عین سامنے سے بھاگ بھاگ کر مذکورہ بند پر پہنچتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ قلعے پر فائر بھی کرتے جاتے ہیں۔ آگے ٹی جنکشن کے قریب سپاہی اعظم کی نظر چار سکھوں پر پڑتی ہے۔ وہ فوراً لیٹ جاتے ہیں۔ اعظم فائر کرتا ہے تو ایک سکھ ہینڈز اپ کر دیتا ہے۔ باقی تینوں سپاہی بھی اس کی تقلید کرتے ہیں اور پاک فوج کی قید میں آ جاتے ہیں۔

پٹھان صوبیدار گل شاہ دوران کا پلاٹون جان پر کھیل کر ٹی جنکشن تک ابٹ منٹ بند پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بعد میں اگلے مورچوں سے ایک مشین گن انہیں تنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو کمپنی کمانڈر میجر زاہد کے حکم پر وہ اسے بھی خاموش کر دیتے ہیں۔ اب بنکر گاؤں میں موجود دشمن باقی ماندہ فورس سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ وہ قصر ہند میں محصور ساتھیوں کی کوئی امداد نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف ہیڈ ورکس کی جانب نائیک اصغر کا سیکشن موجود ہے جس نے پیری میٹر یا دریا پار سے بھارتی کمک کا راستہ مسدود کر رکھا ہے اور اب قصر ہند ایسے مایہ ناز بھارتی قلعے پر ہلا بولنے کا وقت آ گیا ہے۔

پوزیشن کچھ اس طرح کی ہے: قصر ہند کے شمالی جانب (پاکستان کی طرف) لوہے کا دروازہ اندر سے مضبوطی سے بند ہے۔ پہلی اور دوسری منزل سے دشمن کے سپاہی مشین گنوں سے مسلسل فائر کر رہے ہیں۔

سب سے اوپر غربی ٹاور پر او پی بیٹھا ہے جو بھارتی توپ خانے سے کارگر فائر کروا رہا ہے۔ پاک فوج نے قلعے کو تین طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے، صرف عقبی حصہ ابھی تک دشمن کے کنٹرول میں ہے۔ توقع ہے کہ اس جانب قلعے کے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا، چنانچہ اسی امید پر آئندہ کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔

سخت جان اور کڑیل میجر زاہد یاسین نے غربی جانب کرال ٹرینچ میں اپنے جوانوں کے ساتھ پوزیشن لے رکھی ہے۔ وہ قصر ہند کے اندر داخل ہونے کے متعلق سوچ بچار کر رہا ہے۔ اتنے میں ایڈ ہاک کمپنی کا میجر محمد اشرف اپنے ایک پلاٹون کے ساتھ پہنچ جاتا ہے۔ میجر زاہد اس غیر متوقع امداد کو غیبی مدد تصور کرتا ہے۔

ایڈ ہاک کمپنی کو اپنے کمانڈنگ آفیسر کرنل حبیب سے حکم ملا ہے کہ وہ دیپالپور نہر کے کنارے میجر محمد حنیف ملک شہید (ستارہ جرأت) کی مدد کرے مگر دشمن کے تند و تیز فائر کی وجہ سے میجر محمد اشرف ایک پلاٹون کے ساتھ بچھڑ جاتا ہے۔ جب کہ دو پلاٹون زیر کمان صوبیدار سردار اور صوبیدار غلام علی نہر کے کنارے روانہ ہو جاتے ہیں۔ میجر اشرف کے لئے مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی چند دن قبل ہی سٹاف کالج سے اس علاقے میں آیا ہے، اسے نہ تو زمین کی صحیح معلومات ہیں اور نہ وہ اپنے جوانوں ہی سے شناسا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عینک کہیں گر کر ٹوٹ گئی ہے، چنانچہ وہ اپنے معین راستے پر نہیں جا سکا۔ قصر ہند کی طرف بھی اس نے اپنی صوابدید کے مطابق جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ راستے میں جے سی پی پر دشمن کی بجلی کی تاریں زمین پر گری پڑی ہیں، ان سے الجھ کر ایک سپاہی خدا بخش شہید ہو جاتا ہے اور سپاہی محمد بشیر کو جھٹکا لگتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو فوراً تار سے جدا کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

تحیر خیز کارروائی.....

قصر ہند پر پہنچتے ہی دونوں افسروں نے قلعہ کی تسخیر کے لئے مشترکہ تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ سب سے پہلے نائب صوبیدار محمد حنیف کی زیر قیادت ایک پارٹی قصر ہند کے عقب میں جاتی ہے تاکہ وہ اندر داخل ہونے کے لئے کوئی ممکنہ رستہ تلاش کرے۔ نائب صوبیدار محمد حنیف کے ساتھ نائیک محمد خاں، نائیک شاہ نواز، سپاہی کرم الٰہی، سپاہی یار محمد اور سپاہی محمد اسلم ہیں۔ یہ لوگ کرال ٹرینچ میں سے جست لگا کر باہر نکلتے ہیں

اور دوڑ کر عقب میں ایک ٹیلی فون کے کھمبے کے پاس لیٹ جاتے ہیں۔ چاند کی روشنی میں دشمن اوپر سے ان کی نقل وحرکت دیکھ لیتا ہے۔ پہلی منزل کی ایک عقبی کھڑکی سے ان پر ہینڈ گرینیڈ پھینکا جاتا ہے۔ میجر زاہد اور محمد اشرف سمجھتے ہیں کہ شاید پوری پارٹی شہادت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ اگلے اقدام کے بارے میں غور وغوض کرنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف نائب صوبیدار محمد حنیف اور اس کے چند ساتھیوں کو گہرے زخم آئے ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی طرح قلعے کی مشرقی جانب نائب صوبیدار گل شاہ دوراں کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور خاصی دیر بعد واپس اپنے پلاٹون سے آملتے ہیں۔

قصر ہند جیسے قدیم لیکن محکم قلعے کو اڑانے کے لئے صرف ٹینک فائر ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ حملے کی منصوبہ بندی کرتے وقت ایسا پروگرام بھی بنایا گیا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ کارروائی بروقت نہیں کی جا سکی۔ میجر زاہد یاسین ایک بار پھر ٹینکوں کی مدد طلب کرتا ہے تا کہ ان سے دشمن کے خودکار ہتھیار برباد کئے جا سکیں اور عمارت میں ایسا شگاف ڈال دیا جائے جس میں سے اپنے جوان اندر داخل ہو کر بچے کھچے دشمن کو ٹھکانے لگا دیں۔

ابھی تک ٹینکوں کا انتظار ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ دشمن ڈٹا ہوا ہے اور پاک فوج کا خاصا نقصان کر رہا ہے۔ اب صرف دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ تمام جوان ایک زبردست ہلا بول کر قلعے پر چڑھ جائیں، لیکن خدشہ ہے کہ خود اپنا ہی نقصان ہو گا اور یہ کوشش بے سود ثابت ہو گی۔ دوسری صورت یہ کہ چند لوگ اپنی جانوں کی قربانی دے کر باقی فوج کے لئے فتح وکامرانی کا رستہ کھول دیں۔

سٹاف کالج کا نوتربیت یافتہ جواں سال میجر محمد اشرف غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو اس عظیم قربانی کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کی کوشش میں اس کی جان چلی جائے تو اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس کے بعد میجر زاہد یاسین جوانوں کی قیادت کے لئے موجود ہو گا۔ میجر اشرف کی یہ پیشکش وطن سے محبت، جانثاری اور فرض شناسی کی ایک عظیم مثال ہے۔

میجر اشرف چھ گرینیڈ، ایک سٹین گن اور تین میگزین ہاتھ میں لیتا ہے اور ایک ایسا والنٹیئر مانگتا ہے جو عقب سے اس کی حفاظت کرے۔ میجر زاہد یاسین رشک کے بے پناہ جذبے کے ساتھ خود آگے بڑھتا ہے لیکن میجر اشرف نفی میں سر ہلا کر کہتا ہے: ''ہم دونوں کی قربانی ہلاکت خیز نتائج پر منتج ہو گی۔ کیونکہ بعد میں جوانوں کی کمان کرنے والا کوئی نہیں۔'' یہ بات درست ہے کیونکہ تقریباً اس وقت نہر کے کنارے پر بلوچ

رجمنٹ کی اس بٹالین کا تیسرا کمپنی کمانڈر اپنے مقصودہ مقام کو چومنے کے فوراً بعد جام شہادت نوش کر چکا ہے۔خود بٹالین کمانڈر کرنل حبیب میدان کارزار میں کود چکا ہے اور اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ زندہ ہے یا شہید۔ایسے عالم میں اگر یہاں بھی قیادت کا فقدان ہو جائے تو پھر پوری بٹالین کے تتر بتر ہو جانے کا خدشہ ہے۔

اسی اثناء میں بی کمپنی کا حوالدار منصب دار سینہ تانے آگے آتا ہے اور میجر اشرف کے ساتھ اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔اس کارروائی میں اس کا کام یہ ہے کہ وہ عقب سے میجر اشرف کی حفاظت کرے اور ضرورت پڑنے پر فائر کور دے۔اگر خدانخواستہ میجر اشرف دشمن کے نرغے میں آ جائے تو حوالدار منصب دار کو اجازت ہے کہ وہ اس کی حفاظت کا خیال دل میں لائے بغیر دشمن پر فائر کر دے۔پروگرام کے مطابق میجر زاہد یاسین اور اس کے جوان کرال ٹرینچ میں بیٹھ کر ان دونوں کو فائر کور دیں گے۔چنانچہ جونہی میجر زاہد دوسرا سپرانر گا قلعہ پر فائر کرتا ہے، میجر اشرف ایک عقابی شان سے جھپٹتا ہے اور قلعے کے عقب میں جنوب کی طرف پہنچ جاتا ہے۔سامنے اس کی نظر سیڑھیوں پر پڑتی ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔وہ سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر چڑھتا ہے۔اس کے بائیں جانب لنگر کی جگہ ہے۔وہ یہاں کھڑا ہو کر اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر پہلا گرینیڈ قلعے کے اندر پھینکتا ہے۔ایک دھماکہ ہوتا ہے اور اندر سے چیخیں بلند ہوتی ہیں۔اس کے بعد وہ ہاتھ بڑھا کر دوا ور گرینیڈ پھینکتا ہے۔قلعے کے اندر تہلکہ برپا ہو جاتا ہے۔زخمیوں اور مرنے والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔کچھ لوگ جان بچانے کے لئے بھاگ کر اوپر کی منزل پر چڑھ جاتے ہیں۔اب میجر محمد اشرف قلعے کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔پاک فوج کا وہ پہلا دلیر اور جرأت مند افسر ہے جس نے ظلم و نخوت کے محکم قلعے کے اندر قدم رکھے ہیں۔اب وہ اپنی سٹین گن سے بغلی کمروں میں سپرے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے لیکن اس نازک وقت پر اس کی سٹین گن فائر نہیں کرتی۔وہ اس کا میگزین بھی تبدیل کرتا ہے لیکن گن ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔

قلعے کا گھپ اندھیرا اور تنہا میجر

عزم و استقلال کا یہ پیکر ذرا بھر گھبراتا نہیں۔وہ ہر قیمت پر اپنا مشن پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے۔چنانچہ

تیزی سے بقیہ تین گرینیڈ بھی مختلف کمروں میں پھینکتا ہے۔ان سے نچلی منزل تمام کی تمام صاف ہو جاتی ہے۔ چار پانچ سکھ لوہے کے گیٹ میں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔انہیں میجر زاہد اور اس کے جوان وہیں ڈھیر کر دیتے ہیں۔

اب میجر محمد اشرف قلعے کے اندر گھپ اندھیرے میں نہ صرف تن تنہا ہے بلکہ خالی ہاتھ ہے۔اگر وہ باہر آ کر مزید اسلحہ لینا بھی چاہے تو خدشہ ہے کہ اپنے ہی جوان اسے دشمن کا بھگوڑا سپاہی تصور کر کے گولی کا نشانہ بنا دیں گے لیکن دوسری طرف اندر رہ کر دشمن کے ہاتھوں بے رحم موت بھی مرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر جان پر کھیل کر باہر آتا ہے، میجر زاہد سے مزید گرینیڈ لیتا ہے اور دوبارہ پہلے کی طرح دوڑ کر قلعے میں داخل ہو جاتا ہے۔تھوڑی ہی دیر میں وہ تمام کمروں میں دشمن کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔اب وہ منصب دار کو بھی بلا لیتا ہے۔ چند منٹ بعد میجر زاہد کچھ جوانوں کے ساتھ اندر آ جاتا ہے۔اب یہ لوگ اوپر چڑھنے کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ خاصی تگ و دو کے بعد سیڑھیاں مل جاتی ہیں لیکن دشمن نے کرسیاں و میز اور اسلحے کی خالی پیٹیاں پھینک کر راستہ بند کر دیا ہے۔سیڑھیوں کے ساتھ دو کمرے ہیں، ان میں دشمن کا وائرلیس سیٹ نصب ہے۔اسے تباہ کر دیا جاتا ہے اور قلعے کے اوپر جانے والے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے جاتے ہیں۔

اب قصر ہند کے اوپر دشمن کی محدود سی نفری رہ گئی ہے۔اسے ختم کرنے کے لئے آہنی دروازے کے بائیں جانب حوالدار میاں خاں اور نائیک گل شاہ دوراں کو پہلی منزل پر چڑھنے کا حکم ملتا ہے۔ وہ بائیں طرف سے رینگ رینگ کر اوپر چڑھتے ہیں۔آگے خاردار تار لگے ہوئے ہیں۔میاں خان سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھی کو بتاتا ہے۔ دشمن کا ایک مورچہ قریب ہے۔ان کی کھسر پھسر پر اوپر سے ایک گرینیڈ آتا ہے۔میاں خاں زخمی ہو جاتا ہے۔اس طرح اوپر چڑھنے کی یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔اب یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ چونکہ اوپر دشمن کی تعداد تھوڑی ہے اور ویسے بھی قلعے پر پاک فوج کا کنٹرول ہو چکا ہے، اس لئے اوپر چڑھنے کی مزید کوشش نہ کی جائے تاکہ غیر ضروری نقصان سے بچا جا سکے، بالآخر اسلحہ ختم ہو جانے پر دشمن خود بخود قید ہو جائے گا۔ ویسے بھی اگر قلعہ کو چند پونڈ بارود لگا کر اڑا دیا جائے تو اوپر قلعہ بند دشمن بھی برباد ہو سکتا ہے لیکن میجر زاہد یاسین قلعے کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ دیکھنے والوں کو بزبان حال دشمن کی ہزیمت کی داستان سناتا رہے۔قلعہ کو محفوظ رکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پاک فوج کے جوان اپنے زخمیوں کو اکٹھا کر کے اندر محفوظ جگہ پر لے آئے ہیں۔

سر! آپ واقعی قصر ہند سے بول رہے ہیں.....!

میجر زاہد یاسین اپنا وائرلیس سیٹ آہنی گیٹ پر نصب کرتا ہے۔ ذرا وقفے کے بعد سیٹ پر شرر، شرر، گھوں، گھوں کا شور بلند ہوتا ہے۔ اس وقت جے سی پی پر کیپٹن پرویز اقبال رئرلنک وائرلیس پر میجر زاہد سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک اس کے کانوں میں آواز آتی ہے: ''میں میجر زاہد یاسین قصر ہند سے بول رہا ہوں۔''

کیپٹن پرویز اقبال حیران رہ جاتا ہے۔ ''سر ! آپ واقعی قصر ہند سے بول رہے ہیں؟'' میجر زاہد جواب دیتا ہے: ''یقین نہیں آتا تو جرأت کر کے یہاں آؤ..... آنکھوں سے دیکھ لو۔'' پرویز اپنی جیپ قصر ہند کی جانب دوڑاتا ہے۔ قریب پہنچتا ہے تو اسے میجر زاہد کا پیغام ملتا ہے کہ وائرلیس سیٹ کی جیپ پیچھے ہی کھڑی کر دو اور خود پیدل آگے آؤ کیونکہ دشمن قلعے کے اوپر سے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میجر زاہد خود دوڑتا ہوا آتا ہے اور فرط مسرت سے پرویز کو گلے لگا لیتا ہے۔

قصر ہند پر پاک فوج کا قبضہ ہونے کے بعد دشمن نے جھنجھلا کر اس علاقے میں قیامت کا فائر شروع کر دیا ہے۔ زمین کے ایک ایک انچ پر گولے پڑ رہے ہیں۔ بنکر گاؤں کی طرف جانے والے بند پر نائب صوبیدار گل شاہ دوراں کا پلاٹون زخم پر زخم کھا رہا ہے۔ گھبرو جوانوں کی ٹانگیں کٹ رہی ہیں، ہاتھ اڑ رہے ہیں۔ پیٹ چاک ہو رہے ہیں اور سر تن سے جدا ہو رہے ہیں۔ گل شاہ دوراں کے سر میں ایک دہکتا ہوا لوہے کا ٹکڑا دھنس گیا ہے، وہ اف تک نہیں کرتا۔ قریب ہی سپاہی افسر بھی زخموں سے نڈھال ہے مگر حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ گل شاہ دوراں کے سر سے گرم گرم خون ابل کر پیشانی کی طرف بہنے لگتا ہے تو حوالدار میجر محمد اشرف کی نظر پڑتی ہے، وہ اندازے سے پٹی باندھ دیتا ہے لیکن اصل زخم نگارہ جاتا ہے۔

گولہ باری سے کیپٹن پرویز اقبال کا رئیر لنک وائرلیس سیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ وہ اسے ٹھیک کرانے کے لئے پیچھے بریگیڈ کمان پوسٹ پر جاتا ہے۔ وہاں پر موجود تمام اعلیٰ افسروں کے چہروں پر تردد کی لکیریں نمایاں ہیں۔ معرکہ حسینی والا کی یہ انتہائی نازک گھڑیاں ہیں۔

بریگیڈ کمانڈر (اب میجر جنرل) محمد ممتاز خاں (ستارہ جرأت، ہلال جرأت) کیپٹن پرویز کو نیا وائرلیس سیٹ دے کر کہتا ہے:

''اپنے کرنل کے پاس جاؤ اور اسے کسی بھی جانب حملے کے لئے تیار رہنے کا پیغام دو۔ ضرورت پڑنے پر میں خود حملے کا آرڈر دوں گا۔'' کیپٹن پرویز ایک بار پھر محشر شعلہ و شرر میں کود پڑتا ہے۔ وہ خاصی دیر تک اپنے کمانڈنگ آفیسر کرنل حبیب کو تلاش کرتا ہے لیکن بے سود۔ اب وہ قصر ہند کی طرف بڑھتا ہے جہاں اس کی بٹالین کے دو میجر موجود ہیں۔

دشمن نے حسینی والا کے میدان میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ ہم اس دشمن کو بزدل نہیں کہہ سکتے، وہ بڑی بہادری سے اپنے مورچوں میں ڈٹا ہوا ہے۔ دشمن کی یہ مزاحمت ہیڈ ورکس اور اس سے ملحقہ پیری میٹر کے علاقے میں ہے۔ یہیں پر ایک بھرپور اور جچا تلا وار کرنے کے لئے بریگیڈ کمانڈر بالآخر کوڈ ورڈ میں کیپٹن پرویز کے وائرلیس سیٹ پر میجر محمد اشرف کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے پلاٹون کو لے کر ہیڈ ورکس کی جانب بڑھے اور اسے قبضے میں کر لے۔

قصر ہند پر دشمن کا غرور خاک میں ملا دینے کے بعد میجر محمد اشرف نئے احکامات کے تحت ہیڈ ورکس کا رخ کرتا ہے۔ راستے میں وہ دیپالپور نہر کا پل کسی قسم کے فائر کور کے بغیر عبور کرتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ پل باٹا پور کے پل سے دوگنا طویل ہے۔ 65ء میں ہزاروں بھارتی سورما باٹا پور پل عبور کرنے کی کوشش میں کٹ کر رہ گئے لیکن آج پاک فوج کا ایک نوجوان افسر چند جوانوں کے ہمراہ آگ اگلتے ہوئے پیری میٹر کے بالمقابل دیپالپور نہر کا پل بآسانی پار کر لیتا ہے۔ یہ امداد ربانی کا کرشمہ ہے یا کمال جرأت و دلیری کا مظاہرہ ! میجر اشرف کے ساتھ اس وقت صرف پندرہ سولہ جوان ہیں۔ اس محدود نفری کے ساتھ اسے بہت بڑے ہیڈ ورکس کو کنٹرول کرنا ہے۔ دریائے ستلج پر ایک ریگولیٹر، ایک ریلوے لائن کا پل اور ایک سڑک کا پل ہے۔ بائیں طرف دیپالپور نہر کا دہانہ ہے۔ اس پر بھی ریگولیٹر بنا ہوا ہے۔ دائیں طرف نشیب میں بھارتیوں کا وہ دفاعی حلقہ ہے جسے پیری میٹر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میجر اشرف زمینی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے جوانوں کو بلندی پر پوزیشنوں میں بٹھاتا ہے۔ صوبیدار منظور سڑک کے ساتھ دائیں جانب کے مورچوں پر فائر کرتا ہے۔ ہیڈ ورکس کے منہ پر ایک سنتری پوسٹ میں سپاہی رمضان راکٹ لانچر کے ساتھ چاق و چوبند کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی پیری میٹر میں اترنے والی سیڑھیوں کے ساتھ ایک سپاہی برین گن نصب کر دیتا ہے۔ چند جوان دیپالپور نہر کے ریگولیٹر پر پوزیشن لے لیتے ہیں۔ اس طرح رات بھر دشمن کے فرار کا راستہ بند رکھا جاتا ہے۔

معرکہ در معرکہ.....

اگلے دن بھارتی فوجی پیری میٹر سے بھاگ کر دریا میں کودنے کی کوشش کرتے ہیں تو میجر اشرف کے جوان فائر کر کے انہیں دریا کی لہروں میں ڈبو دیتے ہیں۔ایک موقع پر میجر اشرف سنتری پوسٹ کے قریب کوارٹر گارڈ کے کمرے کے ساتھ ٹیک لگا کر دریا پار نظریں جمائے ہوئے ہے۔اچانک اسے اپنے عقب میں کسی نقل وحرکت کا احساس ہوتا ہے۔وہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھتا ہے تو ایک سپاہی رائفل تانے اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔میجر اشرف پہلے تو سمجھتا ہے کہ شاید اپنا ہی کوئی جوان ہے لیکن اس کے ہاتھ میں تنی ہوئی رائفل دیکھ کر کچھ شبہ ہوتا ہے اور پوچھتا ہے:''کون ہے؟'' جواب میں وہ بھی پوچھتا ہے:''تم کون ہو؟'' دراصل وہ بھارتی فوجی ہے، دن کی روشنی ہونے کے باوجود میجر اشرف اسے اس بنا پر پہچاننے میں ناکام رہا ہے کہ اس کے پاس چشمہ نہیں ہے۔اس اثناء میں بھارتی فوجی سنگین کی نوک اس کے کندھے پر رکھ کر کہتا ہے: ''ہینڈز اپ''۔میجر اشرف پھرتی سے رائفل دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا ہے۔ بھارتی، رائفل چھڑانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ کوئی تدبیر ممکن نہیں تو رائفل چھوڑ کر دریا کے پل پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔اپنا ایک جوان سٹین گن کا برسٹ فائر کرتا ہے۔دشمن کی لاش تڑپتی ہوئی دریا کی نذر ہو جاتی ہے۔میجر اشرف ابھی ادھر سے فارغ ہوا ہے کہ انڈین ائرفورس کے ایس۔یو 7 طیارے حملہ کر دیتے ہیں۔میجر اشرف ایک مشین گن کا رخ اوپر کی طرف کر دیتا ہے۔ بھارتی طیارے زور وشور سے راکٹ برسا رہے ہیں لیکن ذرا بلندی سے۔مشین گن کا ایمونیشن ختم ہو جاتا ہے تو میجر اشرف ایک رائفل سے حملہ آور طیاروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اسی دوران میں ایک راکٹ عین اس کے قریب پھٹتا ہے۔سات لال انگارہ ٹکڑے اس کے جسم میں دھنس جاتے ہیں اور یوں رات بھر اور دن کے گیارہ بجے تک عزم وہمت کے انمول اور غیر فانی جوہر دکھانے والا یہ نوجوان افسر تیورا کر گر پڑتا ہے۔اس کے بے مثال کارنامے آئندہ نسل کے لئے قندیل رہگذر ثابت ہوں گے اور تاریخ اس کی لازوال جرأت واستقامت پر ہمیشہ نازاں رہے گی۔

دوسری طرف قصر ہند پر میجر زاہد اور بھارتیوں کے درمیان رات بھر آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔علی الصبح بریگیڈ کمانڈر ایم ممتاز پیدل چل کر وہاں آتا ہے اور عظیم کارنامہ سرانجام دینے پر میجر زاہد کو شاباش دیتا ہے۔

بریگیڈئر ممتاز چلتے وقت میجر زاہد کو حکم دیتا ہے کہ وہ بنکر گاؤں سے بھی دشمن کو مار بھگائے۔ بعد ازاں بریگیڈ ئیر نہر کے پل پر پہنچتا ہے اور ٹینک فائر سے قصر ہند کے اوپر موجود دشمن کی طاقت ختم کرا دیتا ہے۔ اس اثناء میں میجر زاہد اپنے جوانوں کی تنظیم نو کرتا ہے۔ اس کے پاس بمشکل ڈیڑھ پلاٹون کی نفری موجود ہے۔ پہلے وہ زخمیوں اور شہیدوں کو عقب میں بھجواتا ہے..... ڈرائیور نائیک سلیم اور ڈرائیور علی حیدر دشمن کی گولہ باری اور ہوائی حملوں سے بے نیاز ہو کر اپنے زخمی ساتھیوں کو ایڈوانس ڈریسنگ سٹیشن میں پہنچاتے ہیں۔ سپاہی (اب لانس نائیک) صوفی محمد نواز بھی انتہائی بے خوفی کے ساتھ اس کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔

میجر زاہد یاسین اپنے باقی ماندہ جوانوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک حصے کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور دوسرا حصہ حوالدار میجر اشرف کی قیادت میں دے دیتا ہے۔ میجر زاہد یاسین بند کے دائیں طرف اور حوالدار میجر اشرف بند کے بائیں طرف دشمن کے مورچوں پر ہلہ بولتے ہوئے بنکر گاؤں کا رخ کرتے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ پیچھے سے ایک سکھ صوبیدار سردار سنگھ میجر زاہد پر گرینیڈ پھینکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے جوان اس پر بروقت قابو پا لیتے ہیں۔ بنکر گاؤں بند کے عین اوپر ہے۔ اس میں کنکریٹ کے بنکر بنے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں دشمن نے مکانوں کی چھتوں پر بھی پوزیشن لے رکھی ہے۔ سپاہی نذیر سب سے آگے ہے اور دشمن پر زور و شور سے حملے کر رہا ہے۔ اس کارروائی میں وہ سخت زخمی ہو جاتا ہے اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔

بنکر گاؤں میں دشمن زبردست مزاحمت کرتا ہے لیکن پاک فوج کی ضرب غازیانہ اسے جلد ہی کچل کے رکھ دیتی ہے۔ یہاں سے میجر زاہد ہاکی سپر کی طرف یلغار کرتا ہے لیکن مقابلے کی نوبت نہیں آتی۔ دشمن اپنی دوسری فورس کا حشر دیکھ کر فرار ہو گیا ہے۔

میجر زاہد کی کمپنی اگلی رات بھی اسی علاقے کے دفاع پر لگی رہتی ہے۔ 5/دسمبر کو انہیں پیچھے ہٹا لیا جاتا ہے لیکن ابھی یہ لوگ اچھی طرح اپنے زخموں کو دھو کر پٹیاں بھی نہیں کر سکے کہ انہیں سبجرہ کی طرف دشمن کے حملے کو روکنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ کسی کے پاس رائفل ہے تو ایمونیشن نہیں۔ نہ مشین گنیں پوری ہیں، وردیاں پھٹی ہوئی ہیں اور دو تین دن کی متواتر لڑائی کی وجہ سے دماغ پر بوجھ ہے، آنکھیں دھوئیں اور بارود کی وجہ سے سوجی ہوئی ہیں لیکن بلوچ رجمنٹ کے سربکف مجاہد ایک بار پھر آزمائش میں پورے اترے ہیں۔ دشمن نے غرور میں آ کر ٹینکوں کی مدد سے چڑھائی کر دی ہے اور وہ پاکستان کی اگلی چوکیوں کو

روندتا ہوادس بارہ دیہات پر قبضہ کر چکا ہے.....مگر جونہی ان کا سامنا بلوچ رجمنٹ کے ان زخم خوردہ جوانوں سے ہوتا ہے، اس کے قدم رک جاتے ہیں۔ دشمن روہی نالہ عبور کر کے گنڈا سنگھ والا کی طرف پاک فوج کو عقب سے کاٹتا ہوا قصور پہنچنے کا خواب دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

کرنل حبیب کی بلوچ رجمنٹ عظیم الشان قربانیاں دے کر اس کامرانی سے ہم کنار ہوئی ہے۔ انتہائی نامساعد حالات میں صرف تین کمپنیوں کی نفری کے ساتھ بھارت کے پورے بریگیڈ کو تہس نہس کر کے رکھ دینا بادی النظر میں ناممکن دکھائی دیتا ہے لیکن اس رجمنٹ کے جری افسروں اور دلیر جوانوں نے اپنے خون کی قربانی دے کر اس ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا۔ بلوچ رجمنٹ کے اس مرکزی حملے کے ساتھ ساتھ پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین نے لیفٹیننٹ کرنل غلام حسین چودھری شہید (ہلال جرأت) کی رہنمائی میں دشمن کا مایہ ناز دفاعی حلقہ پیری میٹر توڑ ڈالا ہے اور اس طرح حسینی والا کے علاقے میں پاک فوج مکمل طور پر قابض ہو جاتی ہے۔

توپ خانے کی فصیل

فیروز پور کے محاذ پر داد شجاعت دینے والوں کی تفصیلات قاری کے سامنے آ گئی ہیں لیکن یہ کہانی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس عظیم کامیابی کے حصول کو ممکن بنانے والے توپ خانے کے کردار کو واضح نہ کیا جائے۔ 3/دسمبر کی سہ پہر کو صفر ساعت پر ہمارے پیدل دستوں کے حرکت میں آنے کے ساتھ ہی دشمن کی سرزمین پر ہمارے آرٹلری بریگیڈ نے ایک ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے جس کے سامنے دشمن کے لئے اپنے مضبوط مورچوں، دمدموں سے سر باہر نکالنا ممکن نہیں رہا۔ توپ خانے کے فارورڈ آبزرویشن آفیسرز ہمارے پیدل دستوں کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے ایک طرف ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے کے لئے توپ خانے کی رہنمائی کر رہے ہیں، اور دوسری طرف وہ دست بدست جنگ میں بھی داد شجاعت دے رہے ہیں، رات کی تاریکی میں نشانے پر فائر مانگنا اپنی جگہ پر ایک مشکل کام ہے تو دوسری طرف دشمن سے دو بدو مقابلہ بھی کرنا ہمارے توپ خانے کے آبزرویشن آفیسروں کے لئے مشکل نہیں۔ دیپالپور نہر، فیروز پور روڈ، قصر ہند، اولیکے پوسٹ پر پاک افواج کے حملوں کے ساتھ ساتھ بریگیڈ آرٹلری کے جوانوں اور افسروں

نے بھی داد شجاعت دیتے ہوئے شہادت کا مرتبہ حاصل کیا ہے، اسلامی جہاد کی روح سے سرشار اللہ کے یہ سپاہی جرأت وعزیمت کی تاریخ اپنے خون سے لکھ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر اس جذبہ جہاد کو کوٹ کوٹ کر بھرنے کا سہرا آرٹلری کے کمانڈر بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن کے سر ہے۔ بریگیڈیئر اختر نے فیروز پور پر حملے کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے اپنا توپ خانہ اس طرح ڈیپلائے کیا ہے کہ حرب وضرب اور سٹرٹیجی کی تمام کتابیں بند کر دی گئی ہیں اور مر مٹنے کے جذبے سے سرشار ہو کر توپ خانے کو دشمن کے عین سر پر نصب کیا گیا ہے۔ کسی بھی صورتحال میں توپ خانے کی اس طرح کی ڈیپلائے منٹ خودکشی بھی تصور کی جاسکتی ہے، لیکن بریگیڈیئر اختر آخری چانس لینے کے عادی ہیں اور ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ پیدل افواج کی تیز رفتار پیش قدمی کی صورت میں وہ اپنے دستوں کو نہ صرف مکمل فائر کور دیں بلکہ دریائے ستلج کے پار دشمن کی سپلائی لائن کو بھی کاٹ کر رکھ دیں۔ اس مقصد کے لئے ان کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے بھاری اور میڈیم توپ خانے کو سرحد سے قریب تر نصب کریں تا کہ وہ اپنے معین مقاصد کے حصول میں کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ اس حکمت عملی کا مظاہرہ وہی افسر کر سکتا ہے جو طارق بن زیاد کی طرح کشتیاں جلانے کے جنون سے آشنا ہو۔ بریگیڈیئر اختر نے قرون اولی کے مسلمان جرنیلوں کی کامیاب حکمت عملی کی یاد تازہ کر دی ہے اور اس کی زیر کمان بریگیڈ آرٹلری نے فیروز پور کے محاذ پر گولہ باری کر کے ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے جس کے سامنے دشمن بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہم یہ ادھار چکائیں گے۔۔۔!

یہ 16 / دسمبر کی سہ پہر ہے۔ بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن صبح سے اب تک اپنے مورچے سے باہر نہیں نکلے، ان کے سٹاف افسر سمجھتے ہیں کہ شاید بریگیڈیئر صاحب آرام کر رہے ہیں لیکن سہ پہر تک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سٹاف میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے کہ خدا خیر کرے۔ میجر اعجاز قاضی ان کے مورچے کی طرف جاتے ہیں لیکن وہ مورچے کے دروازے پر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں، اندر سے بلک بلک کر رونے کی آواز آرہی ہے، میجر قاضی کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہوا کیا ہے! وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر بریگیڈیئر صاحب کو سلوٹ کرتے ہیں لیکن جواب میں بریگیڈیئر اختر، میجر قاضی سے لپٹ جاتے ہیں، آنسو ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے۔ بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن رندھی ہوئی آواز میں کہتے ہیں..... پاکستان دولخت ہو گیا،

جی او سی میجر جنرل عبدالمجید ملک کی الوداعی ضیافت میں بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن بھی موجود ہیں اور جنرل ملک بڑے توصیفی کلمات کے ساتھ بریگیڈیئر اختر کا میرے ساتھ تعارف کراتے ہیں۔ ضیافت ختم ہوتی ہے تو بریگیڈیئر اختر مجھے اپنی جیپ میں بٹھا کر بریگیڈ آرٹلری ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں۔

فیروز پور کے معرکے کی تفصیلات سناتے ہوئے ان کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے، ان کے تنے ہوئے ماتھے سے ایک غازی کا نور جھلک رہا ہے، بریگیڈیئر اختر کہتے ہیں: ''ہمیں ایک کمینے دشمن سے پالا پڑا ہے جو ہمارے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں اور ستم یہ ہے کہ وہ ہمارے خلاف جارحیت میں تنہا نہیں، ایک سپر طاقت سوویت روس پوری طرح اس کی پشت پر ہے اور پاکستان کو ایک اسلامی ملک ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔'' بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ روس بھارت کے ذریعے پاکستان کے خلاف پراکسی جنگ لڑ رہا ہے لیکن اس محاذ پر ہم اپنے اصل دشمن سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکتے، مزا تب آئے گا جب اس دشمن سے براہ راست مقابلہ ہوگا۔ میں سراپا سوال بن جاتا ہوں کہ ہم اور سوویٹ روس، دونوں کے درمیان کیا مقابلہ؟ بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن میرے تعجب کو بھانپ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر خلا میں گھورتے ہیں، پھر بڑے دو ٹوک لہجے میں کہتے ہیں جیسے وہ نوشتہ دیوار پڑھ رہے ہوں..... روس سے مقابلہ ہوگا، روس پاکستان سے ٹکرائے گا، روس کے عزائم کسی سے ڈھکے چھپے نہیں، وہ گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا ہے، روسی زاروں سے لے کر کریملن کے نئے اشتراکی زاروں تک کی خواہش یہی رہی ہے کہ وہ بحیرہ عرب تک رسائی حاصل کریں۔ ان کے لئے شارٹ کٹ افغانستان ہے اور جلد یا بدیر سوویت روس اپنی فوجیں افغانستان میں داخل کرے گا اور یہیں پر وہ ایک ایسی جنگ میں پھنس کر رہ جائے گا کہ روس کے لئے اپنی تمام تر ایٹمی اور فوجی قوت کے باوصف اپنا وجود تک برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

بریگیڈیئر اختر جوش جذبات میں مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں، میرا ہاتھ ان کی گرفت میں ہے، جوش ایمانی کی حرارت میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ بریگیڈیئر اختر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے کے انداز میں کہتے ہیں کہ بھارت نے روس کی شہ پر مشرقی پاکستان ہتھیا لیا ہے لیکن ہم اس شکست کا بدلہ لیں گے اور براہ راست روس سے ادھار چکائیں گے..... ادھار چکائیں گے..... ادھار چکائیں گے، بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن مسلسل بڑبڑا رہے ہیں.....ہم یہ ادھار چکائیں گے۔۔۔۔۔

میرا چاند طلوع نہیں ہوا، غروب ہو گیا

میں ہر روز ایک نئی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہوں، میں سرگرداں ہوں، حیران و پریشان ہوں، سراسیمہ ہوں۔ ایک لمحے کے لئے سوچتا ہوں تو میں انہیں شہید کہتا ہوں، شہید مانتا ہوں، اور میرا ایمان ہے کہ شہید زندہ ہیں مگر ہم اس زندگی کا ادراک نہیں رکھتے۔

دوسرا لمحہ ایسا آتا ہے کہ میں چکرا کر رہ جاتا ہوں، میں چشم تصور میں ان کے گھر کی اسٹڈی کو خالی پاتا ہوں، میں ان کے عام نشست کے برآمدے میں انہیں دیکھنے سے قاصر رہتا ہوں اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ آج میں اگر ان کے گھر عید ملنے جاؤں تو وہ اپنے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما نہیں ہوں گے جہاں وہ ہر عید کے روز ہوتے ہیں، یہ پہلی عید ہے کہ ڈرائنگ روم سونا پڑا ہوگا۔

مگر پھر ایک اور کیفیت میرے قلب و ذہن کا احاطہ کر لیتی ہے۔ یہ پہلا دن ہے جب میں ان کے گھر میں داخل نہیں ہو سکا، ورنہ ہمیشہ اس گھر کے دروازے پر مجھے دیکھتے ہی عبدالستار مجھے اندر لے جاتا رہا ہے، مگر آج یہاں عالم ہی دوسرا ہے، میں جس گھر کا قریب قریب گیارہ بارہ برس تک ایک فرد رہا ہوں، یکا یک یہاں اجنبی ٹھہرا۔ میں پچھلے برس ایک طویل عرصے کے بعد سرِ شام اس گھر میں گیا تھا، اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا، انہوں نے دوبارہ پہلے جیسی محبت اور شفقت کے ساتھ مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ وہ ایک گھنے چھتنار درخت کی مانند تھے جو تاریخ کی راہ پر چلنے والے قافلوں کو اپنی خنک چھاؤں کی رحمتوں میں لپیٹ لیتا ہے۔

میں اپنی نصف صدی کے طویل صحافتی کیریئر کے اس مرحلے پر بھرپور آزادی کو انجوائے کرنا چاہتا تھا، میں برسوں بھٹکتا پھرا مگر آخر کار اس ٹھنڈے اور میٹھے سرچشمے کے کنارے آن لگا، میں اس چشمے سے پوری طرح فیض یاب ہونا چاہتا تھا۔ مجھے ایک چھاتہ چاہئے تھا، ایک مضبوط سہارا چاہیے تھا، اور مجھے وہ کلہ مل گیا جس کے

بل بوتے پر میں اپنے ضمیر کے مطابق اظہار کر سکتا تھا۔

میں نے اس کلے کے سہارے بہت مستی دکھائی، میں نے ان کی حق گوئی کی روش کو اپنایا، میں نے سچ بولنا شروع کیا، اور بولتا چلا گیا، میں جانتا تھا کہ وہ صاف گوئی کو پسند کرتے ہیں، انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی، میں ان کی حدود و قیود کو سمجھتا تھا۔ اس لئے مجھے کبھی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

میرا راستہ اب بھی یہی ہے کہ یہ ان کا راستہ ہے جو میرے مربی اور مہربان تھے۔ انہوں نے میرے راستوں کو اجالا تھا، میں ان راستوں سے کیسے بھٹک سکتا ہوں۔ میں ان راستوں کو کیسے ترک کر سکتا ہوں۔

میں ہی نہیں، نوائے وقت میں لکھنے ولا کوئی بھی ساتھی ان کی آئیڈیالوجی کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی تو ہمارے ایمان کا حصہ بن چکی۔ یہی ہمارا بدن ہے، یہی ہماری غذا ہے، یہی ہمارا لباس ہے، یہی ہماری روح ہے، یہی ہماری حیات ہے۔

یہ نظریہ حمید نظامی نے دیا اور جناب مجید نظامی نے اس کو پروان چڑھایا۔ یہ نظریہ پاکستان ہے۔ ہمیں بھی اسی کی آبیاری کرنی ہے، ہر لمحے کرنی ہے، ہر سانس کے ساتھ کرنی ہے، ہر چیلنج کے سامنے کرنی ہے۔

میں اپنی بات دہراتا ہوں کہ نوائے وقت کے بانی اول حمید نظامی فوجی آمریت کے ہاتھوں شہید ہوئے اور نوائے وقت کے بانی ثانی اور حقیقی معنوں میں اس کے معمار، مجید نظامی سول آمریت کے ہاتھوں شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

ان کی تقلید میں میرے قلم کے ہونٹوں پر بھی ایک ہی نعرہ ہے کہ میں پھر جلایا جاؤں، میں پھر شہید ہوں، میں پھر جلایا جاؤں، میں پھر شہید ہوں، پھر شہید ہوں، پھر شہید ہوں، ہم شہادتوں کی کہکشائیں سجا دیں گے مگر حق و صداقت کی آواز بلند کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ تو جبر آزما، ہم جگر آزمائیں۔

بزدل اپنی موت سے پہلے بار بار مرتا ہے، اور بہادر صرف ایک بار۔ پیدائش کا لمحہ ہی دراصل موت کی طرف پہلا قدم ہے۔ کہتے ہیں کہ زندگی محض ایک خواب کا نام ہے، موت اس خواب کی خوشنما تعبیر ہے۔ کوئی موت کو ایک حقیقی مہم جوئی خیال کرتا ہے۔ زندگی نے موت سے سوال کیا کہ لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور تم سے نفرت؟ موت کا جواب تھا کہ لوگ تمہاری خوبصورتی پر فریفتہ ہیں مگر میں ایک دردناک اور تلخ حقیقت، اس لئے مجھ سے خائف رہتے ہیں۔ کسی نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں موت کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، مگر ہر کوئی اس ہنر سے آشنا نہیں۔ سیانے کہتے ہیں موت سے نہ ڈرو، اس زندگی سے ڈرو جو تم گزار

نہیں رہے، تم نے ہمیشہ زندہ نہیں رہنا، زندگی گزارنے کا موقع صرف ایک بار ملتا ہے۔

یاد رکھئے ایک انسان مر سکتا ہے، ایک قوم عروج و زوال کا شکار ہو سکتی ہے مگر ایک نظریئے کو موت نہیں آ سکتی۔ اور یہ نظریہ زندہ ہے۔ مجید نظامی کا دیا ہوا نظریہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ پاکستان کی شکل میں زندہ رہے گا، یہ آزادی کشمیر کی آرزو کی شکل میں زندہ رہے گا، یہ حق و انصاف کے لہلہاتے پرچم کی شکل میں زندہ رہے گا، یہ بھارت کی غلامی کے سامنے ڈٹ جانے کی شکل میں زندہ رہے گا۔ یہ نظریہ اقبال کے افکار اور قائد کے کردار کی صورت میں زندہ رہے گا۔

میں کن خوابوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں کیوں ان ساعتوں کو بھول گیا جب ستائیسویں کی شب کے آخری لمحات میں میرے فون پر پہلا میسج آیا تھا کہ عظیم ہستی اس دنیا میں نہیں رہی، ایک میسج میں صرف انا للہ وانا الیہ راجعون لکھا تھا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا، میں نے آسمانوں کی طرف دیکھا، فرش سے عرش تک نور کا ہالہ تھا اور قطار اندر قطار نورانی فرشتے جو استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ شرق و غرب پر محیط کہکشائیں کسی کے لئے چشم براہ نظر آئیں۔ یہ نزول قرآن کی رات تھی، خالق کائنات کی رحمت اپنے جوش پر تھی۔ جب اللہ کے آخری نبی ﷺ پر آخری کتاب، ایک ایک آیت کی شکل میں ظہور پذیر ہو رہی تھی، اور ایسی ہی مبارک ساعت میں ایک روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جناب مجید نظامی اپنے رب سے جا ملے تھے اور اس روشن کائنات کا حصہ بن گئے تھے جو انسانیت کی راہیں اجالتی ہے اور منزلوں کا پتہ دیتی ہے۔

میں ایک عالم سرمستی میں یہ سطور لکھے جا رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کچھ دیر میں رمضان المبارک کا یہ انتیسواں دن بھی تمام ہو جائے گا، اور روزے دار مغربی افق پر نئے چاند کو طلوع ہوتے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ مگر میں کس چاند کو تلاش کروں، میرا چاند تو غروب ہو گیا۔

ان سطور کی اشاعت کے ساتھ آپ عید منا رہے ہوں گے، آپ کو یہ عید بہت بہت مبارک ہو مگر ہے کوئی مجھے پرسہ دینے والا۔ اللہ کے نبی ﷺ جنگ احد کے زخم خوردہ، اپنے حجرے میں تشریف لائے تو پکار اٹھے کہ کوئی ہے جو میرے بہادر چچا حضرت امیر حمزہؓ کی شہادت کا پرسہ دے، وہ غم کی شدت سے نڈھال تھے۔

میں بھی غم کی شدت سے نڈھال ہوں۔ کوئی ہے جو میرے بہادر سپاہ سالار کی موت پر مجھے پرسہ دینے آئے۔

میں اپنے غم گساروں کا انتظار کروں گا۔ (29 جولائی 2014ء)

زندہ و تابندہ شہید صحافت

مجید نظامی بھی شہادت کے درجے پر سرفراز ہوئے۔ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

ان کے بڑے بھائی حمید نظامی نے فوجی آمریت کی گھٹن کا شکار ہو کر شہادت کو چوما۔

مجید نظامی سول آمریت کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔

وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ واہگہ بارڈر چوبیس گھنٹے کھلا رہے، وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ بھارت کشمیر کے سارے دریاؤں کا پانی بند کر کے پاکستان کو بنجر صحراؤں میں تبدیل کر دے اور ایسے ملک کے ساتھ، سول حکومت یورپی یونین کی طرح اپنی سرحدوں کو آزادانہ کھول دے، ان کے سامنے یہ تماشہ بھی لگا رہا کہ دہشت گردوں کے ساتھ مذاکرات کا ڈرامہ رچایا گیا تا کہ انہیں صف بندی کے لئے وقت مل جائے اور وہ قوم کو لہولہان کرنے کے لئے اسلحے کا ڈھیر لگا لیں۔ یہ سب کچھ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ ان کا دل جھٹکے پہ جھٹکے سہہ رہا تھا مگر ہر دل کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور جب اپنے ہی درپے آزار ہو جائیں تو پھر دکھ شدید اور ناقابل علاج ہو جاتا ہے مگر وہ اپنی زندگی کے اس معرکے میں جانفشانی سے لڑے اور آخر انہوں نے شیر میسور کی طرح جان قربان کر دی۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہید ہو گئے، زندہ و تابندہ ہو گئے۔

فوجی آمریت کے بعد جمہوری آمریت نے ایک اور بطل حریت کی جان لے لی۔

ایک نکتہ میرے ذہن کو سب سے الگ سوجھا ہے۔ وہ بہادر تو بے شک تھے، حق گو بھی بے مثل تھے، نڈر اور بے خوف ہو کر کلمہ حق کہنا ان کا شعار تھا، وہ کسی کے سامنے جھکے نہیں، کسی کے ہاتھ بکے نہیں۔ انہوں نے ہر قسم کے چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر آپ میں سے کسی نے محسوس نہیں کیا کہ انہوں نے دم آخر بھی اپنے ان حاسدوں اور سازشیوں کو شکست فاش دے دی جنہوں نے ان کی زندگی میں ان کی وفات کی خبریں تمام ٹی

وی چینلز پر چلوادی تھیں۔اور سارے شہر میں مشہور کر دیا تھا کہ ان کی کلینیکل موت واقع ہو چکی ہے، ٹھیک ہے ان کا بلڈ پریشر پچاس اور تیس کی حد تک گر چکا تھا، ٹھیک ہے کہ وینٹی لیٹر کے دباؤ سے انکے پھیپھڑوں سے خون رس رہا تھا مگر وہ شخص جس نے کبھی ہار نہیں مانی تھی، اس نے ان سازشیوں کے سامنے بھی ہار قبول نہیں کی جوان کی موت کی افواہیں پھیلا کر اپنی جھوٹی اناؤں کی تسکین کا ساماں کر رہے تھے۔اور ان کے زندہ ہوتے ہوئے ان کی صحت کے بارے میں جھوٹے بلیٹن جاری کر رہے تھے۔

بہادر انسان نے آنکھیں کھولیں، ان کا بلڈ پریشر پھر سے بحال ہو گیا، ان کی نبض نارمل ہو گئی اور وہ انتہائی سکون سے ملنے والوں سے باتیں کرنے لگے۔اور اگلے دو دن وہ ہشاش بشاش دکھائی دیئے۔

اور کیا سازشیں ختم ہو گئی ہیں۔ابھی تو انہیں لحد میں اتارا گیا تھا، ابھی تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ باتیں شروع ہو گئیں کہ اب نوائے وقت کا کیا بنے گا، ایک ٹی وی چینل پر کسی نے میرے سامنے یہی سوال اٹھایا اور میں نے کہا کہ اگر آپ نوائے وقت کے محض رپورٹر ہو کر ایک کامیاب اخبار نکال سکتے ہیں تو رمیزہ مجید نظامی برسوں سے مجید نظامی سے تربیت پا کر صیقل ہو چکی ہیں، انکی صلاحیتوں پہ اعتماد کیوں نہیں کرتے۔میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر گواہی دیتا ہوں کہ مجھے نظامی صاحب نے چند ماہ قبل بتایا تھا کہ رمیزہ بیٹی کی محنت اور لگن سے وقت نیوز اب منافع میں آ گیا ہے، انہوں نے کروڑوں کے منافع کی بات کی تھی۔کتنے ٹی وی چینل اور ہیں جن کے مالک اطمینان کا اظہار کر سکتے ہیں، ہر کوئی روتا دکھائی دیتا ہے۔

میں ایک اور غلط فہمی رفع کر دوں۔نوائے وقت پہلے بھی ایسے ہاتھوں میں رہ چکا ہے جو اسے پھر چلانے کے شوق میں مبتلا ہیں مگر وہ پہلے بھی اسے نہیں چلا سکے اور اسی وجہ سے مجید صاحب کو واپس نوائے وقت آنا پڑا تھا اور پھر اس اخبار نے اپنے مدمقابل تمام اخبارات کا مقابلہ کیا اور اپنا لوہا منوایا۔اور اب ساری دنیا نے دیکھا کہ کہ جن لوگوں نے نوائے وقت سے علیحدگی اختیار کی، وہ ایک بار پھر اپنا اخبار چلانے میں ناکام رہے، مجھے اس پر خوشی نہیں ہے، نہ میں یہ بات طعنے کے طور پر کہہ رہا ہوں مگر یہ ایسا تجزیہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

نوائے وقت کی کامیابی کا راز اس نظریئے میں مضمر ہے، جس کا اس نے شروع سے علم بلند کئے رکھا ہے۔نوائے وقت تب بھی ایک مؤثر اخبار تھا جب حمید نظامی نے اسے نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا اور مجید نظامی کی ادارت میں بھی اس کی کامیابی کا راز یہی نظریہ تھا، یہ نظریہ پاکستان ہے، جس پر پاکستان معرض وجود میں آیا۔

یہ ایک مقصد حیات ہے، یہ ایک مشن ہے، یہ ایک جنون ہے جو اس اخبار کے ایڈیٹر کو ہی نہیں، میرے جیسے عام کارکن کو بھی جابر حکمرانوں کے سامنے تن کر کھڑا ہونے کی قوت عطا کرتا ہے۔ ایسا ایڈیٹر خبر چھاپتا ہے، چھپاتا نہیں، اخبار بیچتا ہے، ضمیر نہیں بیچتا، اشتہاروں کی بھیک نہیں مانگتا، نوائے وقت میں اشتہار دینا ایک عبادت ہے، کوئی حکومت اشتہار روک کر اس نیکی سے محروم رہنا چاہتی ہے تو یہ اس کی ناحاصلی ہے۔

حمید نظامی اور مجید نظامی نے نوائے وقت کو اخبار بنایا، اشتہار نہیں بنایا۔ نوائے وقت کا مشن نظریہ پاکستان کو فروغ دینا ہے، اسے سربلند رکھنا ہے۔ اس مشن نے نوائے وقت کو نوائے وقت بنایا اور یہی مشن، نوائے وقت کے کامیاب مستقبل کی ضمانت بھی ہے۔

مجید نظامی اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر سازشیوں کا دباؤ برقرار ہے۔ یہ سازشی گھر کے بھیدی ہیں اور لنکا ڈھانا چاہتے ہیں۔ یہ مجید نظامی کی روح کو تڑپا رہے ہیں، اس پر دباؤ ڈال رہے ہیں، یہ لوگ انہیں قبر میں بھی چین نہیں لینے دیتے۔ مگر خاطر جمع رکھئے، مجید نظامی نے صرف پردہ کیا ہے، وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ اور تابندہ ہیں، شہید مرتے نہیں، وہ ابدالآباد تک زندہ رہتے ہیں، اور مجید نظامی تو ایک نظریئے کا نام ہیں، وہ تو ہمارے ایمان کا حصہ ہیں۔ کس میں طاقت ہے کہ مجید نظامی کے نظریئے کو شکست دے سکے۔ یہ نظریہ اور نوائے وقت لازم و ملزوم ہیں۔ کون ہے جو ہمارے ایمان کو متزلزل کر سکے۔

کہتے ہیں کہ پاکستان اسی روز وجود میں آ گیا تھا جب برصغیر میں پہلے مسلمان نے قدم رکھا تھا اور پاکستان اس وقت تک قائم دوائم رہے گا جب تک ایک بھی مسلمان باقی ہے، اسی طرح جب تک اس سرزمین پر ایک بھی نوائے وقتیا زندہ ہے، یہ نظریہ بھی زندہ ہے، مجید نظامی بھی زندہ و تابندہ ہیں۔ وہ شہید صحافت کے طور پر امر ہیں۔ (28 جولائی 2014ء)

ڈاکٹر مجید نظامی سے میں نے کیا سیکھا

میں آج ایک عجیب بات کرنے لگا ہوں۔ بلکہ باتیں پرانی ہیں، میں نے ان کا نتیجہ اپنے انداز سے نکالا ہے اور نئے حالات کے پیش نظر نکالا ہے۔

میں پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں ڈاکٹر مجید نظامی سے پہلی بار 1970 میں پرانی انارکلی میں ان کے روزنامے ندائے ملت کے دفتر میں ملا۔ ان دنوں میں ہفت روزہ زندگی میں کام کر رہا تھا، ہمیں ان پر ایک ٹائٹل سٹوری شائع کرنا تھی اور میں ان کا پورٹریٹ لینے گیا تھا۔ بعد میں، میں نے ان کے زیر سایہ نوائے وقت کے میگزین ایڈیٹر اور پھر ڈپٹی ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ آخری دس برسوں میں انتہائی قریب سے ان کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ میں ان کو گھر میں علی الصبح ملتا رہا اور ایسے لمحات بھی آئے کہ مجھے ان سے یہی صبح کی میٹنگ کارڈیالوجی ہسپتال کی راہداری میں بچھائے ایک ہنگامی بستر پر کرنا پڑتی تھی۔ میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ یک گونہ طمانیت کی کہکشاں دمکتی دیکھی۔

میری ان کی رفاقت کی کہانی پینتالیس برس پر پھیلی ہوئی ہے۔

تو پہلے میں آپ کو یہ کیوں نہ تو بتا دوں کہ وہ کیا خاص بات ہے جو میں نے ان سے سیکھی اور جس کا کسی اور نے ابھی تک کسی بھی انداز میں اظہار نہیں کیا۔

انسان کو اپنے مقصد حیات کے حصول کے لئے زندہ رہنا چاہیے۔

یہ ہے وہ سبق جو میں نے ان سے سیکھا اور یہ مجھ پر الہام نہیں ہوا، اس کا ذکر انہوں نے اپنی سالگرہ کی آخری تقریب میں خود کیا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ڈاکٹر مجید نظامی نے فرمایا تھا کہ ان کی ایک خواہش ہے کہ ان کی زندگی میں کشمیر کو آزادی مل جائے۔ یہ ایک بہت بڑا نصب العین ہے جس کے حصول کے لئے انہوں نے چھیاسی برس تک

انتظار کیا۔

اگر ہر کسی کے سامنے ایک عظیم نصب العین ہو، تو اس کے حصول تک اسے جینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ سر پھوڑنا ہو تو راہ چلتے آپ کسی سے بھی ٹکرا جائیں۔ لیکن اس طرح آپ اپنی زندگی کا نصب العین تو حاصل نہیں کر پائیں گے۔

ڈاکٹر مجید نظامی کو جو اخبار ملا، اس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا ہے۔ ان کے بڑے بھائی یہی کلمہ جہاد بلند کرتے رہے مگر وہ زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔ چھوٹے بھائی کو کلمہ حق بھی بلند کرنا تھا اور زندہ بھی رہنا تھا۔ اور انہوں نے دونوں کام کر دکھائے۔ کونسا کلمہ حق ہے جو انہوں نے بلند نہیں کیا اور جابر اور ظالم سلطان کے سامنے نہیں کہا۔ ایوب خان کے سامنے انہوں نے مادر ملت کا ساتھ دیا۔ ان سے کہا گیا کہ محترمہ سے یہ خطاب واپس لیں مگر وہ ایوب کے سامنے ڈٹ گئے۔ بھٹو نے جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد شروع کی تو وہ انگلی تھامے ان کو لے کر چلے مگر وہ اقتدار میں بدمست ہوا تو انہوں نے کلمہ حق کہنے کی راہ اپنائی۔ ضیاالحق نے لاہور کے ایک فنکشن میں کہا کہ کچھ لوگوں کے سر میں جمہوریت کا کیڑا ہے تو وہ اسٹیج پر آگے بڑھے اور اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ، یہ کیڑا اس سر میں بھی ہے۔ ضیا ہی کے دور میں محمد رفیق ڈوگر کی فائل کردہ خبر پر حکومت نے ناراض ہو کر کہا کہ رپورٹر کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ انہوں نے فون کرنے والے سے کہا کہ اخبار کا مالک میں ہوں اور میں ہی اس کا ایڈیٹر ہوں، گھر سے سامان باندھ لایا ہوں، مجھے لے جایئے۔ اور یہ بھی میں نے دیکھا کہ ایک اور اخبار میں دو رپورٹروں کی خبروں پر حکومت ناراض ہوئی تو اخبار میں ان کی تصویر لگا کر انہیں نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ یہی اخباری ادارہ آج دعوی کرتے نہیں تھکتا کہ وہ اپنے کارکنوں کے ساتھ کھڑا ہے، اللہ اسے اپنا قول نبھانے کی توفیق بخشے۔

مگر مجید نظامی کا سا کوئی کون ہوگا۔ نواز شریف نے دھماکے کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا تو ایک بھری میٹنگ میں نظامی صاحب نے ان سے کہا کہ آپ دھماکہ نہیں کریں گے تو لوگ آپ کی حکومت کا دھماکہ کر دیں گے۔

ایک میٹنگ میں جنرل مشرف نے کشمیر پالیسی سے انحراف کا تاثر دیا تو میرے سامنے اور ایک سو دیگر ایڈیٹروں کے سامنے نظامی صاحب نے اس ڈکٹیٹر سے کہا کہ کشمیر سے غداری کریں گے تو اس کرسی پر نہیں رہ سکیں گے۔

حق گوئی کا سبق کسی نے سیکھنا ہوتو ان سے سیکھے۔اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو ہاتھ لگاتا، ان کے اخبار کے نیوز پرنٹ کو روکنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی، ہاں، اشتہار بند کر کے ضرور ان کا امتحان لیا گیا مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اشتہارات کی بندش آزادی صحافت پر حملہ ہے۔بھٹو دور میں ہمارے بزرگ مصطفیٰ صادق ان کو دربار اکبری میں لے گئے، کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، آخر بھٹو نے تنگ آ کر کہا، اوئے! مصطفیٰ، جس کام کے لئے آئے ہو اس کی بات کرو، اشتہار کھولنے کی بات کیوں نہیں چھیڑتے۔نظامی صاحب نے تنک کر جواب دیا، کہ میرا اشتہاروں سے کیا لینا دینا، میں اشتہار کھلوانے نہیں آیا۔کونسا اخباری مالک ہے جو اشتہاروں کی قربانی دے سکتا ہے۔

نظامی صاحب کے رپورٹروں نے کیا کیا خبریں نہیں دیں، اس اخبار کے کالم نویسوں نے کیا کیا نہیں لکھا۔اور کبھی کسی کالم کو سنسر نہیں کیا گیا، جو بھی کالم نویس اخبار چھوڑ کر گیا، وہ بہتر تنخواہ کے لئے گیا۔محترمہ بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے بارے میں کھل کر لکھا گیا۔کبھی مجھے کسی جملے پر اعتراض ہوتا اور میں کالم روکنے کی سفارش کرتا تو مجھے نظامی صاحب ہدائت کرتے کہ آپ کا کام یہ ہے کہ کالم کو اشاعت کے قابل بنا کر میرے پاس بھیجو۔جنرل ضیا کے بارے میں اخبار کی پالیسی کون نہیں جانتا مگر مجیب الرحمٰن شامی نے سانحہ بہاولپور پر یکے بعد دیگرے تین ماتمی کالم لکھے، ان کالموں کو ادارتی صفحے سے اٹھا کر صفحہ دو پر چھاپا گیا تا کہ ان کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو۔اور شامی صاحب نے ظاہر ہے، اپنی افتاد طبع کے مطابق ضیا کو ایک ہیرو کے طور پر یاد کیا تھا۔

مجھے یاد ہے صدام حسین نے کویت پر قبضہ جمایا اور امریکہ نے اس کے خلاف ایکشن لیا تو سارا پاکستان صدام حسین کا حامی تھا۔ایک دن مجھ سے نظامی صاحب نے پوچھا کہ کیا دفتر میں کوئی اور بھی ہماری ادارتی پالیسی کا حامی ہے، میں نے انہیں بتایا کہ پورا نیوز ڈیسک اخبار کے صفحات پر صدام کے گن گا رہا ہے۔یہ سن کر وہ مسکرا دیئے۔انہوں نے اپنی پالیسی تھوپنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

میرے سامنے ایک بار ہی ہمارے دفتر پر حملہ ہوا مگر لگتا یہ ہے کہ جمعیت کے حملہ آوروں کے رستے میں ہمارا دفتر پڑتا تھا، اس لئے انہوں نے یہاں نیٹ پریکٹس کی مگر آگے جا کر دوسرے اخبار کے دفتر کو انہوں نے خاکستر کر کے رکھ دیا۔

نائن الیون کے بعد کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز تھا، امریکہ اور ساری دنیا اسامہ بن لادن کے خون کی پیاسی تھی مگر

نوائے وقت میں اسامہ کی تصویر کے ساتھ افغان باقی، کہسار باقی کا نعرہ بلند کیا گیا، امریکہ اس پر ضرور برہم ہوا مگر نظامی صاحب نے کہا جس نے انہیں، گوانتانا موبے، لے جانا ہے، لے جائے۔ مگر کس میں ہمت تھی کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھتا۔

سمندروں میں طغیانی آتی ہے، فضاؤں میں بجلیاں گرجتی ہیں مگر اچھا کپتان وہی ہوتا ہے جو مسافروں کو حفاظت سے نکال لے جائے، وہ طوفانوں سے الجھتا نہیں، خودکشی نہیں کرتا، نہ مسافروں کی جان لیتا ہے۔

ڈاکٹر مجید نظامی سے کوئی کلمہ حق کہنے کا سلیقہ سیکھے اور اپنے مقصد حیات کی تکمیل کے لئے جینے کا ولولہ بھی سیکھے۔ وہ راستے کے پتھروں سے سر نہیں پھوڑتے، مگر کہیں سر جھکاتے بھی نہیں۔ اور کسی میں ہمت بھی نہیں تھی کہ انکا سر جھکانے کا خیال بھی دل میں لاتا۔

خدا نے انہیں لمبی زندگی دی، وہ ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ جینا اور سر اٹھا کے جینا، انہی کا طرہ امتیاز تھا۔

وہ کشمیر کے لئے جیئے، یہ کشمیر کل بھی پاکستان کے ساتھ تھا، آج بھی ہے اور آنے والے کل میں یقینی طور پر پاکستان کا حصہ بن کر رہے گا۔

میں اس مقصد کے لئے اپنا اور اپنے قلم کا خون تک بہانے کو تیار ہوں۔

نظامی صاحب! آپ سے میرا پکا وعدہ ہے! (26 جولائی 2014ء)

آزادی کشمیر، ڈاکٹر مجید نظامی کی آخری خواہش

ماشا اللہ چھیاسویں سالگرہ کی تقریب میں ڈاکٹر مجید نظامی نے کہا ہے کہ میری ایک خواہش باقی ہے کہ میں کشمیر کو آزاد ہوتے دیکھوں۔

دل سے دعا نکلتی ہے کہ کشمیر بھی جلد آزاد ہو اور اللہ کریم نظامی صاحب کو ہمارے سروں پر سلامت رکھیں، آمین! ان کی ذات ہمارے لئے نظریاتی مینارہ نور ہے، وہ مادر وطن کے بے بس لمحوں کی آس ہیں، قومی بے چارگی کا مضبوط سہارا ہیں، اور فکری دکھوں کا مرہم ہیں۔

نظامی صاحب کی آخری خواہش ہر پاکستانی کی پہلی خواہش ہونی چاہئے۔ انہوں نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ کشمیر کو قائداعظم نے شہہ رگ قرار دیا تھا، آج ثابت ہو گیا ہے کہ انہوں نے صحیح کہا تھا۔ آج ہمارے دریا سوکھ کر ندی نالوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ بھارت جب چاہتا ہے پانی چھوڑ کر ہمیں سیلاب میں مبتلا کر دیتا ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ پانی کے لئے ہمیں لالہ جی سے ایٹمی جنگ بھی کرنی پڑے تو ضرور کریں۔

نظامی صاحب یہ پیش کش پہلے ہی کر چکے ہیں کہ انہیں ایٹمی میزائلوں کے ساتھ باندھ کر کشمیر میں بھارتی فوجی چھاؤنیوں اور ڈیموں پر داغ دیا جائے۔

قربانی اور ایثار کا یہ جذبہ سنت ابراہیمی کے عین مطابق ہے اور یہ صرف معصوم اسماعیل علیہ السلام کے حصے میں آئی تھی یا پھر مجید نظامی اس کے لئے اپنی جان پیش کر رہے ہیں۔

لوگو! گواہ رہنا کہ نظامی صاحب نے اس سنت کو زندہ و تابندہ کرنے کا حق ادا کر دیا۔

کشمیر پاکستان کی شہہ رگ ہے، اس میں کسی کو کلام نہیں۔ کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ہے۔ یہ علاقہ آزادی ہند اور تقسیم برصغیر کے فارمولے کے تحت پاکستان کا اس لئے حصہ بننا چاہئے تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا پاکستان سے ملحقہ علاقہ تھا۔ اسی اصول پر بھارت نے جونا گڑھ، منادر، حیدرآباد پر قبضہ جمایا تھا۔

قائداعظم نے فوج کو حکم دیا کہ وہ کشمیر کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرائے لیکن اس وقت کے انگریز آرمی چیف نے ان کی بات نہ مانی۔اس پر پاکستانی عوام نے جہاد کا اعلان کیا۔اس میں پاک فوج کے دستے باقاعدہ شامل ہوئے۔انہیں اس کا حکم کس نے دیا، یہ سب کچھ پہلی جنگ کشمیر کی فوجی تاریخوں میں رقم ہے۔پاکستان کے جہادی دستے جب سری نگر کے ایئرپورٹ پر قابض ہو گئے تو بھارتی وزیراعظم نہرو نے عالمی سطح پر واویلا مچادیا اور سلامتی کونسل سے جنگ بندی کی بھیک مانگی، انہی کی درخواست پر سیز فائر عمل میں آئی، اس سیز فائر کے ساتھ ایک شرط تھی کہ کشمیریوں کو حق خودارادیت کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا، وہ اپنی آزاد مرضی سے پاکستان یا بھارت کسی ملک میں شامل ہو جائیں۔وہ دن اور آج کا دن، بھارت نے کشمیریوں کو حق خودارادیت نہیں دیا۔

65ء میں پاک فوج نے کشمیر کی آزادی کی ایک کوشش کی، اسے آپریشن جبرالٹر کا نام دیا گیا۔پاکستانی ہراول ٹینک دیکھتے ہی دیکھتے دریائے توی پار کر گئے۔یحییٰ خان نے اپنے بریگیڈ کو حکم دیا کہ تین ستمبر کی شام ڈھلنے تک جوڑیاں پر قبضہ کر لیا جائے، اگلے دو دنوں میں یحییٰ خان کے دستے اکھنور کا محاصرہ کر چکے تھے۔اکھنور پر پاک فوج کے قبضے کو روکنے کی طاقت بھارتی فوج میں قطعی نہ تھی۔بھارت پر واضح ہو گیا تھا کہ اکھنور سے پیش قدمی کرتے ہوئے یحییٰ خان کے دستے جموں کا پٹھان کوٹ سے رابطہ کاٹ سکتے تھے۔یحییٰ خان کے نامہ اعمال میں گناہ بہت ہیں لیکن چھمب جوڑیاں محاذ پر اس کی برق رفتار پیش قدمی شاید اس کے کچھ گناہوں کی سیاہی دھو ڈالے۔

پاک فوج کی اس کامیابی پر بھارت بوکھلا کر رہ گیا، اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ پاکستان کو عالمی سرحد پر جنگ میں الجھا دے، اور چھ ستمبر کی رات کے اندھیرے میں اس کی جارحیت نے کشمیر کی آزادی کا خواب چکنا چور کر دیا۔

پاکستان کا اکثریتی طبقہ جنگ ستمبر پر ناز کرتا ہے مگر کارگل کی جنگ کا نقاد ہے۔جبکہ آپریشن جبرالٹر اور کارگل جنگ میں زیر زبر کا فرق نہیں۔وہ پاکستان جس نے خالی ہاتھ ستمبر کی جنگ میں بھارتی جارحیت کا منہ توڑ دیا تھا، وہ کارگل کی جنگ میں ایٹمی اسلحے سے لیس ہونے کے باوجود بھارت کے سامنے بھیڈ بنا دیا گیا۔

پاکستان کی یہ وقتی کمزوری تھی، مگر اس کے لئے مستقل کمزوری بن کر رہ گئی ہے، آج بھی پاکستان ایٹمی اسلحے، دور مار میزائلوں اور ایک بہترین پیشہ ور فوج سے آراستہ و پیراستہ ہے مگر اس کی قیادت بھارت کے

سامنے لم لیٹ ہے۔ڈاکٹر نظامی صاحب اس کیفیت کو متھ ٹیک کہتے ہیں۔

ہم مسلم سپاہ سالاروں کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔محمد بن قاسم، ابدالی، غوری، باربروسہ، غزنوی، یہ سب ہمارے ہیرو ہیں مگر معاف فرمائیے کیا وہ اپنے دشمنوں کو چینی فروخت کرتے تھے یا ان سے آلو اور پیاز خریدا کرتے تھے۔ابھی ہمارے سامنے روس نے کریمیا پر قبضہ جمایا ہے تو کیا روسی تجارتی ٹرکوں نے کریمیا کو روندنے کا، کارنامہ انجام دیا ہے، کیا صدام حسین نے کویت پر قبضے کے لئے اپنے تاجروں کے وفود ارسال کئے تھے، اور کیا امریکہ نے عراق اور افغانستان پر قبضے کے لئے اپنی گندم کی بوریوں اور خشک دودھ کے ڈبوں کو بطور حربہ استعمال کیا تھا۔پاکستان پر دس برسوں میں امریکی ڈرون نے قیامت برپا کئے رکھی، کیا ان الف لیلوی طیاروں سے گلدستے پھینکے جاتے رہے اور آج جن طالبان سے ہم بصد عجز و نیاز مذاکرات کر رہے ہیں، کیا وہ پچھلے ایک عشرے میں ہمیں سلام محبت پیش کرتے رہے تھے۔ارے میاں! یہ دنیا طاقت ور کی ہے، ہم نے کشمیر لینا ہے اور ہر قیمت پر لینا ہے، بھارت نے بھی اسے بزور طاقت غلام بنا رکھا ہے، اسے آزاد بھی بزور طاقت کرایا جا سکتا ہے۔واہگہ کی لکیر کو مٹانا ہے یا اس بارڈر کو چوبیس گھنٹے کھولے رکھنا ہے تو پھر ہمیں کشمیر کو بھول جانا ہوگا اور ڈاکٹر مجید نظامی کی آخری خواہش پامال ہو کر رہ جائے گی۔مگر ہمیں یہ منظور نہیں، ہم اس خواہش کی تکمیل کر کے رہیں گے۔

مجھے یاد ہے ایک بار خوشونت سنگھ کے متولیوں نے اسے پاکستان بلایا اور پرل کانٹی نینٹل لاہور میں اس کا لیکچر رکھا، اس سے کسی نے کشمیر کی آزادی کا سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ کشمیر کے بدلے ہم نے بھارتی مسلمان یرغمال بنا رکھے ہیں، تم کشمیر کا نام لو گے تو پھر بھارتی مسلمانوں کا حشر بھی دیکھ لینا۔خوشونت سنگھ اس دنیا میں نہیں رہا مگر اس کے قصیدہ خوان یاد رکھیں کہ کشمیر کے لئے بھارتی مسلمان تو کیا، ہم پاکستانی مسلمانوں کے وجود کو بھی بھول سکتے ہیں، اس لئے کہ دنیا میں ہندو ریاست صرف بھارت ہے، مگر مسلم ریاستیں پچاس سے زائد ہیں۔ہم نہ رہے تو بھارت بھی نہیں رہے گا مگر کرہ ارض پر پچاس سے زائد مسلمان ملک ضرور ہوں گے۔

ہماری روحوں کی تسکین کے لئے یہ سودا برا نہیں۔(5 اپریل 2014)

بھارتی ٹینک پر چڑھ کر دلی کا سفر۔۔مجید نظامی کا عزم

ڈاکٹر وی پی ویدک کو شرارت سوجھی یا وہ طنز کرنا چاہتے تھے، انہوں نے چند روز قبل مجید نظامی صاحب سے کہا کہ سنا ہے آپ کو ٹینک پر چڑھ کر انڈیا جانے کا شوق ہے، تو کیا آپ کو ایک ٹینک وہاں جا کر بھجوا دوں۔

ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس غیرت مند پاکستانی نے کہا کہ مہاراج! آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں، اپنے پہلو میں دیوار پر لگی تصویر کو غور سے دیکھئے، میں ایک انڈین ٹینک ہی پر تو سوار ہوں۔

اس پر ڈاکٹر ویدک کا منہ کھلے کے کھلا رہ گیا۔

ڈاکٹر ویدک نے پاکستان کے دورے میں کئی اور شخصیات سے بھی ملاقاتیں کی ہیں لیکن اس طرح کا جواب انہیں کہیں اور سننے کو نہیں ملا ہو گا۔ وہ ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ سیاسی تجزیہ کار اور انڈین کونسل برائے امور خارجہ کے سربراہ۔ جب سے نواز شریف منتخب ہوئے ہیں تو بھارت اور پاکستان کے مابین ظاہری اور خفیہ نامہ و پیام میں تیزی آ گئی ہے۔ سارک کی بنیاد ڈھاکہ میں پڑی، جنرل ضیا الحق وہاں گئے، واپسی پر انہوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ نئی دہلی کے راستے جاتے ہیں۔ غیرت مند مجید نظامی نے جواب دیا، مجھے انڈیا جانا ہوا تو ٹینک پر سوار ہو کر جاؤں گا، ضیا الحق کا منہ لٹک گیا، وہ دہلی چلا گیا اور نظامی صاحب دوسرے جہاز میں پاکستان واپس آ گئے۔ بھارت نے پچھلے کئی برسوں سے آبی دہشت گردی کا بازار گرم کر کر رکھا ہے۔ پاکستان کی حکومت کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں۔

سندھ طاس کونسل میں ایک صاحب جماعت علی شاہ نہ جانے کب سے اس میں براجمان تھے، انہوں نے بھارت کی اس جارحیت سے اغماض برتا، نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان بنجر بنتا چلا جا رہا ہے، دریاؤں اور نہروں میں پانی نہیں ہے اور ڈیموں میں پانی کی کمی کی وجہ سے ہائیڈل بجلی کی پیداوار کم ہو گئی ہے، اس سے صرف پاکستان کے کھیت ہی نہیں، دیہات ہی نہیں، شہروں کے شہر متاثر ہو رہے ہیں، اندھیرے چھا رہے ہیں، قیامت صغری

کا یہ منظر دیکھ کر دردمند مجید نظامی نے کہا کہ انہیں ایک ایٹمی میزائل سے باندھ کر بھارت کے ڈیموں پر گرا دیا جائے، ان کے ولولے کو دیکھ کر درجنوں خواتین نے بھی رضا کارانہ پیش کش کی کہ انہیں بھی ایسے میزائلوں کے وار ہیڈ کے ساتھ بھارت کے نشانوں پر داغ دیا جائے، قربانی کی ایک لازوال تاریخ کا نیا باب لکھا گیا۔

مجھ ناچیز کو بھی درس نظامی سے فیض یاب ہونے کا اعزاز میسر ہے۔ کوئی ڈیڑھ عشرہ میں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے رکھا۔ ان جیسی جرات اور دلیری کا دعوی تو نہیں کر سکتا لیکن سن دو ہزار میں جبکہ میں اس ادارے میں نہیں تھا، امریکیوں نے پاکستان اور انڈیا کے چار چار ایڈیٹروں کو اپنے ہاں بلوایا، خوب سیر کروائی اور لیکچر سنوائے، واپسی سے ایک روز پہلے انہوں نے ڈی بریفنگ کا اہتمام کیا، مجھ سے خاص طور پر یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا میں بھارت کے خیر سگالی دورے پر جانا چاہوں گا۔ نوائے وقت پنڈی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر جاوید صدیق اس بات کے گواہ ہیں کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ نہیں۔۔ اور ترت جواب آیا کہ آپ پر ہماری سرمایہ کاری ضائع گئی۔

اسی دورے میں ہمیں سان فرانسسکو کے نواح میں ایک ساحلی شہر مانترے کے تحقیقاتی انسٹی ٹیوٹ میں لے جایا گیا۔ وہاں میزائلوں اور ایٹمی تجربات کے ماہرین نے ہمیں لیکچر دیئے، میں نے سامنے دیوار پر ایک نقشے پر نظر ڈالی، اس پر لکھا تھا: پاکستان کے ایٹمی مراکز، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین سے پوچھا کہ یہاں بھارت کا ایٹمی نقشہ کیوں نہیں۔ اور وہ کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔

واشنگٹن کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں کارل انڈر فرتھ ہمیں ملنے آئے، ان کے پاس ایک بہت بڑا پورٹریٹ تھا۔ انہوں نے اسے کھولا اور تمتماتے چہرے کے ساتھ بتایا کہ یہ وہ سرٹیفکیٹ ہے جو انہیں انڈیا کے دورے میں صدر کنیڈی کے ساتھ جانے پر ملا تھا، میں نے انہیں کہا کہ یہ سرٹیفکیٹ ہمارے بھارتی صحافیوں کی دلچسپی کی چیز تو ہو سکتا ہے لیکن ہم چار پاکستانیوں کا منہ کیوں چڑا رہے ہیں۔

دونوں ملکوں میں ایسے عناصر کی کمی نہیں جو واہگہ کی لکیر کو مٹانے کی آرزو رکھتے ہیں، میں نے ان میں سے کئی ایک کو کہا ہے کہ یہ لکیر ضرور مٹے گی اور پاکستان کے مسلمان اور انڈیا کے مسلمان، اور بنگلہ دیش اور برما کے مسلمان، پھر اکٹھے ہوں گے مگر اس کے لئے ہمیں ایک اور محمود غزنوی کا انتظار کرنا ہوگا، ایک اور غوری یا بابر کی مہم جوئی کا انتظار کرنا ہوگا، اگر ہم نے مہا بھارت پر ایک سال تک حکمرانی کی ہے تو تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ کچھ لوگ شادمان چوک کو بھگت سنگھ چوک کے نام سے موسوم کرنا چاہتے ہیں۔ لاہور کی ضلعی

انتظامیہ کو بھی کچھ ایسا شوق چرایا ہے۔ بھگت سنگھ نے قیام پاکستان کے لئے جدو جہد نہیں کی، اس نے اپنے مادر وطن بھارت کی آزادی کے لئے قربانی دی اور اس کی یادگار بھارت نے بنا رکھی ہے، یہ میرے آبائی گاؤں فتوحی والہ سے ملحقہ قصر ہند کے قلعے کے ساتھ واقع ہے، اس قلعے کو اکہتر کی جنگ میں ہمارے غازیوں نے روند ڈالا تھا۔ 41 بلوچ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے رات کی تاریکی میں اس قلعے اور اس کے اردگرد کے مورچوں کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ جس کسی کو بھگت سنگھ کی یادگار دیکھنی ہو تو وہ بھارت کا ویزہ لگوائے اور فیروز پور شہر جا کر حسینی والہ بارڈر پر پہنچے اور وہاں جا کر سیس نوانے کا شوق پورا کر لے، بھگت سنگھ کو پاکستان کی تحریک آزادی سے کیا لینا دینا۔ وہاں اس کی مڑھی ہے۔ ہمارے گاؤں کے بزرگ بتاتے ہیں کہ اسی جگہ پر اس کی لاش کا کریا کرم کیا گیا تھا اور وہیں کہیں دریائے ستلج میں اس کی باقیات کی راکھ بہا دی گئی۔ اکہتر کی جنگ میں، میں نے 41 بلوچ اور تھری پنجاب کے ساتھ ایک ماہ تک امبیڈڈ صحافی کے طور پر کام کیا اور اس معرکے کی تفصیلات جمع کیں۔ اگر کسی کو اس معرکے کی تفصیلات جاننی ہوں تو وہ پاک فوج کے ایک بہادر جرنیل عبدالمجید ملک سے چکوال جا کر ملے، قصر ہند کا نام سن کر ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس معرکے میں ڈویژنل کمانڈر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔

قصر ہند کے ذرا مشرق میں کھیم کرن کا قصبہ ہے جسے 65 کی جنگ میں پاک فوج نے روند ڈالا تھا، وہیں بھارت کے بکتر بند ڈویژن کا غرور ٹوٹا اور اس کے درجنوں ٹینک ہمارے قبضے میں آئے جن کی قصور کے اسٹیل باغ میں مہینوں تک نمائش جاری رہی۔ جناب مجید نظامی نے 65 میں کھیم کرن کے انہی ٹینکوں پر بیٹھ کر تصویر بنوائی تھی جو آج بھی ان کے کمرے کی زینت بنی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ویدک خاطر جمع رکھیں، مجید نظامی اکیلے نہیں، ان کے ساتھ یہ ناچیز بھی اسی مقبوضہ بھارتی ٹینک پر نئی دہلی آئیں گے۔ (2 جون 2013ء)

القدس کا دکھ صرف قادسیہ کے امام کو

لاہور میں القدس کے شہیدوں کا نوحہ پڑھنے اور اسرائیلی چنگیزیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے ایک جلوس نکلا، یہ ایک تاریخی اجتماع تھا، چند دن کے نوٹس پر تیس ہزار نوجوان مال روڈ پر سینہ کوبی کر رہے تھے اور اسٹیج سے مجاہد اسلام اور القادسیہ کے امام حافظ محمد سعید کی للکار سنائی دے رہی تھی۔

شیخ الاسلام کا لقب از خود اختیار کرنے والے علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کی تحریک منہاج القرآن ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، قادری صاحب کینیڈین شہری ہونے کے ناطے اسرائیل اور فلسطین بھی جانے کے اہل ہیں اور ممکنہ طور پر ان کی برانچیں قبلہ اول کی سرزمین پر بھی موجود ہوں گی کہ مسلمان تو وہاں بھی بستے ہیں۔ مگر میں یہ کیسے سوچ لوں کہ طاہر القادری اسلامی حمیت کے جذبوں سے محروم ہیں۔ یہ جذبے تو ان کے اندر مچل مچل جاتے ہیں مگر وہ ایک ماہ سے اپنے مفادات پر متوجہ ہیں اور ان کی ساری چیخ و پکار ان چودہ لاشوں پر ہے جو شدید بہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماڈل ٹاؤن میں گرائی گئیں، ان پر جتنا بھی افسوس اور ماتم کیا جائے، کم ہے مگر غزہ کے معصوم بچوں کو جس طرح اسرائیلی ایف سولہ کے میزائل قیمہ بنا رہے ہیں ، وہ ہسپتالوں میں مریضوں کو بھی نہیں بخشتے اور مسجدوں میں نمازیوں کو بھی شہید کئے جا رہے ہیں، ان پر تو ہمیں تڑپ تڑپ جانا چاہئے اور ڈاکٹر طاہر القادری کو کینیڈین پاسپورٹ پر اسرائیل اتر کر بھرپور احتجاج کرنا چاہئے تھا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! قادری صاحب للچائی ہوئی نظروں سے تخت اسلام آباد کو دیکھ رہے ہیں، وہ ایک انقلاب کے ہلے سے یہ تخت خالی کروا کر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں، پاکستان کے آئین میں حکومت کو ہٹانے کے لئے پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت درکار ہے مگر قادری صاحب کی نمائندگی کسی یونین کونسل تک میں نہیں۔ اور وہ خواب دیکھتے ہیں پاکستان میں اپنے دور حکومت کے آغاز کا، ان کے بعد ان کے

فرزندان عالی مقام بھی تیار بیٹھے ہیں، گویا قادر شاہی دور کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ مگر غزہ کے بے گناہ فرزندوں کا بھی تو انہیں کوئی خیال ہونا چاہیئے، جن کی کئی نسلیں پچھلی ایک صدی میں لہولہان ہو کر اجتماعی قبروں میں گل سڑ رہی ہیں۔

عمران خان تو نہلے پر دہلے نکلے، انہیں عالم اسلام کے مسائل کا کیا ادراک، وہ اس کے جغرافیے سے بھی آگاہ نہیں ہوں گے۔ اسرائیل یا فلسطین کی کوئی کرکٹ ٹیم ہوتی تو وہ ضرور اس خطے اور اس کے مسائل سے آگاہ ہوتے، عمران کے اردگرد بابوں، بیگمات اور بچونگڑوں کی ایک کلاس ہے جس نے کسی کلاس روم میں اسلامی تاریخ یا جغرافیے کا ایک سبق بھی نہیں پڑھا، انہیں ایک میدان جنگ کا علم ہے اور وہ بھی انہیں طوطے کی طرح رٹایا گیا ہے، یہ میدان جنگ اسلام آباد کا ہے، غزہ کے میدان جنگ کی خبریں وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں، انہیں پوچھیں کہ پانی پت کیا ہے، سومنات کیا ہے، سرنگاپٹم کیا ہے، جبرالٹر کیا ہے، تو جواب میں ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے گا۔ اس کلاس سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ غزہ کے شہیدوں کی قطار در قطار لاشوں کا نوحہ پڑھتی یا اسرائیل اور اس کے سرپرست امریکہ سے احتجاج کرتی۔

اب لے دے کے ہمارے پاس جماعت اسلامی ہے جو ایک سانس میں اسرائیل کو کوستی ہے اور دوسرے سانس میں عرب حکمرانوں کو لتاڑتی ہے کہ وہ گھگو گھوڑے بنے بیٹھے ہیں۔ ان عرب حکومتوں نے جماعت اسلامی کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا رکھا ہے، اس لئے وہ جماعت کے نزدیک گردن زدنی ہیں۔ جماعت کے ممدوح وہ مجاہدین ہیں جو ان عرب حکمرانوں کو چلتا کر کے وہاں خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

تو برا بننے کے لئے حافظ محمد سعید باقی رہ جاتے ہیں، وہ جلوس پہ جلوس نکال رہے ہیں، اور انہوں نے ہفتہ احتجاج کا اعلان کر دیا ہے، شاید یہ وہی ہفتہ ہے جب قادری صاحب کے معتقدین قرآن خوانی کے لئے مال روڈ پر پہنچیں گے اور چند روز میں بیٹری چارج ہونے کے بعد اسلام آباد کا رخ کر لیں گے، جہاں عمران کا لشکر پہلے ہی دھاوا بول چکا ہوگا، یہ رن دیکھنے والا ہوگا۔ ایسے نظارے ہم نے مصر میں دیکھے، شام میں دیکھ رہے ہیں، عراق میں دیکھ رہے ہیں، ہم اپنے گلے خود کاٹ رہے ہیں تو کس زبان سے اسرائیل سے گلہ کریں۔ مگر حافظ محمد سعید کو سود و زیاں سے کیا لینا دینا، وہ تو اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں، ایک ایسے عالم میں جب بھارت اور امریکہ اور اقوام متحدہ نے ان کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ دنیا میں کئی خوش قسمت سر ایسے ہیں جن کی قیمت لگ جاتی ہے اور کوئی سر ایسے ہیں جن کو کوئی خاطر میں ہی نہیں لاتا، وہ معمولی سے اشارہ ابرو پر جھک

جھک جاتے ہیں اور کسی قیمت کے بغیر اپنا سودا کر لیتے ہیں۔

بیرونس سعیدہ وارثی نے اپنا قد اور بڑھا لیا ہے، وہ برطانوی حکمران پارٹی میں پہلے بھی قد آور شخصیت تھیں مگر انہوں نے غزہ کی قیامت پر اپنے عہدے سے استعفے کا اعلان کیا ہے، یہ ایک باحمیت اور باغیرت مسلم خاتون کا بھرپور احتجاج ہے، عورت ذات اس سے بڑھ کر اور کر بھی کیا سکتی ہے، مگر اسی برطانوی پارلیمنٹ میں لارڈ نذیر ہیں، پنجاب کے گورنر محمد سرور کے بیٹے انس سرور ہیں جو اسکاٹش لیبر پارٹی کے لیڈر بھی ہیں، کچھ ان کا بھی فرض بنتا ہے۔ محمد سرور بھی گورڈن براؤن کے فنڈ سے بے نیاز اور آزاد ہو کر اسرائیلی چنگیزیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتے ہیں، وہ جس زمانے میں ابھی کونسلر بھی نہیں تھے تو وفد لے کر اسرائیل جاتے تھے، محمد سرور کے پاس برطانوی پاسپورٹ تو نہیں رہا لیکن ان کے بیٹے انس سرور کے پاس تو ہے، وہ اپنی سرکردگی میں ایک وفد لے کر غزہ جائیں، شہید بچوں کی اجتماعی قبروں پر فاتحہ خوانی کریں اور دیوار گریہ سے لپٹ کر آہ وزاری تو کریں۔ اسرائیل انہیں تنگ کرے تو وہ لاہور کے گورنر ہاؤس کی، محفوظ ترین پناہ گاہ میں آ جائیں، اس پناہ گاہ کی حفاظت کے لئے قوم کے پاس ایٹم بموں کا ذخیرہ ہے، اس لئے یقین رکھئے کہ اسرائیل ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کرے گا۔

ان دنوں فیس بک پر ہٹلر کا ایک پیغام گردش کر رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں چاہتا تو ایک ایک یہودی کو کیفر کردار تک پہنچا دیتا لیکن میں نے کچھ یہودی اس لئے باقی رہنے دیئے تا کہ آپ سب کو اندازہ ہو سکے کہ میں ان کے قتل کا حامی کیوں تھا۔

حافظ محمد سعید کے سامنے میری ایک فریاد ہے کہ اب کوئی صلاح الدین ایوبی، کوئی خالد بن ولید، کوئی طارق بن زیاد، کوئی محمود غزنوی، کوئی شیر میسور۔۔ قبر سے اٹھ کر مسلم امہ کی حفاظت کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا مگر آپ اس امت کو جگانے کے لئے اپنی اذان ضرور بلند کریں ہے، ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور۔ ایک اذان طاہر القادری نے دینی ہے، اسلام آباد پر چڑھائی کے لئے، یا ایک کروڑ نمازیوں کو جمع کرنے کے لئے، دوسری اذان آپ بلند کریں، کوئی تو آپ کے پیچھے بھی رزم گاہ میں قطار بنا کے کھڑا ہو گا۔

(7 اگست 2014)

حافظ محمد سعید کا دفاعی تجزیہ

روزوں میں افطار پارٹیاں معمول بن جاتی ہیں۔ان میں بدن کو غذا تو بہت میسر آجاتی ہے مگر ذہن کے لئے غذا کا بندوبست بہت کم ہوتا ہے۔آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل باجوہ نے دوپہر بارہ بجے فکری نشست رکھی، انہیں اس کے بعد واپس چلے جانا تھا، اس لئے ان کی افطاری سے اخبارنویس محروم رہے، شاید وہ اس کمی کو دور کرنے کے لئے دوبارہ آئیں، وفاقی محکمہ اطلاعات کی افطاریاں قسط وار چل رہی ہیں، چند لوگوں کو بلایا جاتا ہے جس سے کھلی ڈھلی گپ شپ ہو جاتی ہے، دو افطاریاں ڈاکٹر آصف محمود جاہ نے کرائیں، وہ کسٹم ہیلتھ کیئر ایسوسی ایشن کے سربراہ ہیں، ان کا مقصد بے گھروں کی معاونت کے لئے شعور بیدار کرنا اور فنڈز اکٹھے کرنا تھا، وہ اپنے مقصد میں بھرپور کامیاب رہے۔ ہفتے کے روز جماعت الدعوہ کے سربراہ حافظ محمد سعید کی طرف سے ان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات یحییٰ مجاہد نے اواری ہوٹل کے مغل بورڈ روم میں ملاقات اور بعد میں خورشید محل میں افطار ڈنر کا بندوبست کیا۔ حاضرین کے اعتبار سے یہ افطاری بہت بڑی تھی، ہر اخبار اور چینل کی سینئر ترین نمائندے اس میں موجود تھے اور انتہائی وقیع شخصیات نے بھی اس کے لئے وقت نکالا۔

یحییٰ مجاہد نے جو زبانی اطلاع دی تھی اس کے مطابق حافظ صاحب کو شمالی وزیرستان کے مہاجرین پر گفتگو کرنا تھی اور ان کے مسائل سے آگاہ کرنا تھا، یہ ایک نیک مقصد تھا، میں نے بھی اس میں اسی لئے شرکت ضروری سمجھی، اسی مقصد کے ساتھ ڈاکٹر آصف جاہ کی تقاریب میں حاضری دی، الطاف حسن قریشی میرے استاد ہیں، انہوں نے مجھے یاد نہیں فرمایا، بلاتے تو سر کے بل جاتا۔۔کہ اس میں ایک نہیں، تین فلاحی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔محکمہ اطلاعات کی افطاری میں، میں نہیں گیا، صرف کھانے پینے کے لئے میں گھر سے نہیں نکل سکتا لیکن حافظ سعید صاحب کی افطاری سے فارغ ہو کر نیچے ہوٹل کی لابی میں آیا تو سیکرٹری

اطلاعات محمد اعظم ، پرنسپل انفارمیشن آفیسر راؤ تحسین علی خاں، جناب شفقت جلیل اور لاہور کے ڈائریکٹر جنرل راؤ لیاقت علی خاں کے ہتھے چڑھ گیا، ان کے کمرے میں ایسی نشست جمی کہ رات ڈھل گئی اور سحری کے وقت گھر پہنچ سکا۔

حافظ محمد سعید ان دنوں پھر خبروں میں ہیں، پاکستان میں کم مگر بھارت میں زیادہ، ایک بھارتی صحافی ڈاکٹر وید پرتاپ ویدک کے ساتھ ملاقات کی وجہ سے بھارت میں ہاہا کار مچی ہوئی ہے، ڈاکٹر وید بے حد شرارتی انسان ہیں، ڈاکٹر مجید نظامی صاحب سے ملنے آئے تو طنزیہ انداز میں کہنے لگے کہ آپ کو بہت شوق ہے ٹینک پر بھارت جانے کا، اگر حکم کریں تو بھارت سے ایک ٹینک بھجوادوں، نظامی صاحب نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے، ترت جواب دیا، مہاراج، اپنے دائیں ہاتھ ایک تصویر دیکھیں، میں بھارتی ٹینک پر سوار ہوں، یہ ہماری افواج نے پینسٹھ کی جنگ میں کھیم کرن سے پکڑا تھا اور قصور میں نمائش کے لئے رکھا تھا۔ اب یہ حافظ صاحب کے پاس گئے تو چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ مجھے ممبئی حملے کی ساری کہانی سچ سچ سنادیں۔ یہ صاحب اپنے آپ کو انڈین فارن کونسل کے چیئرمین ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ان کے سوالات کا معیار یہی ہے تو انہیں کسی پرائمری اسکول میں دوبارہ سے داخلہ لینے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ پاکستان کے دورے میں ٹریک ٹو کے مقاصد کے حصول کے لئے آئے تھے، ان کی ملاقات وزیراعظم نواز شریف سے بھی ہوئی تھی، ان سے انہوں نے پہلا سوال یہی کیا ہوگا، کیا آپ بھارتی وزیراعظم مودی سے گلی ڈنڈا کھیلنا پسند کریں گے۔

میں بڑی چالاکی سے حافظ سعید صاحب کی گفتگو کی تفصیلات میں جانے سے گریز کر رہا ہوں، اس لئے کہ یہ گفتگو بڑی خطرناک تھی، امریکہ اور بھارت جس شخص کو خطرناک ڈیکلیئر کر چکے ہوں، اس کی گفتگو ابریشم کی طرح نرم تو نہیں ہوسکتی اور فی الواقع حافظ صاحب نے ایک دلیر اور غیور مسلمان کا لب ولہجہ اپنایا۔ یہ انداز گفتگو کسی کو بھی پسند نہیں آئے گا لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ اس بھری محفل میں انہوں نے کسی کو پکڑائی نہیں دی۔

ایک اخبار کے چیف ایڈیٹر نے پوچھا کہ آپ نے ایک گھنٹے کی گفتگو میں شمالی وزیرستان آپریشن کا ذکر تک نہیں کیا جو ہماری زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ میں نے ایک بڑی جنگ کی بات کی ہے، شمالی وزیرستان تو اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، یہاں آپریشن کے لئے امریکیوں نے بہت دباؤ ڈالا مگر یہاں حقانی گروپ تھا اور ملا نذیر گروپ تھا جو افغانستان میں مزاحمتی کوششوں میں مصرف رہے، اسلئے پاکستان

نے آپریشن امریکہ کے دباؤ پر نہیں کیا اور اب اپنی حکمت عملی کے ساتھ اس علاقے کو کلیئر کیا جا رہا ہے، یہ آپریشن ایک محدود سے طبقے کے خلاف ہے جو زیادہ تر تاجکوں، ازبکوں اور دیگر غیر ملکیوں پر مشتمل ہے اور جنہیں امریکہ اور بھارت نے ایک سازش کے تحت پاکستان سے لڑنے بھڑنے کے لئے یہاں داخل کیا ہے اور انہیں خطرناک اسلحے سے لیس کیا ہے۔ پاکستانی فوج نے قبائل میں اپنی ساکھ کو بحال کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔فوج مہاجرین کی مدد کر رہی ہے، بوڑھی عورتوں کو کندھوں پر اٹھا کر محفوظ مقامات پر منتقل کر رہی ہے۔ان کو راشن پانی مہیا کیا جا رہا ہے اور انشا اللہ سوات کے مہاجرین کی طرح وہ بھی جلد اپنے گھروں میں جا بسیں گے، اس کے لئے پاک فوج دلیری سے لڑ رہی ہے، یہاں کسی فوج کو پر مارنے کی اجازت نہیں تھی مگر ہم نے اپنی پلاننگ اور اپنے مفاد کے لئے ایک کٹھن کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔اگر آپ حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو یہ آپریشن بھارت اور امریکہ کی مذموم پلاننگ کے خلاف ہے۔ پاکستانی قوم اپنی مسلح افواج کے شانہ بشانہ کھڑی ہے۔حب الوطنی کی یہ لہر قابل مبارک باد اور لائق اطمینان ہے۔

ایک نوجوان نے پوچھا کہ آپ کہتے ہیں ہم حالت جنگ میں ہیں مگر آپ نے کوئی طریقہ نہیں بتایا کہ ہم حالت جنگ سے کیسے نکلیں اور خوشحالی کا سفر تیزی سے کیسے طے کریں، حافظ صاحب نے اس نوجوان کے چہرے سے اس کی عمر کا جائزہ لیا، اور پھر جچے تلے لفظوں میں کہا جب آپ میدان میں ہیں اور میدان چھوڑ دیں تو آپ کا دشمن اس میدان پر قابض ہو جائے گا۔ ہمارے سامنے جو میدان لگا ہوا ہے، اس میں بھارت اور امریکہ کی متحدہ قوت ہے، کیا ہم اس کے سامنے سرنڈر کر دیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔تو حالت جنگ سے نکلنے کے لئے ہمیں پہلے اپنے دشمن کو چت کرنا ہوگا۔نوجوان کالم نویس شاید ہار ماننے ءوالا نہیں تھا، اس نے اگلا سوال داغا کہ آپ نے کشمیر کے جہاد کا ذکر نہیں کیا۔حافظ صاحب نے پھر ایک گہری نظر اس نوجوان کے خدوخال پر ڈالی اور کہا کہ کشمیر میں جہاد کبھی ختم نہیں ہو سکتا، ابھی مودی وہاں گیا ہے تو حریت لیڈروں کی ایک کال پر سارے کشمیر میں شٹر ڈاؤن ہو گیا، وہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں میں ہو کا عالم تھا، یہ جہاد نہیں تو اور کیا ہے۔نوجوان جسے ایک ٹاک شو چلانے کی مہارت حاصل ہے، اس نے تیسرا سوال داغا کہ آپ کہتے ہیں کہ چین کو ساتھ لے کر چلنا ہے تو چین میں نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی اجازت نہیں ہے، ایسے چین سے ہمیں کیا حمائت ملے گی، حافظ صاحب نے الجھنے کی بجائے معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ چین کل بھی ہمارے ساتھ تھا، آج بھی ہمارے ساتھ ہے۔ یہ خبریں جھوٹی ہیں اور یہ بے بنیاد پراپیگنڈہ ہے کہ چین میں

شعائر اسلام پر پابندی ہے، اس لئے کہ حرم شریف میں وہ خود چینی مسلمانوں سے مل چکے ہیں، پورے چین میں کسی کو نماز روزے سے نہیں روکا گیا مگر جو عناصر شمالی وزیرستان میں ہماری افواج کے در پے ہیں اور ہمارے ایئرپورٹوں کو اڑا رہے ہیں اور ہمارے چرچوں پر حملے کر کے ہمیں دنیا میں گندہ کر رہے ہیں، انہی کے کچھ ساتھی چین میں بھی مصروف پیکار ہیں، ہم ان کی کاروائیوں کو جائز قرار نہیں دے سکتے اور کوئی ریاست ان کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ امریکی اور صہیونی کارندے ہیں، ان کا جہاد سے کیا تعلق۔

ایک سرکاری نوکری پر فائز جہادی کالم نویس نے پوچھا کہ داعش کے بارے میں کیا رائے ہے، انہوں نے تو خلافت کا اعلان کر دیا ہے، حافظ صاحب پہلے ہی کہہ چکے تھے کی عراق میں صدام حسین کے پس ماندگان نے امریکہ کے خلاف کامیاب جہاد کیا ہے مگر امریکہ نے ایک ایسا گروہ میدان میں جھونک دیا ہے جو اپنے آپ کو مجاہدین کا نام دیتا ہے مگر وہ مسلمانوں کے گلے کاٹنے کے شوق میں مبتلا ہے۔ ایک سوال آیا کہ اگر آپ کہتے ہیں کہ ملک حالت جنگ میں ہے تو اس کے لئے ایمرجنسی کے نفاذ اور وار کیبنٹ کی تشکیل کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے۔ حافظ سعید نے جواب دیا کہ ہم ایسے نمائشی اقدامات کی حمائت نہیں کرتے جن سے صرف سنسنی پھیل سکتی ہو، ہم عملی اقدامات کے حق میں ہیں۔ اور عملی قدم یہ ہے کہ ہم اس جنگ کو اپنے دشمن کے علاقے میں دھکیل دیں۔

ہر دل سے آمین کی دعا نکلی اور ساتھ ہی افطاری کی ساعت سعید آن پہنچی۔

(21 جولائی 2014)

حافظ محمد سعید نے خود کیا کہا

حافظ محمد سعید شرح صدر کے ساتھ بولے۔ان سے کچھ اور کہلوانے کی بڑی کوشش کی گئی مگر اس میں دوستوں کو ناکامی ہوئی اور یہ ناکامی ان سب کی تھی جو اپنے کالموں اور اپنے ٹاک شوز میں مقابل کو ٹکنے نہیں دیتے،اس کی مت مار دیتے ہیں، یہاں حال یہ تھا کہ ہم حافظ محمد سعید کو گھیرنے میں ناکام رہے۔ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو باؤلا ہو کر بھاگ اٹھتا مگر جو شخص کومٹ منٹ رکھتا ہو اور جو جانتا ہو کہ اسکا موقف برحق ہے، اسے پچھاڑنا ممکن نہیں ہوتا اور نہ ایسا ہو سکا۔

تو پھر سنتے ہیں کہ خود حافظ سعید نے اپنی بات کہاں سے شروع کی اور کیسے آگے بڑھائی اور کہاں ختم کی۔

ایک ایک مہمان سے مصافحہ اور کچھ سے بغل گیر ہونے کے بعد حافظ صاحب نے اپنی نشست سنبھالی، بسم اللہ سے گفتگو کا آغاز کیا،شروع میں ان کی ٹون دھیمی تھی مگر پھر جیسے سمندر میں تلاطم آ گیا ہو اور لہریں بپھر بپھر گئی ہوں،ان کی آواز میں جوش غالب آتا چلا گیا جس کے لئے انہوں نے خطاب مکمل کرنے کے بعد معذرت بھی کی کہ حد ادب کا تقاضہ تھا کہ وہ میڈیا کی معزز ہستیوں کے سامنے متانت اختیار کرتے مگر موضوع اور مسائل کی آگ نے ان کے لہجے کو جھلسا دیا۔

ابتدائی کلمات میں اور پھر بار بار حافظ صاحب نے جدید دور میں میڈیا کی اہمیت اور اسکے مؤثر کردار کا ذکر کیا۔انہوں نے محفل میں موجود ایک سے ایک بڑھ کر تجزیہ کار، کالم نویس اور اینکر پرسن سے درخواست کی کہ وہ لوگوں کی صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت میں کردار ادا کریں۔

انہوں نے تاریخ میں جھانکتے ہوئے یاد دلایا کہ کس طرح نو آبادیاتی دور میں اسلامی ممالک کی دولت کی لوٹ کھسوٹ سے اہل مغرب نے ترقی کا سفر طے کیا اور محکوم ممالک کو پس ماندگی میں دھکیل دیا۔دوسری طرف وسط ایشیائی اسلامی مملکتوں پر سوویت روس نے غلبہ پا لیا،اس طرح امت مسلمہ کی آزادی چھن گئی اور

وہ اغیار کے سامنے بے بس ہوکر رہ گئے، کسی نے اپنی سلامتی کے لئے اپنے آپ کو استحصالی طاقتوں کا دم چھلہ بنالیا لیکن افغانستان پر روس کی جارحانہ یلغار نے تاریخ کا دھارا الٹ دیا، امریکہ کو زعم یہ تھا کہ یہ جنگ اس نے سعودی اور کویتی پیسے اور پاکستانی فوج کے بل پر لڑی اور جیتی مگر جب اس نے حقیقی تجزیہ کیا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ نہ تو امریکہ نے یہ جنگ لڑی اور نہ اس میں اسکی جیت ہوئی، بلکہ یہ جنگ مجاہدین نے لڑی اور انہی کو فتح حاصل ہوئی اور ان مجاہدین کی کمان پاکستان کے ایک باوقار ادارے آئی ایس آئی کے ہاتھ میں تھی۔ افغان جہاد کے بعد دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ گیا اور اسلامی طاقتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا جن کا قلع قمع کرنے کے لئے امریکی اور یورپی حکمران کئی بار شرم الشیخ میں سر جوڑ کر بیٹھے اور یہیں انہوں نے افغانستان پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا تھا تا کہ مجاہدین کی کمر سر اٹھانے سے قبل ہی توڑ کر رکھ دی جائے۔ یہ فیصلہ نائن الیون سے کئی سال قبل ہوا تھا۔ یاد کیجئے کہ کس طرح صومالیہ اور سوڈان کے اردگرد امت مسلمہ پر مظالم توڑے گئے۔ امریکہ دیکھ رہا تھا کہ عبداللہ عزام کی سرکردگی اور راہنمائی میں ایک ولولہ انگیز قوت ابھری۔ سوویت روس کی شکست نے وسط ایشائی مسلمان ملکوں کی آزادی کی راہ کھولی۔ کچھ لوگوں کا اعتراض ہے کہ تاجکوں اور ازبکوں نے بربادی پھیلائی لیکن ہر قوم کا اپنا ایک مزاج ہے، اصل معجزہ یہ تھا کہ روسی مسلمانوں کو کمیونسٹ چنگل سے چھٹکارہ مل گیا تھا، ستر سال تک ان کی مسجدیں تو تھیں لیکن وہاں سے اذان کی آواز نہیں گونجی، مدرسے تو تھے مگر اساتذہ اور شاگردوں سے خالی، جن قوموں نے حدیث مرتب کی، وہ اسے زبان پر لانے کا یارا نہیں رکھتے تھے، اب آزادی کے بعد ان کے دبے ہوئے جذبے طوفان بن کر ابھرے۔ اور طوفان تو پھر طوفان ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی ملنے کے بعد حرمین شریفین میں روسی مسلمانوں کی تعداد میں یکا یک اضافہ ہو گیا۔

افغانستان میں سوویت روس کی شکست سے امریکہ کو جو خوشی میسر آئی تھی، وہ عارضی ثابت ہوئی۔ اس کی یہ سرخوشی ہوا ہو گئی کہ اس نے عربوں کی دولت اور مسلمانوں کے خون سے اپنی حریف سپر پاور کا خاتمہ کر دیا مگر اب اس کے سامنے اسلامی جہاد کا لشکر کھڑا تھا جو اسے کرہ ارض کے ہر کونے میں چیلنج کر رہا تھا، امریکہ نے پلاننگ کی کہ اس لشکر کو اس کی نرسری افغانستان میں ہی بھسم کر کے رکھ دیا جائے، اس کے لئے وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا، نائن الیون نے اسے یہ بہانہ بھی فراہم کر دیا۔ ایک طرف اس نے افغانستان پر چڑھائی کی اور دوسری طرف مجاہدین کی پشت پر وار کیا اور عراق کو بھی نشانہ بنالیا۔

یہ ایک شاہنامہ ہے یا رزم نامہ، یہ کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ایک داستان ہے، الف لیلی کی طرح اس میں سے ہر کہانی دوسری کہانی کا ورق کھول دیتی ہے۔ یہ کہانی پہاڑوں سے سر ٹکراتی ہے، کھلے میدانوں میں اٹھکیلیاں کرتی ہے، بحر و بر میں پھنکارتی ہے۔ اور منطقی دھارے پر بہتی چلی جارہی ہے۔

امریکہ اور یورپ کو صلیبی جنگیں نہیں بھولیں، اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس شیر کو خواب غفلت میں مست رکھے، اسے آپس میں الجھا دے۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دے، اس نے افغان جہاد کے ثمرات کو ضائع کرنے کے لئے جہادی کمانڈروں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا مگر طالبان کی قوت ایسی ابھری کہ اس خانہ جنگی کا خاتمہ ہوگیا، اب کہیں کوئی حکمت یار تھا، نہ ربانی، نہ حقانی، نہ مجددی، بس ایک طاقت تھی اور ایک ملک تھا، ایک وحدت نظر آتی تھی۔ امریکہ اسے پارہ پارہ کرنے کے لئے آگے بڑھا، نیٹو نے اس کا ساتھ دیا، پاکستان نے بڑی ہوشیاری سے اپنے پتے کھیلے مگر امریکہ کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے، امریکہ کو افغانستان میں شکست ہوگئی، وہ اس شکست کا ذمے دار پاکستان کو سمجھتا ہے، اس کی فوج کو سمجھتا ہے، اسکی آئی ایس آئی کو سمجھتا ہے اور اس نے بڑی عیاری سے اپنی جنگ پاکستان میں دھکیل دی ہے، اس جنگ نے امریکہ سے زیادہ پاکستان کا نقصان کیا ہے، ہمارے ساٹھ ہزار شہری شہید ہو چکے، ہماری معیشت کا جنازہ نکل گیا۔ امریکہ ہمارے کس بل نکال دینے پر تلا ہوا ہے، اس نے بھارت کو آگے کر دیا ہے، قندھار سے لے کر نورستان تک بھارتی مراکز اصل میں دہشت گردی کے اڈے ہیں جہاں کے تربیت یافتہ ایجنٹ پاکستان میں دہشت گردی کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ اب بھیس بدل کر بھارتی فوج بھی افغانستان میں داخل ہو چکی ہے، امریکہ اپنی جگہ اسے علاقے کا تھانیدار بنانا چاہتا ہے، پاکستان کی ایٹمی قوت نہ امریکہ کے لئے قابل برداشت ہے، نہ بھارت اور اسرائیل کے لئے۔ پاکستان کو مزہ چکھانے کے لئے وہ اس جنگ کو دھکیل کر پاکستان کے اندر لے آئے ہیں، ہماری بہادر افواج شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں کے آخری مراکز کا صفایا کرنے میں مصروف ہیں۔ فوج کو عوام سے کاٹنے کی سازش ناکام ہوگئی۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ آج فوج اور قوم ایک صف میں ہیں۔ شمالی وزیرستان کے غیور قبائل نے پاکستان کے لئے کوئی مشکلات کھڑی نہیں کیں، یہ سب سے بڑا معجزہ ہے ورنہ لوگ اس آپریشن سے کیا کیا نہیں ڈراتے تھے۔

افغانستان کی جنگ پاکستان میں دھکیل دی گئی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا یہ جنگ اپنے گھر میں لڑنی ہے یا دشمن کے گھر میں جا کر لڑنا ہے، میرے

نزدیک بہترین دفاع کی ضمانت ایک فیصلہ کن جارحانہ یلغار ہی ہوسکتی ہے، امریکہ نے یہ جنگ بھارتی را کے دہشت گردوں کے ذریعے ہمارے گھروں کے اندر داخل کردی ہے، ہمارے ہاں ایسے علمائے کرام کی کمی نہیں جن کا کہنا ہے کہ امریکہ سے لڑنے کے لئے کوئی نیا نائن الیون کرنے کے بجائے امریکی پٹھوؤں سے لڑا جائے اور ان کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جائے، ہمارے نوجوان اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے ہی اور اپنے بہن بھائیوں کا خون کررہے ہیں۔ ہمارا میڈیا ان گمراہ نوجوانوں کے ذہن صاف کرسکتا ہے اور قوم میں یہ شعور ابھار سکتا ہے کہ بہترین دفاع جارحیت میں مضمر ہے۔ یقین کیجئے ہم اس جنگ میں تنہا نہیں ہوں گے، ہم چین کو اپنے ساتھ پائیں گے اور عالم اسلام ہمارے ساتھ کھڑا ہوگا، سعودی عرب امریکی جفا اور وفا کو آزما چکا، اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ادھر امریکی کمر ہمت ٹوٹ چکی، وہ پہلے عادی تھا کہ دوسروں کے پیسے اور خون سے جنگیں لڑے، اب اسے اپنی دولت اور اپنے خون کی قربانی دینا پڑی ہے، اسکے حوصلے پست ہیں۔ مگر وہ پاکستان سے انتقام لینے پر تلا ہوا ہے۔ ہم اس کو یہ موقع فراہم نہیں کرسکتے۔ ہمیں پہل کرکے اس کی جارحیت کے سامنے بند باندھنا ہوگا، ہمیں یہ لڑائی اپنے دشمنوں کے گھر جا کر لڑنا ہوگی۔ میں پھر یقین سے کہتا ہوں کہ ہم اکیلے نہیں، چین ہمارے ساتھ ہے، عالم اسلام ہمارے ساتھ ہے اور ہمیں اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرنا ہے۔

حافظ صاحب کی گفتگو کا حاصل ایک فقرہ ہے کہ ہمیں فدویانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے جارحانہ رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ اگر محکومی اور جبر کا انتقام لینے کے لئے نائن الیون نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔

(22 جولائی 2014)

اوم پوری بھی خوش، حافظ سعید بھی خوش

چودھری شجاعت کے ہاتھ میں کونسی گیدڑ سنگھی ہے، ایک روز ان کی کھانے کی میز پر بھارتی اداکار اوم پوری سجے ہوتے ہیں، اگلی دوپہر کو حافظ سعید کے لئے وہیں کھانا کھول دیا جاتا ہے۔

اوم پوری اپنی عمر تو پوری کر چکے مگر کہتے ہیں کہ آئندہ پاکستان دشمن فلموں میں کام نہیں کروں گا، پہلے انہوں نے ایک فلم میں جنرل ضیاالحق کا کردار ادا کیا، اب جنرل اشفاق پرویز کیانی کا روپ دھاریں گے۔ بھارت نے پاکستان دشمنی میں یوں تو فلموں کا انبار لگا دیا لیکن جب کارگل میں ان کی فوج کی ٹھکائی ہوئی تو فلم سازی کا اگلا پچھلا ریکارڈ مات کر دیا گیا۔ اصل معرکہ تو چودھری شجاعت نے مارا ہے کہ بھارتی اداکار بھی خوش اور پاکستانی مجاہدین کا لیڈر بھی خوش، شاید حافظ سعید نے ان کے ساتھ 23 مارچ کو برپا ہونے والی احیائے نظریہ پاکستان کانفرنس پر تبادلہ خیال کیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس تاریخ کے آنے سے پہلے پہلے میاں نواز شریف کی کابینہ بھارت کو موسٹ فیورڈ نیشن کا درجہ کسی اور نام سے دے دے گی، منور حسن بھی کبھی کام کی بات کر جاتے ہیں، انہوں نے آج ہی کہا ہے کہ حکمران لفظوں کے ہیر پھیر سے عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں اور غیر امتیازی مارکیٹ رسائی کی نئی اصطلاح ایجاد کر کے پاکستان کو بھارتی مال کی منڈی بنانے کا اعلان کرنے والے ہیں۔ اس کا اعتراف وفاقی وزیر تجارت خرم دستگیر بھی دبے لفظوں میں کر چکے ہیں، وزیر موصوف کا تعلق اس شہر سے ہے جہاں مادر ملت کی انتخابی مہم کے دوران ایک کتیا کے گلے میں نازیبا الفاظ لکھ کر اسے پورے شہر میں گھمایا گیا تھا، اس وزیر سے کسی نیکی کی توقع عبث ہے۔

چودھری شجاعت ان سے بڑے کاریگر ہیں، بھارت کے لیے ان کا عشق ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ چودھری شجاعت کو بھارت سے عشق ورثے میں ملا، چودھری ظہور الٰہی کے گھر پر سکھوں کا میلہ لگتا تھا، ان کا خیال تھا کہ وہ سکھوں کو رام کر رہے ہیں اور ہندوؤں سے دور کر لیں گے، مگر سنت بھنڈرانوالہ کے ساتھی

سکھ نوجوان چند گھنٹے بھی بھارتی ٹینکوں کے سامنے کھڑے نہ رہ سکے مگر 47 میں بہت کم مسلمان عورتیں ان کی دست برد سے بچ سکیں۔ میں سلمی تصدق حسین کے پاس جایا کرتا تھا جو سکھوں سے واپس کروائی جانے والی خواتین کی نفسیاتی بحالی کے لئے کوشاں تھیں۔ چودھری ظہور الہی کے خاندان کو ہجرت کا عذاب نہیں سہنا پڑا، اسلئے انہیں مشرقی پنجاب کی بپتا کا کیا علم ہوسکتا ہے۔ لاہور کو سکھوں نے بھسم کر دیا، اس کا علم چوھری شجاعت کو کیا ہوگا، وہ تو ظہور الہی روڈ کے بنے بنائے محلات میں آ کر آباد ہو گئے۔ انکے ساتھ پرویز الہی بھی تھے، انہیں پنجاب کی چیف منسٹری ملی تو ہریانہ کے چیف منسٹر کو بلا لیا۔ بھارت کا یہ صوبہ ہندو اکثریت کی آبادی ہونے کی شہرت رکھتا ہے اور ہندومت کی تاریخ نے اسی صوبے سے جنم لیا، چودھری پرویز الہی نے نہیں بتایا کہ انہیں ہریانہ سے کیا عشق تھا۔ پورا چودھری خاندان ضیا الحق کے دور میں پھلا پھولا۔ ٹی وی پر ہر ہفتے قرآن کی تفسیریں بیان کرنے والا یہ جرنیل، ہندو اداکاروں پر فریفتہ تھا۔ بھارتی فلموں کو نمائش کی اجازت بھی اسی مرد حق شناس نے دی۔ اور شترو گھن سنہا سے لے کر دلیپ کمار تک بھارتی اداکاروں کی ایک لمبی کہکشاں پاکستان کا افق روشن کر رہی تھی۔ اب اوم پوری نے بھی پاکستان آ کر اعلان کیا کہ وہ آئندہ پاکستان دشمن فلموں میں کام نہیں کریں گے۔ عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن۔ آخری عمر میں کیا خاک مسلمان ہوں گے اور ادھر چودھری شجاعت کے بارے میں شاعر کہہ گیا ہے کہ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔ یاد نہیں ان دنوں چودھری شجاعت اصلی وزیر اعظم تھے یا حلالی وزیر اعظم جب وہ ایڈوانی کے ساتھ کٹاس راج مندر میں پہنچے اور اس کی تزئین نو کا حکم دیا۔ یہی ایڈوانی ایک شکستہ وخستہ بابری مسجد کے انہدام میں پیش پیش تھا۔

سنا ہے کہ چودھری شجاعت نے حافظ سعید کو خوش خبری سنائی کہ انہوں نے ایک اور بھارتی اداکار رضا مراد کے ہاتھ امیتابھ بچن کو پاکستان آنے کا دعوت نامہ ارسال کیا ہے۔ لیجئے حافظ صاحب، احیائے نظریہ پاکستان کنونشن کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

یہ سارے لچھن اگر پیپلز پارٹی والوں کے ہوتے تو ہم ان کے لتے لے رہے ہوتے۔ ایک بار محترمہ بینظیر نے اسلام آباد کی سارک کانفرنس میں راجیو گاندھی کی طرف مسکرا کے دیکھ لیا تھا تو ہم جیسوں نے اسے آج تک معاف نہیں کیا، اعتزاز احسن آج تک صفائیاں دیتا پھرتا ہے کہ اس نے سکھوں کی کوئی لسٹ انڈیا کو نہیں دی۔ فیس بک پر ہم لوگوں نے عاصمہ جہانگیر کی مت مار رکھی ہے کہ وہ بھارت جا کر مندر میں ماتھا کیوں

ٹیکنے لگیں۔ مگر ابھی منگل کے روز نامہ خبریں میں اس کے لندن کے نمائندہ خصوصی وجاہت علی خاں نے اپنے کالم میں انکشاف کیا ہے کہ ہمارے پنجاب کے گورنر چودھری محمد سرور ان دنوں لندن میں ہیں، چند من چلے سکھ انہیں ساؤتھ آل لے گئے جہاں ایک گوردوارے میں انہوں نے حاضری دی اور ماتھا ٹیکا، اس کالم کی اشاعت کو دو روز ہو گئے ہیں، گورنر ہاؤس لاہور نے اس دلخراش سانحے کی کوئی تردید یا وضاحت نہیں کی۔

چودھری شجاعت، چودھری پرویز اور نواز شریف اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلواتے ہیں اور قائداعظم کے جانشین بھی، کیا وہ اسی قائداعظم کے جانشین ہیں جنہوں نے پاکستان کی تخلیق کی تھی۔

میں ابھی فون پر ایک دوست سے ان معاملات پر بات کر رہا تھا۔ دوست نے ظالمانہ لہجے میں کہا کہ اب قائداعظم کی نشانی کو مٹانے کی آخری کوشش ہو رہی ہے اور خود انہی کے ماننے والوں کے ہاتھوں۔ نواز شریف نے کہا، کسی اور نے نہیں کہ یورپ کی طرح سرحدیں نہیں ہونی چاہئیں، شہباز نے گرہ لگائی کہ واہگہ بارڈر دن رات کھلے رہنا چاہئے، گورنر سرور نے تائید کی کہ پورے یورپ میں سرحدیں مٹ چکی ہیں۔ اب کوئی دن آتا ہے کہ ن لیگی کابینہ ان اقدامات کی منظوری دے دی گی۔ اور ہم واہگہ کی دیوار گریہ سے سر ٹکرایا کریں گے۔ پتہ نہیں ہم نے آزادی کے حصول کے لئے لاکھوں سر کیوں کٹوائے اور آزادی کی حفاظت کے لئے دنیا کی بہترین پروفیشنل فوج کیوں کھڑی کی۔ ایٹم بم کا مصرف تو چودھری شجاعت نے بتا دیا کہ یہ شادی بیاہ میں پٹاخوں کے کام آئے گا۔ ویسے فوج کا مصرف بھی ن لیگ نے ڈھونڈ لیا تھا، میٹرو ریڈنگ، بھل صفائی اور گھوسٹ اسکولوں کا سراغ لگانا، اب ایک نیا مصرف سامنے آ گیا ہے، سعودی عرب کے ڈیڑھ ارب ڈالر اور بحرین کے بادشاہ کی چالیس سال بعد پاکستان پر نظر کرم۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم بلا دشام میں کرائے کے قاتلوں کا کردار ادا کریں گے، میرے منہ میں خاک! یہ الفاظ میرے نہیں، ٹی وی چینلز پر چلنے والے ٹکروں کے ہیں۔ چودھری شجاعت نے یکے بعد دیگرے ایک ہی میز پر اوم پوری اور حافظ سعید کو کھانا کھلانے کی مہارت سے ثابت کر دکھایا ہے کہ رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت بھی نہ دی۔ باقی کوئی کسر باقی ہے تو نواز شریف پوری کر دیں گے۔ (20 مارچ 2014ء)

حافظ محمد سعید سے بھارت دہشت زدہ کیوں ہے

بھارت نے اپنے سر پر بعض پاکستانی اداروں اور شخصیات کا بھوت بلاوجہ سوار کر رکھا ہے۔ بھارت کے ہاں پتہ بھی کھڑکے یا پٹاخہ بھی چل جائے تو وہ اس کا الزام آئی ایس آئی کو دیتا ہے۔ اگر کہیں کوئی مسلح تصادم کی نوبت آجائے تو وہ اسے حافظ محمد سعید کی کارستانی قرار دیتا ہے اور مجموعی طور پر بھارت دشمنی کو ہوا دینے کے لئے ڈاکٹر مجید نظامی اور ادارہ نوائے وقت کو ذمے دار ٹھہراتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ برصغیر میں دشمنی اور مخاصمت کی ابتدا کس نے کی، جواب ہے بھارت نے، بھارت نے، بھارت نے، اس نے جونا گڑھ میں اپنی فوج کے ذریعے دہشت گردی کا ارتکاب کیا اور اس روایتی مسلم ریاست پر جارحانہ قبضہ جما لیا۔ بھارت کی ہوس ملک گیری نے اسے چین نہ لینے دیا اور اس نے کشمیر کی مسلم اکثریتی ریاست کو بھی فوجی دہشت گردی کے ذریعے ہتھیا لیا۔ بھارت کو چھیاسٹھ برس سے کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے، اس عرصے میں اس نے باوردی دہشت گرد کشمیر میں داخل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور اس وقت بھارتی فوج کی وردی میں ساڑھے آٹھ لاکھ دہشت گرد وادی کشمیر میں موجود ہیں۔ اگر کسی کے پاس کیلکولیٹر ہو تو حساب کر لے کہ کتنے کشمیریوں کے اوپر کتنے بھارتی فوجی دہشت گرد سنگینیں تانیں کھڑے ہیں۔

اور الزام بھارت کا حافظ محمد سعید پر ہے کہ اس کے مجاہد وادی کے امن کو تلپٹ کر رہے ہیں۔ بھارت، امریکہ اور اقوام متحدہ نے حافظ محمد سعید کو باقاعدہ دہشت گرد قرار دے رکھا ہے اور ان کے سر کی قیمت مقرر کر دی گئی ہے۔ حافظ محمد سعید کسی قلعے یا غار میں پناہ گزین نہیں، ان تک عام لوگوں کی رسائی ہے حتی کہ وہ پاکستانی میڈیا جو بھارت کا ہم آواز ہے، وہ بھی روز ان کو ملتا ہے، اسے پورا موقع میسر ہے کہ حافظ محمد سعید کو پکڑے اور بھارتی سفارت خانے کے حوالے کر کے بھاری انعامی رقم بٹور لے۔

حافظ محمد سعید نے ایک حالیہ ملاقات میں مجھے بتایا ہے کہ بھارتی پارلیمنٹ پر حملے میں ان کا کوئی کردار نہیں

،اسی طرح ممبئی حملوں میں بھی وہ کسی طور ملوث نہیں بلکہ انہوں نے اس شبہے کا اظہار کیا کہ یہ بھارت کی اپنی کارستانی تھی اور اسے سمجھنے کے لئے دو نکات پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے کہ ایک تو ممبئی کے بظاہر غیر معروف نریمان ہاؤس پر حملے کا ڈرامہ کیوں رچایا گیا اور دوسرے مبینہ دہشت گردوں کے ہاتھوں انٹی ٹیررسٹ فورس کے سربراہ ہمینت کرکرے کو پہلے ہی ہلے میں کیوں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ظاہر ہے، ان حملوں میں کسی پاکستانی کو کوئی دلچسپی نہیں سکتی بلکہ کرکرے کو ٹھکانے لگانے کا مطلب تو صاف صاف یہ تھا کہ مالیگاؤں میں مسلمانوں کے خلاف ہندوں کی دہشت گردی اور سمجھوتہ ایکسپریس سانحے میں پاکستانی مسافروں کے زندہ جلانے میں حاضر سروس بھارتی ہندو کرنل پروہت کے خلاف تفتیش رکوادی جائے۔حال ہی میں بھارتی وزارت داخلہ کے ایک اعلی افسر نے یہ راز کھول دیا ہے کہ بھارت میں دہشت گردی کے کئی ایک واقعات میں راملوث رہی ہے۔

بھارت کے پاس بہت بڑی پروپیگنڈہ مشینری ہے،امریکی اور صہیونی لابی اس کی پشت پر ہے اور پاکستان میں کھلے عام بھارت کا دم بھرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔وہ حافظ محمد سعید اور لشکر طیبہ کے خلاف مسلسل زہر آلود پروپیگنڈہ کررہا ہے جبکہ پاکستان میں لشکر طیبہ کا کوئی عملی وجود بھی نہیں۔

امریکی صدر کلنٹن نے پاکستان کے دورے میں براہ راست خطاب کیا جس میں انہوں نے وارننگ دی کہ طاقت کے بل پر سرحدیں نہیں بدلی جاسکتیں،اس خطاب کے فوری بعد صدر مشرف نے بھی ہنگامی تقریر میں ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ کشمیری خاندان کنٹرول لائن کے آر پار تقسیم ہیں اور پاکستان بھر میں مہاجرین کی حیثیت سے آباد ہیں۔وہ وادی کے مظلوم رشتے داروں کی مدد کرنا چاہیں تو پاکستان ان کا راستہ نہیں روک سکتا۔اصولی طور پر پاکستان کو یہ پالیسی ترک نہیں کرنی چاہئے تھی مگر نائن الیون کے بعد امریکہ نے پاکستان کو دباؤ کا شکار کیا اور اسی جنرل مشرف نے کشمیر جہاد پالیسی کو ریورس گیئر لگا دیا،اسی موقع پر ڈاکٹر مجید نظامی نے جذباتی انداز میں صدر مشرف سے کہا تھا کہ آپ کشمیر سے غداری کریں گے تو اس کرسی پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔

کشمیر میں جہاد کو دہشت گردی کہنا جائز نہیں، نہ اس جہاد کے علم بردار کے طور پر حافظ محمد سعید کو دہشت گرد کہنا کسی طور پر روا خیال کیا جاسکتا ہے، ویسے حافظ محمد سعید پہلے حریت پسند لیڈر نہیں جنہیں دنیا دہشت گرد سمجھتی ہو۔ابھی منڈیلا کو عالمی حکمرانوں نے پورے اعزاز کے ساتھ دفن کیا مگر ایک زمانے میں اس پر بھی

دہشت گرد کا لیبل چسپاں کیا گیا، ابھی کل کی بات ہے جب یاسر عرفات کو دہشت گرد کہا جاتا تھا مگر پھر اسے جنرل اسمبلی سے خطاب کی دعوت دی گئی تو اس نے کہا میرے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، دوسرے میں شاخ زیتون۔ بھارت کے طول وعرض میں آزادی کی درجنوں تحریکیں چل رہی ہیں جنہیں بھارتی فوج جوابی دہشت گردی سے دبانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے۔ بھارت کا سب سے بڑا ہلہ کشمیر پر ہے جہاں ساڑھے آٹھ لاکھ فوجی دہشت گردوں نے مسلمانوں کی زندگی دوبھر کر رکھی ہے، جوانوں کو تہ تیغ کیا جارہا ہے، نوجوان خواتین کی اجتماعی آبروریزی کی جاتی ہے اور بوڑھے بھی اذیت سے محفوظ نہیں۔ بھارتی دہشت گرد فوج کشمیریوں کی بدترین نسل کشی میں مصروف ہے۔

میں نے حافظ محمد سعید سے پوچھا کہ آپ کو جہاد سے رغبت کیسے ہوئی، انہوں نے مجھ سے جوابی سوال کیا کہ آپ کا گھر مجاہدین کا مرکز کیوں تھا، کیا آپ کے بزرگ سید احمد بریلوی شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی روایات کے وارث نہیں تھے، ان کا اگلا سوال تھا، کیا ڈاکٹر مجید نظامی کا مشن جہاد اکبر نہیں ہے، کیا انہوں نے پیش کش نہیں کی کہ انہیں ایٹمی میزائل کے ساتھ باندھ کر کشمیر میں بھارتی فوج کے ٹھکانے پر گرا دیا جائے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ حافظ محمد سعید نے کہا کہ بھارتی دہشت گردی کا مقابلہ اسی اسپرٹ اور جذبے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مجید نظامی ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں، میں ان کی جگہ میزائل کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔ جب تک ایک بھی بھارتی فوجی کشمیر کی سرحد میں دہشت گردی میں ملوث ہے، ہم ان کے مقابلے میں اپنی گردنیں کٹواتے رہیں گے۔ اگر بھارت کو کشمیر کی سرحد طاقت کے زور پر بدلنے کا حق حاصل ہے، اس نے یہ طاقت اڑتالیس میں استعمال کی، پھر وہ اس ہٹ پر قائم ہے، اس نے چوراسی میں سیاچین میں دہشت گردی کا ارتکاب کیا، تو پھر دہشت گرد تو بھارت ہوا۔ وہ بلا وجہ، چوروں کی طرح کشمیر کی سرحد پار کرتا ہے، ہمارے تو مسلمان بھائی بہن، ماں باپ، کشمیر میں جبر اور ظلم کا شکار ہیں، ان کی مدد ہم پر واجب ہے۔ اگر برصغیر میں کوئی دہشت گرد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ ہے بھارت جس کی وردی پوش فوج بھارت میں خون کی ندیاں بہا رہی ہے۔ (18 جنوری 2014ء)

حافظ محمد سعید سے بھارت دہشت زدہ کیوں ہے (2)

وفاقی وزیر خرم دستگیر اپنے والد کے وسیع کاروبار کے مالک ہیں، ان کا یہ بھی مشن ہے کہ باقی ملک میں بھی عوام کا اسی طرح کاروبار پھلے پھولے، اس مقصد کے لئے ان کی نظر لامحالہ بھارت کی وسیع مارکیٹ پر ہے، چین کی نظر بھی اسی مارکیٹ پر ہے اور ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے سنائی دیتے ہیں اور امریکہ تو اس مارکیٹ پر چھا جانے کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہے اور بھارت نے کمیونسٹ بلاک کی برسوں تک جو بھی ناز برداری کی، اس کا بھولے سے بھی تذکرہ نہیں کرتا۔ خرم دستگیر اور ان کی حکومت نے کشمیر پر بھارتی جارحیت اور جبر کو فراموش کر دیا ہے اور ملک کو پیسے کمانے کی لت ڈالی جا رہی ہے۔ تجارت کے معاملات چلانا خرم دستگیر کا فرض منصبی ہے مگر کیا تجارت صرف بھارت سے ہو سکتی ہے، ایران بھی ہمارے ہمسائے میں ہے، چین ہماری لامحدود ضروریات پوری کر سکتا ہے اور کر بھی رہا ہے تو پھر بھارت کا یہ عشق کیسا کہ واہگہ بارڈر کو چوبیس گھنٹے کھولنے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ کیا اس فیصلے کے پیچھے خرم دستگیر کی وہ سیاست تو کارفرما نہیں جو ان کے والد کا شعار تھی اور ایوب خاں کی صدارتی مہم میں انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی مخصوص انداز میں عزت افزائی فرمائی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بھارت سے معاشقہ کہیں بانیان پاکستان کی ذات اور انکے نظریات کی نفی کی دانستہ کوشش تو نہیں۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ مجھے حافظ محمد سعید کے بارے میں بھارتی تعصّبات کا ذکر آگے بڑھانا ہے۔ حافظ سعید کا قصور یہ ہے کہ وہ کشمیر پر بھارتی قبضے کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔ دنیا میں کونسا انسان ہے جو اپنے گھر یا جائیداد پر کسی غیر کے قبضے کو برداشت کر سکتا ہو۔ ایک انچ دیوار آگے پیچھے ہونے پر نسل در نسل قتل و غارت کا سلسلہ چلتا ہے اور اگر کبھی آپ بورڈ آف ریوینیو کے اندر جھانک سکیں تو یہاں لاکھوں گرد آلود فائلوں کا ڈھیر پڑا نظر آئے گا جن پر صدیوں سے فیصلے نہیں ہو سکے۔ یہ فیصلے کلہاڑیوں،

برچھیوں، بندوقوں اور کلاشنکوفوں کی مدد سے ہوتے ہیں۔ اور ہمارا وہم ہے کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ بیک چینل، پرامن ڈپلومیسی کے ذریعے ہو جائے گا، اس کیس میں تو لاکھوں مربع میل پر ناجائز قبضے کا مسئلہ ہے اور پھر لاکھوں انسان بھی جبر کا شکار ہیں، ان کی نسل کشی ہو رہی ہے، عفت مآب خواتین کی اجتماعی آبروریزی کے سانحے رونما ہو رہے ہیں، بھارتی مصنفہ ارون دھتی رائے کہتی ہے کہ بھارتی عوام نئی دہلی میں ریپ کے واقعات پر تو افسوس کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کی زبانیں کشمیر میں بھارتی فوج کے ہاتھوں کشمیری خواتین کے ریپ پر گنگ ہیں۔

حافظ سعید کی زبان البتہ ان سانحات پر گنگ نہیں ہے، کشمیر کی تمام مجاہد تنظیمیں اپنے وطن پر بھارتی جارحانہ قبضے پر گنگ نہیں ہیں۔ بھارت انکو دہشت گرد سمجھتا ہے لیکن پچھلے چھاسٹھ برس میں بھارتی فوج کے کتنے ہی کمانڈروں نے کشمیر میں دہشت گردی کا بازار گرم کئے رکھا۔ اس وقت لیفٹیننٹ جنرل سنجیو چھاچھرا ساڑھے آٹھ لاکھ بھارتی فوجی دہشت گردوں کی کمان کر رہے ہیں۔ وہ بھارتی فوج کی ناردرن کمان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ہیں، یہ کسی انسان کا چہرہ نہیں بلکہ کسی خونی بلا کا ہیولی ہے، انسانی شکل میں کسی بھیڑیئے کا روپ ہے، ابھی اسرائیل میں ایک بھیڑیئے شیرون کا انتقال ہوا ہے جس نے صابرہ اور شتیلہ میں انسانی خون کی ہولی کھیلی، یہی کھیل جنرل چھاچھرہ بھی کھیل رہے ہیں، وہ کشمیریوں کی گردنوں میں ایک عفریت کی طرح نوکیلے دانت گاڑ دیتے ہیں اور ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کوئی شقی القلب ہی ہوگا جو خون کی اس ہولی پر خاموش رہ سکتا ہو۔ حافظ محمد سعید کے سینے میں انسانی دل ہے، وہ اپنے کشمیری بھائیوں کے قتل عام پر کڑھتے ہیں اور پھر ان کی مدد کے لئے ان سے جو بھی بن پڑتا ہے، وہ کر گزرتے ہیں، جب بھارت کو عالمی قوانین اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی پروا نہیں تو حافظ سعید سے کیوں توقع کی جائے کہ وہ ان بے معنی اور بے مغز قراردادوں کی پابندی کریں گے۔ بھارت واویلا مچاتا رہے، اس پر کوئی دھیان اس لئے نہیں دیتا کہ وہ لاکھوں فوجی درندوں کے ساتھ کشمیر کے طول و عرض میں ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے، اس وقت جب کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں اور شہروں کے گلی کوچوں میں سفید برف کی تہہ جمی ہے تو اس کی رنگت میں کشمیری شہدا کے خون کی لالی اندھے کو بھی نظر آجاتی ہے۔

بھارت نے ممبئی سانحے کے بعد حافظ محمد سعید کو ٹارگٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر دیکھی، ان پر سرجیکل اسٹرائیک کا منصوبہ بنایا گیا، بھارتی بمبار پاکستانی علاقے میں گھس آئے جنہیں ہمارے بہادر ہوابازوں نے

مار بھگایا۔ بھارت کو بتا دیا گیا تھا کہ اس نے کوئی حماقت کی تو اس کا جواب ایٹمی اسلحے کی زبان میں دیا جائے گا۔ بھارت کے دباؤ پر حافظ محمد سعید کو حوالہ زنداں بھی کیا گیا، ان پر مقدمہ بھی چلا مگر وہ باعزت بری ہوئے، اس لئے کہ سانحہ ممبئی خود بھارت کی کارستانی تھا۔ حافظ سعید یا پاکستان کے ملوث ہونے کا کوئی ایک بھی ثبوت پیش نہ کیا جا سکا۔ حافظ سعید کو ممبئی میں خون بہانے سے دلچسپی بھی کیا ہو سکتی تھی، یہ تو محض ایک بھارتی ڈرامہ تھا تا کہ حافظ سعید، آئی ایس آئی اور پاکستان کو بدنام کیا جا سکے۔ مگر بھارت کو منہ کی کھانا پڑی، اب وہ کنٹرول لائن پر جھڑپوں کی خبریں اچھال رہا ہے، اس کا الزام ہے کہ مجاہدین کارروائیاں کرنے میں مصروف ہیں، اور یہ دعوی خود بھارت کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اس کی فوج، مجاہدین کا راستہ روکنے سے قاصر ہے۔

کیا حافظ محمد سعید کبھی تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے، اگر بھارتی فوج درندگی جاری رکھتی ہے تو خود بھارت کو بھی یقین ہے کہ حافظ سعید جہاد کے رستے سے نہیں ہٹ سکتے، وہ بہر صورت محکوم کشمیروں کی مدد کے لئے سرگرم عمل رہیں گے، اس طرح کشمیر پر بھارتی قبضے کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ اگر بھارت کشمیر پر بزور طاقت قبضہ جمانے کے منصوبے پر عمل پیرا رہتا ہے تو اس کے ناجائز قبضے کے خاتمے کے لئے بھی طاقت کا استعمال نہیں رک سکتا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں۔

کیا حافظ سعید کو راستے سے ہٹانا ممکن ہے، خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو جہاد کشمیر کا مستقبل کیا ہو گا۔ بھارت کو شبہہ ہے کہ حافظ سعید کے جسم سے نکلنے والے خون کے ہر قطرے سے ایک نیا حافظ سعید جنم لے گا، اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ ایک ڈراؤنا خواب بن جائے گا۔

اور واہگہ کے پکے بارڈر سے چوبیس گھنٹے ٹرکوں کے قافلے آتے جاتے رہیں گے تو کچے دھاگے جیسی کنٹرول لائن پر مجاہدین کے کفن بدوش قافلوں کو کون روک ٹوک سکے گا، خرم دستگیر نے کچھ اس بارے بھی سوچا ہو گا۔ کاروبار کے وزیر کو نفع نقصان کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ (20 جنوری 2014)

گیاری کے شہدا کو سلام

سلام گیاری کے شہدا کے لیئے

جنرل کیانی جاتے جاتے قوم کو رلا کیوں رہے ہیں

ہم تو گیاری کے سانحے کو بھول گئے تھے

نہیں ہم رو نہیں رہے، ہمارا تو سینہ فخر سے تن گیا ہے

ہماری آنکھوں سے بہنے والے آنسو ہمارے چوڑے چکلے سینوں پر موتیوں کی طرح جھلملا رہے ہیں، شجاعت کے تمغوں کی طرح دمک رہے ہیں۔

جنرل کیانی نے جاتے جاتے قوم کی جھولی اس احساس تفاخر سے بھر دی ہے۔

گیاری کے شہدا کا یہ نغمہ ہمارے قلب و ذہن کو نئے جذبوں سے معمور کر رہا ہے۔

ہم سرد ہوا کے باسی ہیں

ہم شہید بھی ہیں، غازی بھی ہیں

ہم چھوڑ گئے، دم توڑ گئے

ہم برف کی چادر اوڑھ گئے

ہم بیٹے، باپ اور بھائی بھی

منا، انکل، ماہی بھی

ہم کرنل، کیپٹن، میجر بھی

حوالدار، نائک، سپاہی بھی

بابا کی آنکھ کے تارے بھی

ہم ماں کے راج دلارے بھی
جب برف سے اٹھائے جائیں گے
ہم جلد ہی ملنے آئیں گے

یہ جذبات ہیں ننھی مریم تنویر کے جن کے عظیم والد لیفٹننٹ کرنل تنویر الحسن گیاری سیکٹر میں نمبر چھ لائٹ انفنٹری بٹالین کی قیادت کرتے ہوئے 140 جانبازوں کے ساتھ سات اپریل دو ہزار بارہ کو ایک مہیب برفانی تودے تلے دب کر شہادت سے سرفراز ہو گئے تھے۔

شہادتوں کا سفر بدر کے پتھریلے میدان سے شروع ہوا اور کربلا کی پیاسی زمین سے ہوتا ہوا یہ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع گیاری میں ابھی تمام نہیں ہوا۔

سال سوا سال قبل یہ سانحہ رونما ہوا تو کسی کو امید نہ تھی کہ ان شہدا کے جسد خاکی، کی تلاش کا خیال انسانی ذہن میں بھی آ سکتا ہے، گلیشیئر ایک میل چوڑا اور کئی سو فٹ گہرا تھا اور سفاک ترین ہوائیں کسی کا قدم ٹکنے نہیں دیتی تھیں، پہلا بلڈوزر وہاں پہنچا تو برفانی تودے کے سامنے اس کی مثال ماچس کی ڈبیا کی سی تھی، دنیا بھر کے ماہرین نے مایوسی کا اظہار کیا مگر جس باپ کے بچے ہزاروں ٹن وزنی برفانی پتھر کے نیچے دبے ہوں، اس کو کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ یہ غم زدہ باپ جنرل کیانی تھا جس کا چہرہ بظاہر کسی احساس سے عاری دکھائی دیتا ہے اور جس کی آواز انسانی گلے سے نکلنے کے بجائے کسی روبوٹ کی مشینی آواز سے مشابہت رکھتی ہے، مگر وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا، بکھر چکا تھا، اسے اپنے فوجی کیریر کا مشکل ترین چیلنج درپیش تھا، میدان جنگ میں شہید کے جسد خاکی کو واپس لانے کے لیئے کئی جانیں قربان کر دی جاتی ہیں، جنرل کیانی نے بظاہر ایک ناممکن العمل عزم کا اظہار کیا کہ ہر شہید کو تلاش کریں گے، اسے احترام اور وقار کے ساتھ اس کے عزیزوں کی آنکھوں کے سامنے سپرد خاک کریں گے، اس میں وقت لگے گا، مگر ہم یہ کام مکمل کر کے چھوڑیں گے، گزشتہ روز انہوں نے ایک پروقار تقریب میں اعلان کیا کہ اب تک 133 جانبازوں کو تلاش کیا جا چکا ہے، صرف سات شہید باقی ہیں اور ان کی تلاش تک پاک فوج چین سے نہیں بیٹھے گی۔

گیاری سیکٹر، سیاچین کا ایک محاذ ہے جہاں 1984 کے موسم بہار میں بھارتی فوج نے جارحیت کر کے چوروں کی طرح قبضہ جما لیا تھا۔ پاک فوج ہر سال کی طرح اس بار بھی برفباری کے طوفانی موسم میں نیچے اتر

آئی تھی اور بھارت نے اس خلا کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔عوامی تنقید سے بچنے کے لیئے اس وقت جنرل ضیا الحق نے کہا تھا کہ سیاچین میں تو گھاس تک نہیں اگتی۔ بھارت سیاچین میں کیوں آیا،اس سوال کا جواب اسی سے پوچھا جانا چاہیئے، مجھے ایک مرتبہ جنرل بختیار رانا نے بتایا تھا کہ بھارت وہاں سے شاہراہ ریشم کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے،کسی کا کہنا ہے کہ وہ ان بلندیوں پر حاوی ہو کر گلگت بلتستان کو ہتھیانا چاہتا ہے،کوئی کہتا ہے کہ بھارت آگے بڑھ کر چین اور پاکستان کا زمینی راستہ منقطع کرنا چاہتا ہے،موجودہ وزیراعظم خواب دیکھ رہے ہیں کہ وہ شاہراہ ریشم کو ایک وسیع تجارتی راہداری میں بدل دیں گے لیکن سیاچین پر بیٹھا ہوا بھارت انہیں اس امر کی اجازت دے گا،اس کا جواب کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، بھارت کے اب تک کے طرز عمل کے پیش نظر اس کی عداوت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

گزشتہ برس گیاری کا سانحہ رونما ہوا تو میاں نواز شریف نے کہا تھا کہ اس بلند و بالا مقام پر فوجیں بٹھانے کی کیا ضرورت ہے، پاکستان کو اپنی فوج یک طرفہ طور پر واپس بلا لینی چاہیئے ،اس سے قبل کہ حکومت یا فوج کی طرف سے کوئی ردعمل آتا، بھارتی فوج کے سربراہ نے کہا کہ پاکستان اپنی فوج ہٹا بھی لے تو بھارت وہیں موجود رہے گا۔آج میاں نواز شریف ملک کے وزیراعظم اور سپریم کمانڈر کا درجہ رکھتے ہیں، وہ سیاچین کا جو بھی فیصلہ کریں،انہیں اس وقت تک کا انتظار کرنا چاہیئے جب تک گیاری سے باقی سات شہدا کے جسد خاکی تلاش کر کے ان کے ورثا کے سپرد نہیں کر دیئے جاتے، وزیراعظم کسی عجلت کا مظاہرہ نہ کریں اور سات شہیدوں کو بھارت کے سامنے سرینڈر نہ کریں۔

جنرل کیانی نے ڈبڈبائی آنکھوں اور گلوگیر لہجے میں یاد دلایا ہے کہ جو قومیں اپنے شہدا کی قربانیوں کو یاد رکھتی ہیں، وہی ہمیشہ زندہ و توانا رہتی ہیں۔(4 اکتوبر 2013ء)

بلند ترین مقام شہادت

میرا قلم اس لمحے سے منجمد ہے جب ہفتے کو میں نے انٹرنیٹ پر وہ روح فرسا خبر پڑھی جو اگلے روز کے اخبارات کی شہ سرخی بن کر پوری دنیا کو غمزدہ کر گئی۔ اسی فٹ اونچی اور ایک کلومیٹر چوڑی برفانی قبر کی ڈھیری میں ہمارے ڈیڑھ سو کے قریب جوان اور افسر زندہ دفن ہو کر رہ گئے۔ کاش! آج کوئی صفدر میر ہوتا اور کاش! آج لاہور کی مال روڈ پر جلوس نکالنے کی ممانعت نہ ہوتی تو صفدر میر شہیدوں کا شاہنامہ گاتا:

میں پھر جلایا جاؤں، میں پھر شہید ہوں

میں پھر جلایا جاؤں، میں پھر شہید ہوں

میں پھر جلایا جاؤں، میں پھر شہید ہوں

کاش! ان ایک سو پچاس کے بجائے میں اکیلا اس برفانی ڈھیری میں دفن ہو جاتا۔

میں بار بار زندہ کیا جاتا اور بار بار شہادت کے مرتبے پر سرفراز ہوتا۔

میں بار بار زندہ کیا جاتا اور بار بار شہادت کے مرتبے پر سرفراز ہوتا

میں بار بار زندہ کیا جاتا اور بار بار شہادت کے مرتبے پر سرفراز ہوتا

سیاچین کا میدان جنگ آج تک کی انسانی تاریخ میں بلند ترین میدان جنگ ہے، بڑے بھولے ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ یہاں دشمن فوج کے بجائے موسم سب سے بڑا دشمن ہے، یہ بھولے لوگ نہیں جانتے کہ جو دفاع وطن کے راستے پر چلا، وہ کسی وجہ سے بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، وہ شہید ہے اور شہید امر ہوتے ہیں۔ وہ زندہ ہیں، مگر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ سیاچین کی جنگ کو جو بے مقصد قرار دیتے ہیں، وہ بھی بڑے بھولے ہیں۔ وہ بھارت سے پوچھیں کہ اس نے 1984 میں اس گلیشیئر پر کیوں قبضہ کیا تھا، کیا وہ پکنک منانے آئے تھے اور کیا قائد پوسٹ پر قبضے کے لیئے تین عشروں سے زائد عرصے سے جو جنگ جاری ہے، وہ بے مقصد

ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے ضرور کہا تھا کہ یہ ایسا علاقہ ہے جہاں گھاس تک نہیں اگتی۔ کاش! جنرل ضیاء الحق یہ بھی واضح کر دیتے کہ یہاں جنگلی گلاب کیسے کھلتے ہیں۔ اور اب تو یہ گلیشئر بہت سے خون سے سینچا جا چکا، یہ بے مقصد کیسے ہو گیا۔ کیا ہم بھارت کو حق دے دیں کہ وہ سیاچین پر کنٹرول حاصل کر کے شاہراہ قراقرم کو دبوچ لے اور دریائے سندھ کا پانی بھی ہمارے حلق سے نوچ لے جائے۔ ارض وطن کا چپہ چپہ مقدس ہے اور اس کی حفاظت اور دفاع ہمارا اولیں فریضہ۔ برکی کے پل پر سینہ تانے میجر عزیز بھٹی نے بھارتی ٹینکوں کی پیش قدمی روکنے کے لیئے فائر آرڈر دیا اور جان، جان آفریں کے سپرد کر دی، سوار محمد حسین شہید نے دشمن کے بکتر بند ڈویژن کو جی ٹی روڈ کی طرف بڑھنے سے روکا اور شہادت پائی، لالک جان نے کارگل کی بلندیوں پر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ یہ نشان حیدر تھے، اور پاکستان کے ماتھے کے جھومر۔ انہی شہیدوں کے ایک معصوم بیٹے نے لائیو کیمروں کے سامنے کہا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ابو کی طرح شہید بنے گا۔ میں اس لاڈلے کو دیکھنے گیا تو مجھے یوں لگا کہ اس کا گھر زمین سے عرش تک نور کے ہالے کی لپیٹ میں ہے۔ اور فرشتے قطار اندر قطار حمد و ثناء کا ورد کر رہے ہیں۔ وہاں موت نہیں، زندگی تھی۔ ایسی موت پر لاکھوں زندگیاں قربان۔

سیاچین میں بھارتی فوج نے جارحیت کی، اس کا جواب کئی برس بعد کارگل میں ہمارے مجاہدین نے دیا۔ مگر کارگل کے شہدا کا مذاق اڑایا گیا، کسی نے کہا کہ انہیں گھاس کھا کر گزارا کرنا پڑا۔ ایسے فقرے وہ لوگ چست کرتے ہیں جن کے دستر خوان شہنشاہوں کی طرح سجتے ہیں۔ وہ بھول گئے کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ خندق کھودتے ہوئے بھوک کے پیٹ پر پتھر باندھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اور سیاچین کے شہیدوں پر آوازے کسنے والے بھی کم نہیں۔ وہ ایک طرف شہدا کا رزم نامہ لکھتے ہیں اور دوسرے سانس میں ان جرنیلوں کو کوستے ہیں جنہوں نے ملک میں مارشل لا کا جبر مسلط رکھا۔ اور قوم کو فوج سے متنفر کر دیا، کیا گھر میں جب کسی عزیز کی میت رکھی ہو تو اس کی برائیاں یاد کرتے ہو، اگر نہیں تو ایک سو پچاس بے گور و کفن اور بے جنازہ شہیدوں کے تذکرے کے ساتھ ایوب خان، یحیٰی خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کا طعنہ ان شہیدوں کو کیوں دیتے ہو۔ بڑے فخر سے بتایا جاتا ہے کہ وہ فوجی ہیلی کاپٹروں میں سیاچین گئے تھے مگر ساتھ ہی فوج پر لعن طعن کرنے کا موقع بھی ضائع نہیں کرتے۔ وہ جرنیلوں کی زبان سے اپنے لیئے تعریفی کلمات کے ذکر پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں اور جرنیلوں کی بداعمالیوں کو اچھالنے کی کوئی کسر بھی نہیں چھوڑتے۔ مجھے کوئی بتائے کہ 3 دسمبر 1971ء کی سہ پہر کو جب قصر ہند پر ہلہ بولنے کے لیئے کرنل غلام

حسین نے نو مین لینڈ عبور کی تو سامنے پہلے ہی بھارتی مورچے میں نصب وکرس مشین گن کی ایک باڑھ نے ان کے فولادی ہلمٹ کو چھید ڈالا تھا تو ان کے سر سے خون کا ایک فوارہ بہ نکلا تھا، اس خون کی حرمت کو سلام، اس کے تقدس کو سلام! مگر اس بہنے والے خون کا ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جنرل نیازی کے سرنڈر میں کیا قصور۔ اور سیاچین کی بلندیوں پر اب تک شہید ہونے والے ہزاروں فوجی جوانوں اور افسروں کا کیا قصور کہ مشرف نے عدلیہ کو برطرف کر دیا تھا۔ خدا جانے شہدا کا ذکر کرتے ہوئے مارشل لائی جرنیلوں کا تذکرہ کیوں چھیڑا جاتا ہے۔ خدا کی قسم! ان شہدا کے خون کے ایک ایک قطرے کے صدقے ہم آزادی کی نعمت سے سرفراز ہیں۔ ہمارے چاروں طرف ساری چہل پہل انہی شہدا کی مرہون منت ہے۔ شہدا کا یہ قافلہ بدر و خندق اور کربلا کے شہیدوں کی کہکشاں کا حصہ ہے۔ یہ اندھیروں میں ہمارے لیئے روشنی بکھیرتا ہے، ناامیدی میں ہماری آس بنتا ہے۔ اور ہم بھٹکنے لگتے ہیں تو ہمارے بازو تھام کر ہمیں منزل سے ہمکنار کرتا ہے۔ سیاچین کا قضیہ کشمیر سے منسلک ہے۔ کنٹرول لائن کی برجیاں اس علاقے میں کبھی نصب نہیں کی گئیں، آخری برجی سے آگے جانا انسانی بس میں نہیں تھا، بس یہ سمجھ لیا گیا کہ آخری برجی کی سیدھ میں کنٹرول لائن آگے جاتی ہے، اس سیدھ کے مطابق سیاچین کا علاقہ ہمیشہ پاکستانی کنٹرول میں رہا۔ 1983 کے موسم سرما کے آغاز تک پاکستانی فوج ہی اس علاقے میں گشت کرتی رہی، اگلے برس ہماری فوج اس علاقے کی طرف بڑھی تو سامنے سے فائر آ گیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ بھارت نے ہماری غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ بھارتی فوج بلندی پر تھی اور ہم نشیب میں، چنانچہ ہمیشہ ہمارا جانی نقصان ہوتا رہا لیکن ہم دشمن کو آگے نہیں بڑھنے دے سکتے تھے اس لیئے دفاع میں ڈٹ جانا ہماری مجبوری تھی۔ ہمارے جوان یہ مشکل فریضہ آج بھی ادا کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو ساتھیوں کے برفانی ڈھیری میں دبنے کے باوجود ہمارا ہر فوجی جوان اور افسر باقی ماندہ علاقے میں مکمل چوکسی سے پہرہ دے رہا ہے، ان پہریداروں کو سلام عجز و نیاز اور یہ دعا کہ خدا کرے، برفانی ڈھیری سے ہم اپنے پیاروں کو زندہ سلامت نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ (10 اپریل 2013ء)

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

جی ایچ کیو میں شہید یادگار کے سامنے وزیراعظم سر جھکائے کھڑے تھے، مجھے ان کا قد آسمانوں کی رفعتوں کو چھوتا محسوس ہوا۔ شہیدوں کی روحیں سرشار تھیں اور شہیدوں کے لواحقین کے سینے فخر سے اور چوڑے ہو گئے۔

مجھے اندازہ ہے کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی فوج کو اپنے بچوں کی طرح خیال کرتے ہیں۔ اور شہیدوں کے ساتھ ان کی عقیدت کے سرچشمے قرون اولی کی تاریخ سے پھوٹتے ہیں۔ بدر واحد کے شہید اور کربلا کے شہید، ان کی روح کو تڑپاتے ہیں۔ میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ جنرل کیانی نے اپنے کیریئر کی آخری مصروفیت لاہور کے لئے وقف کر چھوڑی ہے جہاں وہ ڈی ایچ اے کے شہید سیکٹر کا افتتاح کریں گے۔ شہدا کے لواحقین کو وہ لاوارث، بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہتے، ان کے لئے اسی ماحول اور فضا میں گھر بنیں گے جس میں کروڑ پتی امرار ہائش پذیر ہیں، جنرل کیانی جانتے ہیں کہ شہیدوں کے وارث ہی تو اس زمین کے اصل وارث ہیں۔ دنیا کے بلند ترین میدان جنگ گیاری میں فوجی افسر اور جوان ایک برفانی گلیشیئر کے تلے دب گئے، جنرل کیانی اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک ان شہدا کو برف کے پہاڑ تلے سے نکال کر ان کے ورثاء کی آنکھوں کے سامنے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن نہیں کر دیا گیا، چند شہیدوں کی تلاش کا کام باقی ہے، جنرل کیانی کے سینے پر یہ ہمیشہ کے لئے ایک بوجھ بنا رہے گا مگر یقین سے کہتا ہوں کہ ان کا کوئی بھی جانشین ان نفوس قدسیہ کی تلاش سے پہلے کسی اور کام میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ وہ جنرل راشد ہوں یا جنرل راحیل۔

احد کے شہید نے تو سید الشہدا کا لقب پایا اور پیغمبر خدا ﷺ جو اپنے جگر گوشے کی موت پر نہیں روئے، اس روز مدینہ میں اپنے گھر میں دلفگار بیٹھے تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کوئی ہے جو مجھے امیر حمزہ رضی اللہ

تعالی عنہ کا پرسا دے۔اس شہید کے جسم پر زخموں کی گنتی حدوشمار سے باہر تھی اور دشمن نے ان کا کلیجہ کچا چبالیا تھا۔اور کربلا کے شہیدوں کی تو بات ہی اور ہے، وہ نوجوانان جنت کے سردار کہلاتے ہیں اور امت مسلمہ رہتی دنیا تک ان کے ماتم میں ڈوبی رہے گی تو پھر بھی اپنے دل کا غم ہلکا نہیں کر پائے گی۔

میں ان شہیدوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو کھیم کرن کے محاذ سے لائے گئے تھے اور جنہیں قصور بس اڈہ کے کنارے امانت کے طور پر دفن کیا جارہا تھا، یہ چھ ستمبر پینسٹھ کے بعد کے دنوں کی بات ہے۔میں ان کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، اور دیکھتا رہا۔بس ان کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے تھے، مگر ان کی وردیوں پر کوئی سلوٹ تک نہ تھی اور وہ محوخواب تھے اور ان کو میری طرح دیکھنے والے اس خاموشی سے دیکھ رہے تھے کہ سانس تک لینے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، مبادا کسی آہٹ پر شہیدوں کے آرام میں خلل واقع ہو جائے۔

مجھے وہ شہید بھی نہیں بھولتا جس کو ایک فوجی ٹرک گنڈا سنگھ والا کی سرحد کی طرف سے لا رہا تھا۔میں سائیکل پر سوار تھا، ٹرک سے بھینی بھینی حیات بخش خوشبو آرہی تھی، میں نے اپنی جوانی کو آزمایا اور جس تیزی سے ہوسکا ،سائیکل کے پیڈل چلانے لگا، میں اس سوندھی بو باس کو اپنی روح میں جذب کر لینا چاہتا تھا مگر ٹرک کی رفتار تیز تھی، ساری زندگی مجھے یہ مایوسی لاحق رہے گی کہ میں اس ٹرک سے پیچھے کیوں رہ گیا۔

اکہتر کی جنگ میں میں تھری پنجاب کے ایڈوانس ہیڈ کوارٹر میں پہنچا، ایک رائفل کی سنگین پر ہیلمٹ لٹکا ہوا تھا اور اس ہیلمٹ میں درجنوں چھید تھے، یہ ہیلمٹ بٹالین کمانڈر کرنل غلام حسین کا تھا جنہوں نے دفاعی جنگ میں پیچھے بیٹھے رہنے کے بجائے اپنے بچوں کا ساتھ دیا، وہ سب سے آگے تھے اور دشمن کے مورچوں میں نصب مشین گن کی باڑھ نے ان کے سر کو چھید ڈالا۔میں آج بھی دعا کرتا ہوں کہ اے کاش، اس ہیلمٹ کے اندر میرا سر ہوتا۔لیکن اس ہیلمٹ کی تصویر میں نے سینے سے لگا رکھی ہے، کسی نے شہید کا رتبہ دیکھنا ہو تو میرے پاس آئے، اور دیکھے کہ شہادت کی قیمت کیا ہے۔

اس بہادر کرنل کو ہلال جرات سے نوازا گیا، کبھی نیا چاند طلوع ہو تو اس کی سفید نوکوں پر شہید کرنل غلام حسین ہلال جرات کے خون کی پھوار دیکھی جاسکتی ہے۔گنڈا سنگھ والا بارڈر کو کرنل غلام حسین شہید کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، ہر صبح شام وہاں قومی پرچم لہرنے اور اتارنے کی تقریب ہوتی ہے جسے دیکھ کر ہزاروں لوگوں کے دل دھڑکتے ہیں۔اور شہید کرنل کی روح اس پر کیف منظر سے سرشار ہو کر جھوم اٹھتی ہے۔

میں نے روح کا لفظ کیوں لکھ دیا۔شہید تو زندہ ہوتے ہیں۔انہیں مردہ مت کہو، تمہیں ان کی زندگی کی سمجھ

ہی نہیں۔اور ہم اس قوم کے فرد ہیں جسے شہید کے منصب و مرتبے کا احساس نہیں، کوئی کتے کو شہید کہہ رہا ہے، کوئی درندے کو شہید کے مرتبے پر فائز کرنے کے لئے مصر ہے۔ یہ شہیدوں کے ساتھ مذاق ہے۔ بھونڈا مذاق۔ میں مشکور ہوں اپنے وزیر اعظم کا جنہوں نے شہیدوں کی لاج رکھ لی، ورنہ اس قوم میں ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا اور جو کوئی تھا، اسے فضل الرحمٰن اور منور حسن فتووں کی مار دے رہے تھے۔

اور شکریہ جناب وزیر اطلاعات! مجھے آپ سے ان کلمات کی توقع نہ تھی۔اپنی اس کم فہمی اور کج فہمی کی معافی بھی چاہتا ہوں۔ جناب پرویز رشید نے اس بحث کو مسل کر رکھ دیا جو جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے کھڑی کر رکھی تھی۔ وزیر اطلاعات نے یہ کہہ کر اپنے منصب کا حق ادا کر دیا ہے کہ آئی ایس پی آر کی پریس ریلیز ملکی سیاست میں مداخلت نہیں بلکہ قوم کے دل کی آواز ہے۔

اور جناب وزیر اعظم نے چھ ستمبر پینسٹھ کے روشن اور اجلے دنوں کی یاد تازہ کر دی، انہوں نے کہا کہ شہید اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ وہ قوم کے محسن ہیں۔ پاکستانی قوم ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وزیر اعظم پہلی بار حکومت میں نہیں آئے، وہ سابقہ ادوار میں کئی ملکوں کے سفر پہ جا چکے ہیں، ہر ملک اپنے معزز مہمان کو سب سے پہلے گمنام شہید کی یادگار پر لے جاتا ہے۔ واشنگٹن میں وار میموریل پر ہر سیاح سرنگوں کھڑا ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش والوں نے تو شہید مینار کھڑا کر رکھا ہے اور یہ ہمارے حکمرانوں کی بد قسمتی ہے کہ انہیں اس یادگار پر پھول چڑھانے پڑتے ہیں۔

پاکستان کے شہیدوں کی یادگار رباب پاکستان ہنوز تشنہ تکمیل ہے۔ یہاں لاکھوں لٹے پٹے مہاجرین آئے جن کے پیارے پاک سرزمین تک پہنچنے کے سفر میں سنگینوں سے چھلنی کر دیئے گئے تھے، نوجوان بیٹیوں اور ماؤں بہنوں نے عصمتوں کی قربانی دی تھی۔ شہیدوں کے خون پر تعمیر ہونے والا پاکستان اپنے شہدا پر ہمیشہ نازاں رہے گا۔ ان کے خون کی حدت ہمیں نئی زندگی عطا کرتی رہے گی، ہماری منزلوں کو اجالتی رہے گی۔

(13 نومبر 2013ء)

میں انتظار کروں گا.....!

اتوار کی سہ پہر کو میں لاہور کینٹ کے ایک مکان میں داخل ہوا۔ جن صاحب سے مجھے ملنا تھا وہ اس وقت گھر سے باہر تھے۔ ایک ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا یہ کس کا گھر ہے۔ میں صرف ایک فون کال پر یہاں آ گیا تھا۔ کوئی صاحب مجھ سے ملنے کے خواہاں تھے۔ میں نے کہا تھا آپ کیوں تکلیف کریں گے، میں خود حاضر ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر بعد کمرے میں کسی موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے زمین سے آسمان تک اور اس سے بھی پرے عرش تک ایک نور کا ہالہ ہے۔ اس الوہی روشنی کو دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ میں نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے بولنے کی کوشش کی لیکن نور کے اس ہالے کے سامنے میری قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔

پھر باہر سے وہ صاحب آ گئے جن سے میں نے ملنا تھا۔ ابھی رسمی تعارف آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ ایک معصوم بچہ دنیا جہان کی محبتیں سمیٹے میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ شاید وہ مجھے دکھانے لایا تھا۔ غیر محسوس طور پر میرے اندر اپنائیت کا ایک چشمہ پھوٹا، بچہ مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ اب میرا ذہن کچھ کچھ کام کرنے لگا تھا۔ ایک چھوٹی فرشتہ سیرت بچی بھی میری گود میں بیٹھ گئی تھی۔ میری آنکھیں جھکتی گئیں، میں نے اپنے میزبان سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا، کیا یہ وہی بچہ نہیں جس نے ٹی وی پروگرام میں سوال کے جواب میں کہا تھا ''انکل میں بڑا ہو کر شہید بنوں گا''۔

میرے میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ ''یہ میرے نواسے ہیں اور کارگل کے شہید میجر محمد علی حیدری کی نشانی'' بچے اسی اثناء میں اندر چلے گئے۔ وہ اپنی امی کے ساتھ راولپنڈی کے لئے روانہ ہونے والے تھے جہاں ان کے شہید والد اور کارگل کے دوسرے شہداء کے ورثاء کو شجاعت کے تمغے عطا کرنے کی تقریب ہونے والی تھی۔ میزبان نے مجھے کسی گہری سوچ میں غرق دیکھ کر کہا'' آپ نے ان بچوں پر ایک کالم

لکھا تھا۔

افسوس کی بات ہے کہ کارگل کے شہیدوں کے خون کی اس دیوار کو پامال کرنے کی کوشش کی گئی۔

اوراب ایک ردعمل ملاحظہ ہو۔ چند روز قبل میرے کالم میں ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ میرا انتظار کرنا۔ یہ ایک دلگداز جذباتی شہکار تھا۔ آج کی ڈاک میں فیصل آباد سے محترمہ فاطمہ جلال نے مجھے جوابی نظم ارسال کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

میں انتظار کرتی ہوں

تم نے لکھا تھا

انتظار مت کرنا

ہاں

میں انتظار کرتی ہوں

سرخ پھولوں سے پیار کرتی ہوں

خون دامن پہ جو تیرے بکھرا

زخم ماتھے پہ جو ترے چمکا

سارے زخموں کے اس گلستان میں

میں اکیلی نہیں، نہیں ہوں جان جہاں

اس گلستان کے سارے پھولوں کو

اپنے ہاتھوں سے روز چنتی ہوں

صبح کاذب کے شبنمی آنسو

میری آنکھوں کا ہار بنتے ہیں

تیری چاہت کا پیار بنتے ہیں

میرے احساس کے سمندر میں

خاکی وردی کے کھردرے سائے

اک تفاخر سے مسکراتے ہیں

اور میں

نور کی ردا اوڑھے

آج بھی انتظار کرتی ہوں

ہاں

اے شہیدان وطن

ہاں

میں تیرا انتظار کرتی ہوں

(22 اکتوبر 1999ء)

ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے!

کارگل کے شہیدو!

یہ دنیا کا انوکھا واقعہ تھا کہ تمہارے سروں پر بھارت کے میراج طیاروں نے دو ہزار پونڈ وزنی بم گرائے۔ تمہارے نور نور بدنوں کے چیتھڑے آسمانوں کی رفعتوں میں بکھر گئے، مگر تمہارے جسموں سے لہو کے فوارے نہ پھوٹے۔ تمہارا لہو زخموں سے رس ہی نہ سکا کہ اٹھارہ بیس ہزار فٹ کی منجمد بلندیوں پر کوئی بھی مائع شے آناً فاناً برف کی طرح جم جاتی ہے، لیکن یہ بھی تاریخ کا انوکھا واقعہ تھا کہ تمہاری پشت پر قوم کے جذبے بھی منجمد اور سرد ہو گئے۔ اس قوم نے تمہاری قربانیوں کو یوں بھلا دیا جیسے کچھ ہوا نہیں اور قوم کی قیادت نے تو تمہارے لہو کو بیچنے کی کوشش کی۔ نواز شریف بھاگم بھاگ واشنگٹن پہنچا اور تمہاری بیش بہا قربانیوں کو ایک اعلامیے کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

میں مانتا ہوں غریب، بے بس اور لاچار لوگ بھوک افلاس، بیروزگاری سے تنگ آ کر خودکشیاں کر رہے تھے۔

میں مانتا ہوں کہ پوری قوم زندہ درگور تھی۔ بجلی، پانی، گیس فون کے بلوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ جان و مال کو شدید عدم تحفظ لاحق تھا اور اب تو لوگ مولی گاجر کی طرح کٹ رہے تھے۔

میں مانتا ہوں کہ ظلم حد سے بڑھ گیا تھا۔ مخلوق خدا کا ناک میں دم آ چکا تھا۔

میں مانتا ہوں لوگ بلبلا اٹھے تھے اور جھولیاں عرش کی طرف پھیلا رہے تھے۔

لیکن اے میرے کارگل کے شہیدو!

تمہارے خون کی قسم! وہ خون جو فوارے کی طرح ابل نہ سکا، لیکن اس کی حدت نے فرش سے عرش تک سب کچھ ہلا کر رکھ دیا۔

عرش بریں کے مالک کے ہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں، تمہارے خون کی منجمد حدت نے آج اس اندھیر نگری کو بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔

چند روز قبل میں نے کارگل کے شہداء کے لواحقین اور فوج کے مورال کا کالم لکھا۔ میں نے یہ تحریر اپنے خون دل میں ڈبو کر لکھی تھی۔ نیو یارک، مشی گن، واشنگٹن، ایمسٹرڈیم، لندن، برمنگھم، گلاسگو، ایبرڈین، کراچی، حیدرآباد، کوئٹہ، میاں چنوں، پشاور، لاہور، پنڈی اور گوجرانوالہ سے فون کالوں کا تانتا بندھ گیا۔

پاک فوج کی تذلیل کی سازش کرنے والے خود ذلت اور رسوائی سے دوچار ہو گئے ہیں مسئلہ پاک فوج کا نہیں تھا ملک کی سلامتی کا تھا، قوم کے اقتدار اعلیٰ اور ملکی آزادی کا مسئلہ تھا۔

میں کارگل کے گھبرو جوان شہیدوں کو بصد عجز و نیاز سلام پیش کرتا ہوں، ان کا خون رائیگاں نہیں گیا، قوم ان کا خون رائیگاں نہیں جانے دے گی۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، میرے اندر ایک لاوا ہے جو پھٹنے کا راستہ تلاش کر رہا ہے لیکن میرے سامنے میری ایک بہن محترمہ ناہید انجم (لاہور) کا ایک خط پڑا ہے میں اسے پڑھ رہا ہوں اور آنسو ہیں کہ ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

اس خط میں کارگل کے ایک شہید کے جذبات کو نثری نظم کا پیکر دیا گیا ہے۔ آپ کے اندر ہمت ہے تو اسے پڑھئے اور پھر اپنے جذبات سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔

تم میرا انتظار ضرور کرنا

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا

جہاں بھر کی خوشیاں سمیٹے

میں واپس آؤں گا

تم میری منتظر رہنا

تم گلابی جوڑا پہن کر

سولہ سنگھار کر کے

بالوں میں پھول سجا کر

بانہوں میں کھنکتی چوڑیاں پہن کر

دھیرے دھیرے، ہولے ہولے
محبت کا کوئی گیت گنگنا کر
تم انتظار کرنا
میں قوس قزح کے سارے رنگ سمیٹے
بہار میں
بہار لیے ضرور آؤں گا
جاناں!
اب بہار آئی ہے
مگر ایسا نہیں ہوسکتا
دشمن نے میرے وطن کو للکارا ہے
مجھے سرحدوں نے بلایا ہے
تم میرا انتظار کرنا
میرے وطن کا قرض مجھ پہ باقی ہے
جس کا حساب مجھے چکانا ہے
تم میرا انتظار کرنا
میرا لہو میرے وطن کے کام آجائے
میری جان راہ خدا میں چلی جائے
تم میرے لیے یہ دعا کرنا
تم میرا انتظار کرنا
میں سبز ہلالی پرچم کا کفن پہنے
پھولوں کی ردا اوڑھے
آخری دیدار کیلئے
میرا تابوت تمہارے ہاں جب اترے

تم سجدہ شکر بجالانا

اپنی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ لانا

میری ماں مجھے دیکھ کر فخر سے یہ کہہ سکے

میرے لال تو نے

میرے دودھ کا حق ادا کر دیا ہے

مجھے جیتے جی خدا کے حضور سرخرو کر دیا ہے

جاناں!

یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے

تم دعا کرنا

میری یہ خواہش پوری ہو جائے

میرا خدا بھی مجھ سے خوش ہو جائے

میرا انتظار نہ کرنا

انتظار نہ کرنا

آنسوؤں کی برسات میں میری آنکھوں کے سامنے شہیدوں کے خون سے رنگین قوس قزح جھلملا رہی ہے، شہید مسکرا رہے ہیں، ان کی بیواؤ! ان کے یتیم بچو! خاطر جمع رکھو، شہیدوں کا خون سرخرو ٹھہرا ہے۔

(14 اکتوبر 1999ء)

کارگل کے نفوس قدسیہ کو سلام

وہ کیسے ملکوتی روشن چہرے ہونگے جو ہزاروں فٹ بلندی پر برفانی چوٹیوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

بھارت نے پیدل فوج، توپ خانے اور فضائیہ کے ذریعے ان منجمد چوٹیوں کو ہلا کر رکھ دیا، پگھلا کر رکھ دیا لیکن گوشت پوست کے باجبروت انسان آہنی عزم کے ساتھ سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئے ہیں۔ان کے نام سے کوئی آگاہ نہیں، لیکن وہ سب کے سب جہاد کے نشے سے سرشار ہیں، دشمن ان پر موت برسا رہا ہے لیکن موت ان مجاہدوں کے نورانی پیکر کو چھونے کی سکت نہیں رکھتی۔

مرتا وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہو، دور بھاگتا ہو، مجاہد تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا ہے، گرجتا ہے، موت ان کے الوہی، اٹل جذبوں کی تاب کیسے لاسکتی ہے۔

وہ سید الشہدا حضرت حمزہؓ، شہید کربلا حضرت امام حسینؓ، فاتح خیبر حضرت علی المرتضیٰؓ، قصر و کسریٰ کو لرزا دینے والے خالد بن ولیدؓ، فاتحین ہند محمد بن قاسم، ابدالی اور غوری کی روایات کے امین ہیں۔

دراس سے کارگل تک، بٹالک سے ترتوک تک جہاں خاموشی بھی منجمد ہو جاتی ہے، جہاد اسلامی کے یہ عظیم ہیرو شجاعت اور قربانی کی نئی داستانیں رقم کر رہے ہیں، ان کے پاک جسموں سے بہنے والا خون سالہا سال سے جمی ہوئی برف کو گرما رہا ہے اور یہ تپش اب ہمیں اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ مجاہدین کا یہ لشکر دنیا میں یکہ و تنہا رہ گیا ہے، جی 8، امریکہ، برطانیہ، ہزار باران کو کوستے رہیں لیکن جب تک ہم ایک قوم بن کر ان کے پیچھے کھڑے ہیں اور آسمانوں سے فرشتے قطار اندر قطار اتر کر ان کی مدد کو آرہے ہیں، اس وقت تک یہ یکہ و تنہا کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ مجاہدین اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر ان بلندیوں پر مورچہ زن نہیں ہوئے۔انہیں سری نگر فتح کر کے پلاٹوں کی الاٹمنٹ سے غرض نہیں، نہ ان کے باپ کو کسی نے مارا ہے کہ وہ انتقام پر اتر آئیں لیکن پچھلے دس

سال کے عرصے میں بھارت کی چھ لاکھ سے زائد غاصب فوج نے جس بہیمانہ طریقے سے ستر ہزار کشمیری مسلمانوں کا خون کیا ہے، عفت مآب کشمیری خواتین کی آبروریزی کی ہے، گھروں اور کھیتوں کو جلایا ہے اور آزادی کی تحریک کو راکھ کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے بعد رتی بھر اسلامی حمیت و غیرت کا مالک کوئی پاکستانی بھی ہمسائے کے طور پر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔

کارگل کے مٹھی بھر مجاہدین جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک فیصلہ کن عزم کے ساتھ بھارتی فوج سے ٹکرا گئے ہیں۔ دشمن ہر روز دعوے کرتا ہے کہ وہ ان چوٹیوں کو خالی کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے، لیکن ہر آنے والا دن بھارتی فوج کے شرمناک نقصانات کو الم نشرح کر دیتا ہے۔

1971ء کی سترہ روز جنگ میں بھارتی فوج کے صرف 83 فوجی مرے تھے اور 185 زخمی ہوئے تھے۔ لیکن آج کارگل دراس سیکٹر میں ایک ماہ کی لڑائی نے بھارت کے اعداد و شمار کے مطابق 207 لاشوں کا تحفہ دیا ہے اور 389 فوجی زخموں سے چور پڑے ہیں۔ لداخ کا شہر لیہہ ''تابوت ساز شہر'' کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ بھارتی فوجیوں کیلئے تابوت تیار کرنے کیلئے اس شہر میں لکڑی ختم ہو گئی ہے اور اب بوفورس توپوں کے گولوں کے ڈبوں کی ''پھٹیوں'' سے تابوت تیار کرنے کی نوبت آ گئی ہے۔

کشمیر کی کنٹرول لائن پر دراس، کارگل اور حاجی پیر کے علاقوں کا تذکرہ گزشتہ جنگوں میں دور افتادہ، غیر اہم علاقوں کی حیثیت سے ہوتا رہا ہے۔

65ء میں یہ علاقے بھارت کے قبضے میں چلے گئے، معاہدہ تاشقند ہوا تو دونوں ملکوں کی افواج بین الاقوامی سرحد اور سیز فائر لائن تک واپس جانے کی پابند قرار دی گئیں۔ سو یہ علاقے دوبارہ پاکستان کی تحویل میں آ گئے۔

71ء میں شملہ معاہدہ کے نتیجے میں سیز فائر لائن کا تقدس ختم کر دیا گیا اور کشمیر میں جو جہاں بیٹھا تھا، اسے کنٹرول لائن کا نام دیدیا گیا، اس طرح کارگل کا علاقہ بھارت نے ہتھیا لیا، لیکن اس علاقے کی بلندی کسی بھی فوج کی دفاعی صلاحیت کو مفلوج کر دیتی ہے۔

دراس شہر دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے، نیشنل ہائی وے الفاون Alpha One پر یہ شہر ایک قصبہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور سری نگر سے لداخ کے شہر لیہہ جانے والے چائے اور سگریٹ کیلئے یہاں دم بھر کو رکتے ہیں، اس شہر اور گردونواح کی کل آبادی دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے جو سردیوں میں منفی 60 سنٹی گریڈ

کے درجہ حرارت میں گھروں میں دبک جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔اس شہر کے بیچوں بیچ گزرنے والی نیشنل ہائی وے الفاون سیاچن میں بھارتی فوج کی سپلائی لائن کے کام آتی ہے۔

1984ء کے موسم بہار کے اوائل میں بھارت نے کنٹرول لائن کی پہلی بڑی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیاچن گلیشیئر پر قبضہ جما لیا، اس وقت سے اب تک دنیا کے اس بلند ترین میدان جنگ میں بھارت نے پاکستان کو الجھا رکھا ہے۔ یہ علاقہ بیس ہزار سے 26 ہزار فٹ بلند ہے۔اگرچہ یہ جنگ بھارت کیلئے بھی مہنگی ثابت ہو رہی ہے، لیکن پاکستان جیسا چھوٹا ملک اس جنگ کا معاشی دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں، مجاہدین نے برسوں کی تیاری کے بعد کارگل میں سیاچن کی شہ رگ پر ہاتھ رکھا ہے تو بھارت تلملا اٹھا ہے۔

کوئی اندازہ نہیں کہ مجاہدین، کارگل کی ان برف پوش چوٹیوں پر کب چڑھے۔ بھارت کا کہنا ہے کہ جنوری میں یہ کام کیا گیا، بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ اپریل کے اوائل میں مجاہدین نے یہ کارروائی کی، تاہم 12 اپریل کو بھارتی وزیر دفاع فرنینڈیس نے سیاچن کا دورہ کیا، تو اس وقت تک بھارت کے پاس کوئی ایسی اطلاع نہ تھی۔ مئی کے پہلے ہفتے میں بھارتی فوج اور مجاہدین کی پہلی مڈھ بھیڑ ہوئی، اس کے بعد سے مجاہدین نے دراس شہر کے مقابل بارہ ہزار فٹ بلند مورچوں سے بھارت کی فوجی نقل و حرکت کو روکنے کیلئے نیشنل ہائی وے الفاون کو گولہ باری کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ مئی کے آخر تک جھڑپوں میں تیزی آ گئی۔ بھارت نے واویلا کیا کہ آٹھ نو سو مجاہدین ان کے علاقے میں گھس آئے ہیں جنہیں ''ایک دو روز'' کے اندر نکال باہر کیا جائیگا، پھر کہا گیا کہ چند ہفتوں کی بات ہے۔اب ایک ماہ ہو چلا ہے، بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری اپنے عوام کو ذہنی طور پر ایک طویل جنگ کیلئے تیار کر رہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکیاں بھی آ رہی ہیں کہ لائن آف کنٹرول کو کہیں سے بھی پار کیا جا سکتا ہے۔اب حالت یہ ہے کہ سمبا، اکھنور، پونچھ، کپواڑہ کے روایتی سیکٹروں سے لے کر دراس کارگل، بٹالک، چھور بٹلا، ترتوک اور سیاچن تک جگہ جگہ محاذ کھل گئے ہیں، مئی کے وسط میں اس علاقے میں بھارت کی 20 ہزار فوج موجود تھی، اب اس میں 35 ہزار کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ گویا آٹھ نو سو مجاہدین سے نبرد آزما ہونے کیلئے پچاس ہزار سے زائد بھارتی فوج بوفورس توپوں، ملٹی بیرل گنوں، مارٹر توپوں، فیلڈ گنوں، ہیلی کاپٹروں مگ اور میراج طیاروں سے لیس کھڑی ہے۔

پچھلے چار روز سے بھارت نے جنگ کی سٹرٹیجی بدل دی ہے۔ دن کی روشنی میں بلندیوں پر حملہ آور ہونے کے نتیجے میں بھارت کے فوجی، بطخوں کی طرح نشانہ بن رہے تھے۔اس لیے اب رات کی تاریکی میں ہلہ بولا

جاتا ہے۔مجاہدین کے ٹھکانوں کی تصویر کشی کیلئے دن کو فضائیہ کے طیارے استعمال ہوتے ہیں مگ اور میراج طیاروں میں یہ فنی مہارت موجود ہے کہ وہ ریڈار کو جام کر دیتے ہیں، لیزر گائیڈڈ بموں کو اندھا کر دیتے ہیں، بھارتی طیاروں نے زہریلی گیس کے میزائل بھی استعمال کیے ہیں اور نیپام بم چلانے کا شوق بھی پورا کر لیا ہے۔

گزشتہ ہفتے بھارت نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے تو لولنگ کی چوکی پر قبضہ کر لیا ہے۔اس لڑائی کے پہلے چھ گھنٹوں میں بھارت نے 70 ہزار گولے برسائے تھے، بھارت کو 130 ایم ایم توپ کا ایک گولہ بارہ ہزار روپے میں پڑتا ہے اور بوفورس کا ایک گولہ 15 ہزار روپے سے 51 ہزار روپے میں پڑتا ہے۔ بھارت نے لڑائی کے پہلے ہفتے کے اختتام پر بوفورس کے گولے خریدنے کیلئے جنوبی افریقہ کا رخ کر لیا تھا۔ جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو بھارت نے بوفورس بنانے والے کارخانے پر عائد پابندیاں ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کو بوفورس کے پرزے اور دیگر گولہ بارود، اسلحہ کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹ سے خریدنے میں مشکل پیش آ رہی ہے، اب بوفورس سے براہ راست سودے میں اسے یہ چیزیں سستی مل سکیں گی۔

بھارت کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس کارگل سیکٹر میں سات ماہ کے گولہ بارود کا ذخیرہ ہے۔مغربی بنگال کی اسلحہ ساز فیکٹری کی پیداوار میں 500 گنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

بھارت پر ایک جنگی جنون طاری ہے۔ ہر روز نئی دھمکیاں سننے کو مل رہی ہیں اور گوشت پوست کے چند سو نفوس قدسیہ کارگل کی بلندیوں پر مورچہ زن ہیں۔ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں، ان کے عزائم ان چوٹیوں سے بھی بلند تر اور مضبوط تر ہیں، وہ آگ اور بارود کے طوفانوں میں ''یکہ وتنہا'' ڈٹے ہوئے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ نہ صرف یہ مجاہدین بھارت کے گھیرے میں ہیں بلکہ بھارت کی بہتر ڈپلومیسی کی وجہ سے پاکستان، سفارتی تنہائی کا شکار ہے۔خدانہ کرے پاکستان تنہا ہو، لیکن اگر ایسی نوبت آ بھی جائے تو میں اپنی شکستہ پائی کے باوجود کارگل کے ان مجاہدین کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کو تیار ہوں، میں کچھ اور نہ کر سکوں تو یہ تو میرے بس میں ہے کہ میں ان مجاہدین کے گرجتے عزائم کا مشاہدہ کروں اور اگر ان میں سے کوئی شہید ہو تو میں اس کے جسم سے بہنے والے خون کے پہلے قطرے کی حدت کو اپنی تحریر کے ذریعے اپنے قارئین تک

پہنچانے کی کوشش کروں۔

لوگو! ان غازیو، ان مجاہدوں، ان امر شہیدوں کو بھول نہ جانا، وہ اپنا آج آپ کے کل کیلئے قربان کر رہے ہیں، وہ ہماری ماؤں، بہنوں کی عزتوں کی رکھوالی کیلئے شہید ہو رہے ہیں، دنیا میں آج تک ایسے بلند ترین مقام پر کوئی جنگ نہیں لڑی گئی، بیسویں صدی کے اختتامی لمحات میں غازیان اسلام قراقرم کی سر بفلک برف پوش چوٹیوں پر عزیمت واستقامت اور جرات وشجاعت کی نئی داستان رقم کر رہے ہیں۔

سلام ہو ان غازیوں پر! سلام ہو ان امر شہیدوں پر!

ان کے زندہ اور تابدار جذبوں کو بوفورس کے گولے، مگ طیاروں کے دو ہزار پونڈ کے بم، غوری اور پرتھوی میزائل یا ایٹم بم بھی نہیں کچل سکتے۔ ہندو اگر حبیب پاک ﷺ کی امت کو ایک ہزار سال میں نہیں کچل سکا تو آنے والے ہزار سال میں بھی اسے خفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (3 اکتوبر 1999ء)

یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی!

لاہور میں پریس بریفنگ میں جب ایڈیٹروں نے بار بار یہ سوال کیا کہ کارگل کا منصوبہ کب بنا، کس نے بنایا، فارن آفس کو اس کی اطلاع کب دی گئی، وزیراعظم کو کس مرحلے پر آگاہ کیا گیا۔ حکومت نے قوم کو ابتدائی مرحلے پر اعتماد میں کیوں نہیں لیا، اپوزیشن کو اس طرح ساتھ کیوں نہیں کھڑا کیا گیا جس طرح ایوب خان نے 65ء کی جنگ کے دوران اور بھٹو نے شملہ جانے سے قبل اپنے اردگرد اس وقت کے جغادری اپوزیشن لیڈروں کو کھڑے دکھایا تھا، وزیراعظم رات کی تنہائی میں واشنگٹن کیوں گئے، جنگ بندی ہی چاہتے تھے تو چین کے کہنے پر کیوں نہ کر لی۔ کارگل کا آپریشن دنیا کا پہلا خفیہ جنگی آپریشن ہے نہ آخری، اگر اس طرح کے آپریشن کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے اسے الم نشرح کر دیا جائے تو پھر ایسے پلان پر دشمن علمدرآمد کیسے کرنے دے گا۔ جنرل رومیل اپنی چالوں اور جنرل منٹگمری اپنے جوابی منصوبوں کا اعلان سی این این یا بی بی سی یا کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ایڈیٹروں کی پریس بریفنگ میں کر دیتا تو پھر معرکہ آرائی کی نوبت نہ آتی۔

جنگ سے پہلے اس کی مارکیٹنگ نہیں کی جاتی جنگ لوہاری چوک میں گلدستے یا نئے نوٹوں کے ہار فروخت کرنے کا نام نہیں عراق کے صدر صدام حسین نے اپنی طاقت کا قبل از وقت ڈنکا بجایا تھا اس کا حشر پوری دنیا نے چند لمحوں میں دیکھ لیا۔ کویت سے اس کی فوجیں اس رفتار سے زیادہ تیزی سے واپس آ گئیں جس رفتار سے وہ اس نہتے ملک پر چڑھ دوڑی تھیں۔

یوں لگتا ہے لاہور کی پریس بریفنگ کو ناکام بنانے کا یقینی منصوبہ بنایا گیا دو تین اصحاب مسلسل بولتے رہے اور باقی دو درجن افراد جن میں مالکان اخبارات بھی تھے، مدیران کرام بھی تھے، سینئر کالم نویس بھی، وہ محض خاموش تماشائی بننے پر مجبور ہوئے۔ بریفنگ میں وہ بول رہے تھے جنہوں نے لکھنا نہیں ہوتا۔ مشاہد حسین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس طرح کی باتیں اداریوں میں کی جاتی ہیں اور لوگ جانتے ہیں کہ متعلقہ افراد

یہ باتیں وزیراعظم سے براہ راست بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے سوا جناب وزیراعظم تک کسی کی رسائی ہے نہ وہ کسی کے دروازے پر حاضری دینا ضروری خیال کرتے ہیں، تنہا میری رائے نہیں اس ملک کے ایک بڑے طبقے کی رائے ہے کہ اگر جناب وزیراعظم اپنی مشاورت کے کنویں سے باہر بھی جھانک سکیں اور اپنے دیگر چاہنے والوں یا نہ چاہنے والوں سے بھی میل جول رکھیں تو کم از کم اس طرح کی پریس بریفنگ میں ان کو یا ان کے ترجمانوں کو سرعام ٹارگٹ نہ بنایا جائے یا آف دی ریکارڈ گفتگو کو شہ سرخیوں میں نہ چھاپا جائے۔

لاہور کی بریفنگ میں درجنوں دیگر مالکان اخبارات، مدیران کرام اور کالم نویسوں کی رائے اور خواہش ہے کہ ان کیلئے ایسی بریفنگ کا اہتمام دوبارہ کیا جائے جس میں تیر و تفنگ چلانے یا طعن تشنیع کے بجائے باہمی تبادلہ خیال کیا جا سکے۔ وزارت خارجہ کے ترجمان جناب طارق الطاف بین الاقوامی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں جناب بریگیڈیئر راشد قریشی نقشوں اور چارٹوں کی مدد سے کارگل ایکشن کی لمحہ بہ لمحہ تفصیلات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور جناب مشاہد حسین سیاسی سطح پر ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے کے فن سے آشنا ہیں۔ اس لیے انہوں نے لاہور کی بریفنگ میں دو تین اصحاب کے تابڑ توڑ جملوں پر کہا تھا کہ صبر سے کام لیجئے، باری باری گفتگو کیجئے، دوسروں کو بھی بولنے کا موقع دیجئے، ہر سوال کا جواب دے کر اٹھیں گے۔ ''جب میں ہارڈ ٹاک ایسے سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں تو یہ سوال کیا چیز ہیں۔'' ان کے اس جملے کو اس طرح اچھالا گیا جیسے وہ سوال کرنے والوں کو کہہ رہے ہیں کہ وہ کیا چیز ہیں۔ یہ تاثر غلط تھا اور مشاہد حسین نے اس کی فوری وضاحت کی اور غلط فہمی پیدا ہونے کو روکنے کیلئے اس جملے پر معذرت بھی کی لیکن جب نیچا دکھانا ہی مقصود ہو تو کوئی سیاق و سباق ملحوظ رکھتا ہے اور نہ کسی کی معذرت کو دیکھتا ہے، یہ کیفیت اب بعض چھپنے والے کالموں میں پوری برہنگی کے ساتھ عیاں ہے۔

کارگل آپریشن کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس عمل کا آغاز بھارتی وزیر دفاع جارج فرنینڈیس نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ وزیراعظم نواز شریف اس ''گناہ'' سے مبرا ہیں اس لیے کہ پاک آرمی نے انہیں اس آپریشن کی بھنک نہیں پڑنے دی۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ بھارت میں فرنینڈیس کی اس درفنطنی کو تسلیم کرنے پر کوئی شخص تیار نہ ہوا لیکن پاکستان میں اس نظریئے کو قبول کرنے اور اس کا مزید پرچار کرنے والوں کا جوش و خروش دیدنی ہے۔ ہندو جیسا عیار دشمن جو پروپیگنڈہ کر رہا ہے، اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہماری قومی صفوں میں دراڑ پیدا کی جائے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ عیار دشمن کا مکارانہ منصوبہ سرے چڑھ رہا ہے اور ہم باہم سر پھٹول میں مصروف ہیں۔ بھارت چھ ہفتے تک کارگل کی سنگلاخ منجمد برفانی چوٹیوں سے سر پٹختا رہا۔ اس کا آپریشن 'وجے' بدترین شکست میں تبدیل ہوا۔ مگر اب چند ایک پاکستانی تجزیہ نگار، بھارت کی بزدلانہ شکست کی مہا بھارت لکھ رہے ہیں اور پاکستانی فوج اور مجاہدین کی بے مثال جرات و شجاعت پر خط تنسیخ پھیر رہے ہیں۔ جو کام دشمن نہیں کر سکا، وہ نادان دوست کرنے میں پوری طرح سرگرم ہیں۔

بھارت اپنے عوام کو دھوکہ میں رکھنے کیلئے پاکستان کو جونئ دھمکی دیتا ہے، ہمارے بعض کالم نگار، تجزیہ نگار اور سیاستدان ان دھمکیوں میں اپنی طرف سے مرچ مصالحہ شامل کر کے حکومت پاکستان کو ڈرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس طرح بھارت کو ''رضا کار'' ترجمانوں کی ایک فوج ظفر موج میسر آ گئی ہے۔ اس قدر چھوٹی چھوٹی آکاش وانیاں اور ذیلی زی ٹی وی سرگرم عمل ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، بھارت کو طاقتور اور پاکستان کو کمزور اور پھسڈی ثابت کرنے کی میراتھون دوڑ شروع ہے۔ حضور! کچھ تو خیال کیجئے کہ جو وطن آپ کی ماں ہے، آپ کو تحفظ دے رہا ہے اس کو تو نہ رگیدیئے۔

پاکستان آرمی کے تقدس کو بھارت صرف بین الاقوامی میڈیا میں پامال کر سکا ہے۔ اگر ہم نے اس کا جواب نہیں دیا تو اس میں پاکستان کا قصور نہیں، یہ مجموعی طور پر ہمارے معاشرے کا قصور ہے ان اشتہاروں کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ لندن میں بیرسٹر ظہور بٹ اس حد تک کامیاب ہو گئے ہیں کہ برطانیہ کی اشتہارات کی اتھارٹی نے بھارتی اشتہارات کی اشاعت کے خلاف کارروائی کرنے کا وعدہ کیا ہے اس

قربانیاں دی ہیں، اس کی شجاعت کی شہادت ان سطور کو تحریر کرتے وقت یعنی جمعہ ہفتہ کی درمیانی شب بی بی سی کے ایک انٹرویو میں جنرل مانک شاہ سابق انڈین آرمی چیف بھی دے رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں پاک افواج بہادری سے لڑیں۔ انہوں نے کمال پور کے معرکے کی مثال بھی دی جس پر قیوم نظر نے تاریخی رزمیہ لکھا تھا ''کمال پور میں جو لڑے'' آج کارگل کی بلندیوں پر پونے آٹھ سو میل لمبی کنٹرول لائن کے چپے چپے کا پاک فوج نے دفاع کیا ہے، ایک انچ زمین بھارت کے قبضہ میں نہیں گئی، بھارت ضرور کہہ رہا ہے کہ کنٹرول لائن کے پار اس کا علاقہ پاک افواج اور مجاہدین کے قبضہ میں ہے۔ پاکستانی افواج نے جہاد اسلامی کی چودہ سو سالہ روشن روایات کو زندہ و تابندہ کر دیا ہے۔ ہمیں اپنے غازیوں پر فخر ہونا چاہیے اور شہادت کے گل و گلزار کی مہک کو عام کرنا چاہیے۔

میں اپنے قلم کار بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے گھروں سے نکلیں، شہداء کے ورثاء کے گھروں میں پہنچیں، ان کے دوستوں سے ملیں، ان کی یونٹ کے جوانوں اور افسروں سے ملاقاتیں کریں اور قوم کے سامنے ان کے بے مثل کارناموں کو پیش کریں۔ یہی چراغ جلیں گے تو وہ اندھیرے چھٹ سکیں گے جن میں ہم گھرتے چلے جا رہے ہیں۔ (یکم اگست 1999ء)

وہ جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل کیلئے قربان کر دیا

پی ٹی وی پر مجاہدین اور پاک فوج کے جانبازوں اور شہداء کے جسد خاکی محاذ جنگ سے ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے مناظر کئی بار دکھائے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان شہداء کے ورثاء نے کوئی بین کیا ہو، ماتم کیا ہو، آہ وفغاں کی ہو، تمام جنازے ایک وقار اور تقدس کے ماحول میں ادا کیے گئے ہیں اور ورثاء نے ٹی وی کیمروں کے سامنے بڑی حوصلہ مندی اور کمال صبر واستقامت سے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔

ایک جنازے کے واقعات کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے، ایک فوجی افسر کی بیوہ نے مطالبہ کیا کہ تابوت کھول کر لاش کا معائنہ کرنے کی اجازت دی جائے تا کہ وہ دیکھ سکے کہ اس کے خاوند نے زخم کہاں کھائے ہیں۔ انتظامیہ نے پہلے تو انکار کیا، ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، لیکن بیوہ نے اصرار کیا کہ وہ لاش کی وارث ہے اور اس کی تدفین کی اس وقت تک اجازت نہیں دے گی جب تک وہ یہ اطمینان نہیں کر لیتی کہ اس کے سہاگ نے موت کو گلے لگایا ہے یا موت نے اس کا پیچھا کیا ہے۔ بیوہ کی بات بالآخر ماننا پڑی اور تابوت کھول دیا گیا۔ بیوہ نے ایک آنکھ شہید خاوند کی لاش کو دیکھا، سینہ درجنوں گولیوں سے چھلنی تھا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ بلند کی، اپنے ہاتھ رب کائنات کے سامنے پھیلائے: ''خدایا! میں اس خاوند پر فخر کرتی ہوں، اس نے سید الشہداء کی روایات کو زندہ کیا ہے''۔ بیوہ کا چہرہ جو پہلے تنا ہوا تھا، یکا یک اس پر طمانیت پھیل گئی۔ ایک سرخوشی کی کیفیت تھی جسے ہر کوئی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

اور اب شیر خاں کی لاش آئی ہے تو میں نے پوری قوم کا سینہ فخر سے تنا ہوا دیکھا ہے۔ شیر خاں دشمن کیلئے موت تھا۔ اس نے میدان جنگ میں شجاعت کا وہ مظاہرہ کیا کہ جب وہ شہادت سے سرفراز ہوا تو دشمن اس کی ہیبت سے اس کے نزدیک آنے کی جرات نہ کر سکا۔

میاں نواز شریف چند روز پہلے سکردو گئے۔ ٹی وی پر ان کا خطاب دکھایا گیا۔ ان کے سامعین شہداء کے ورثاء تھے۔ ناردرن لائٹ انفنٹری جو بلند پہاڑی جنگ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، ان کے عزیز و اقارب وزیراعظم کی تقریر سننے کیلئے جمع تھے۔ وزیراعظم نے شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا اور ورثاء کیلئے حکومتی استطاعت کے مطابق اعانت کا اعلان بھی کیا۔ ٹی وی اور دیگر ذرائع وابلاغ کی کسی رپورٹ میں کوئی ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا کہ شہداء کے وارثوں کی زبان پر کوئی حرف شکایت نمودار ہو یا ان کی آنکھوں میں کوئی گلہ تیر رہا ہو۔

وہ جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان کر دیا، ان کیلئے جنت کی بشارت ہے۔ ان کے درجات کی بلندی کا ہم خاکی لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ان کے تذکرے ایمان افروز ہیں۔ اگر نوجوان صحافی اور ریڈیو ٹی وی کی ٹیمیں ان کے زندہ و پائندہ تذکرے قلم بند یا فلم بند کر سکیں، تو یہ ایک تو صحیح خراج عقیدت ہوگا، دوسرے آنے والی نسلوں کے سامنے ان کا روشن کردار مشعل راہ بنے گا۔

ہمارا فرض صرف یہاں ختم نہیں ہو جاتا ہمیں ان خاندانوں کے سر پر ہاتھ رکھنا ہے جو اب زندگی کے مصائب کو جھیلنے کیلئے سہاروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ بیواؤں اور یتیموں کے مسائل بے انتہا ہیں۔ ہم میں سے ہر صاحب استطاعت مٹھی بھر آٹا بھی ایثار کر سکے، تو ان مصائب و مشکلات میں یقیناً کمی واقع ہوگی۔

ہماری شاہراہوں پر زندگی کی چہل پہل ہے، تو یہ اس خون کے صدقے ہے جو وطن اور قوم کی حفاظت کیلئے بہا ہے۔

میاں نواز شریف ایک بار پھر سکردو کے سفر پر ہیں اور ان سطور کی اشاعت کے ساتھ ان کے تازہ اقدامات بھی قارئین کے سامنے آ جائیں گے لیکن میاں نواز شریف کا فرض ہے کہ وہ پوری قوم کو متحرک اور سرگرم عمل کریں۔ شہید کا خاندان کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کرے گا اور ان کو لاوارث چھوڑنا شہداء کے خون سے غداری اور سنگین بے وفائی کے مترادف ہوگا۔ (26 جولائی 1999)

انکل! میں بڑا ہو کر ابو کی طرح شہید بنوں گا

قومیں وہ مرتی ہیں جو مرنے سے ڈرتی ہوں۔

جس قوم کا بچہ، ایک شہید کا کم سن بیٹا یہ کہے کہ وہ بڑا ہو کر ابو کی طرح شہید بنے گا، تو اس قوم کو موت کیا آئے گی.....

میرے بیٹے! پوری قوم کے بیٹے! تمہارا یہ فقرہ کراچی سے کارگل تک گونج رہا ہے، میدانوں، وادیوں اور چوٹیوں پر گونج رہا ہے۔

میں بڑا ہو کر ابو کی طرح شہید بنوں گا۔

کون کہتا ہے کہ پاکستان لڑنے سے ڈرتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ پاکستانی مرنے سے ڈرتے ہیں۔

پی ٹی وی کے کارگل شو میں شہیدوں کے زندہ تذکرے مہکے اور جانبازوں کی جراتوں کی روشنیاں کراں تا بکراں پھیلیں۔

میں بزدلوں کے لشکر سے کہتا ہوں کہ وہ افواج پاکستان کی غلط تصویر پیش نہ کریں۔ پاکستان کی مسلح افواج اور مجاہدین نے دشمن کے ہمیشہ دانت کھٹے کیے۔ 48ء میں سری نگر کے ہوائی اڈے پر جراتوں اور ہمتوں کا یہی لشکر پہنچا تھا۔ 65ء میں اکھنور کی فصیلیں انہی کے نعرہ تکبیر سے لرزی تھیں۔ سچیت گڑھ کی کوکھ سے دشمن کا بکتر بند ڈویژن سیاہ آندھی کی طرح پھنکارتا ہوا ظفروال اور چونڈہ تک پہنچا، تو دنیا کی تاریخ میں پہلی بار گوشت پوست کے انسان بم بن کر ٹینکوں کے سامنے لیٹ گئے تھے، پھٹ گئے تھے۔

وہ جو کہتے ہیں پاکستان لڑ نہیں سکتا۔ وہ جنہیں پاکستان کی معیشت اور اس کے زرمبادلہ کے ذخائر کی فکر لاحق ہے، انہیں کیا معلوم زندگی کس کو کہتے ہیں، چلتی پھرتی لاشوں کی رگوں میں جمے ہوئے لہو میں جو زندگی ڈھونڈتے ہیں، انہیں کیا خبر زندگی تو شہید کے جسم سے بہنے والے لہو کے پہلے قطرے کی حدت اور تب و تاب کا نام ہے۔

کارگل میں دنیا کے بلند ترین محاذ پر وہ جنگ لڑی گئی جس کی تاریخ انسانی میں اس سے پہلے کوئی نظیر موجود نہیں اور آنے والے وقتوں اور ان بلندیوں کی طرح بلند ہمتی کی کوئی نئی مثال کم ہی سامنے آسکے گی۔

دنیا کی عظیم جنگوں کے عظیم تذکرے انبار در انبار موجود ہیں۔

کارگل کی چوٹیاں پہلے ہی بلند تھیں۔ان تذکروں سے اب وہ سر بلند ہوگئی ہیں۔

پاکستان کی مسلح افواج کے شہداء اور جانبازوں نے ثابت کر دیا ہے کہ دشمن خواہ کتنی بڑی طاقت کا مالک کیوں نہ ہو، وہ ہماری جرات وشجاعت اور دلیری کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔

دنیا کی چھٹی ایٹمی قوت آنے والے ہزار سال میں اپنے زخم چاٹتی رہے گی۔

ہمارے مٹھی بھر مجاہدین نے ہندو لالے کو وہ سبق سکھایا ہے کہ اب اسے پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں ہو سکے گی۔

پورس کے ہاتھی کوئی محاورہ نہیں، تاریخ میں اس محاورے کی صداقت کا بار بار اظہار ہوتا رہا ہے۔

اس وقت بھی پورس کے ہاتھی اس کوشش میں ہیں کہ اپنی ہی فوج کو لتاڑ کر، رگید کر رکھ دیں۔

ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں لڑنے کی سکت نہیں ہے۔ ہماری مسلح افواج لڑنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

یہ داستان گو پسپائی اور رسوائی کی منطق بگھار رہے ہیں اور ہندوستان کو فاتح ظاہر کر رہے ہیں۔

میں ان میں سے ایک ایک کو دعوت مبارزت دیتا ہوں کہ اگر انہیں ابھی سبق نہیں ملا تو آئیں، وہ کارگل کی بلندیوں کا رخ کریں۔ بھارت سے کہیں کہ چھ ڈویژن اور لے آئے، اپنی ساری افواج کو یہاں جمع کر لے اور کارگل سے مجاہدوں کو بزور طاقت اتار کر دکھائے۔

دشمن لگاتار چھ ہفتے کارگل کے پہاڑوں سے سر پٹختا رہا اور اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اسے اپنی ہی لاشوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اب ہمارے بعض کالم نگار اور تقریر نویس دشمن کی فوج کا نیا مہا بھارت تخلیق کرنے کی کوشش میں ہیں۔ وہ قومی صفوں میں تفریق ڈالنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ وہ اس قوم کو بزدلی کا درس دینے چلے ہیں جس کا ایک کمسن بیٹا کہتا ہے۔

''انکل! میں بڑا ہو کر اپنے ابو کی طرح شہید بنوں گا''

بزدلی کی دکانیں سجانے والوں کی اس قوم میں کوئی گنجائش نہیں۔

پاکستانی فوج ایک قابل فخر اور شاندار فتح سے ہمکنار ہوئی ہے اور ہندوستانی فوج کی ذلت آمیز اور رسوا

کن شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

کیپٹن کرنل شیر خاں نے مکار اور عیار دشمن کے سامنے خون کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔

کارگل کی چوٹیوں سے بھی اوپر خون کی ایک دیوار۔

اس دیوار کو پار کرنے کی کسی میں ہمت ہے تو سامنے آئے۔(23 جولائی 1999ء)

صدی کا رزم نامہ

میں جو شاہنامے لکھ رہا ہوں وہ سب جو شاہنامے لکھنے میں مگن ہیں۔ ہم کیوں بھول گئے ہیں ان کو جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان کر دیا ہے، جو پہاڑوں پر بیٹھے تھے۔ دراس، کارگل، بٹالک اور چھوار بٹ کی بلندیوں پر براجمان تھے، ان کے اردگرد برف تھی۔ منجمد سکوت تھا، منہ زور ہوائیں تھیں۔ یکا یک یہ سکوت پگھلا، برف ڈھلنے لگی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہونے لگے۔

وہ جب بلندیوں پر چڑھے تھے، تو ان کا ایک ہی مشن تھا کہ دشمن پر ہیبت طاری کی جائے۔ دشمن کے ناقابل تسخیر ہونے کے دعوے کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔

پہاڑوں پر چڑھنے والے چند سو تھے اور دشمن تیس ہزار سے زائد، ایک اور تیس کے فرق سے کوئی ''وار پلان'' بنایا ہی نہیں جا سکتا، لیکن یہ چند سو تنہا نہیں تھے۔ ضرب حیدری ان کے بازوؤں میں مچل رہی تھی، تائید غیبی ان کی پشت پر تھی۔ ستر ہزار کشمیری شہداء کا لہو ان کے جذبوں کو گرما رہا تھا اور راتوں کے پچھلے پہر آسمانوں سے فرشتے قطار اندر قطار اتر کر ان کو خدا کی رحمت کی لپیٹ میں لے رہے تھے۔

ان مایہ ناز سپوتوں نے جرات و شجاعت اور ایثار و قربانی کی لازوال داستانیں رقم کیں۔

نقشوں کی لکیریں آگے پیچھے سرک جاتی ہیں۔

لیکن آفرین ہے ان کے جذبوں کی، ہمت و عزیمت کی کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

وہ ڈٹے رہے کہ یہ ان کا غزوہ بدر تھا، دشمن کا غرور دیکھا نہیں جاتا تھا اور مجاہدین کی بے سروسامانی پر دنیا خندہ زن تھی۔

وہ ڈٹے رہے کہ ان کیلئے احد کی گھاٹی کو چھوڑنے کی دوسری غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔

وہ ڈٹے رہے کہ فتح مکہ کی بشارت ان کی پیشانیوں کو چوم رہی تھی۔

مجاہدین دو ماہ تک بھارت کے غرور سے ٹکراتے رہے۔

ابتدائی چند دنوں کی جھڑپیں بالآخر ایک مکمل جنگ کی شکل اختیار کر گئیں۔ بھاری توپ خانہ، فضائی بمباری اور تربیت یافتہ کمانڈو فورس نے کارگل، دراس، بٹالک اور چھوار بٹ کی چوٹیوں پر مورچہ زن مجاہدین پر پے در پے حملے کیے۔ بھارت تازہ دم دستے لا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا مجاہدین تھکے ہارے، نیند کے مارے بس چشم زون میں زیر ہو جائیں گے۔

بھارت نے پہلے اعلان کیا کہ چند روز میں ان کو مار بھگائیں گے۔ ''چند روز'' میں مجاہدین ٹس سے مس نہ ہوئے، بلکہ بھارتی حملہ آور فوج کے کشتوں کے پشتے لگ گئے تو بھارت نے دل کو نئی تسلی دی: ''چند ہفتوں کی بات ہے مجاہدین کو لائن آف کنٹرول سے باہر دھکیل دیا جائے گا۔''

چند ہفتے بھی گزر گئے۔ مجاہدین کی پوزیشنوں میں سرمو فرق واقع نہ ہوا، لیکن بھارتی لاشوں کیلئے تابوت عنقا ہو گئے۔

بھارت نے تیسرا دعوی کیا اور اس میں مجاہدین کی اولوالعزمی اور ثابت قدمی کا اعتراف بھی شامل تھا کہ ایک طویل جنگ میں ہی ان کو پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے۔

بھارتی قیادت ہر نئے سورج کے ساتھ نیا جھوٹ تراش رہی تھی، وہ اپنے عوام کو ذہنی طور پر ایک لمبے عرصے کی جدوجہد کیلئے تیار کر رہی تھی۔

ادھر مجاہدین کسی بھی فتح و شکست کے نظریئے سے بے نیاز تھے۔

وہ تو ''غازی یا شہید'' کی سرخوشی سے سرشار تھے۔

وہ تو وقت کی سوچ پر اپنے لہو سے ایک نیا رزم نامہ تحریر کر رہے تھے۔

بیسویں صدی ڈوبتے لمحوں کے افق پر اس رزم نامے کی شفق رنگ کرنوں کی وہ روشنی بکھیر رہی ہے جو اگلے ہزار سال کے سورج کو نئی آب و تاب بخشیں گی۔

اور کوئی تقریر نویس نہیں بلکہ کوئی فردوسی ایک ایسا نیا رزم نامہ لکھے گا جو آنے والی نسلوں کیلئے عزیمت و جواں مردی کی راہیں روشن کرے گا۔

پاکستان کی بہادر اور غیور افواج نے ہمیشہ کشمیری مجاہدین کی اخلاقی مدد کی ہے۔ پاکستان کی کوئی حکومت مصلحت کا شکار ہو بھی جائے اور کسی راجیو گاندھی کی اسلام آباد آمد پر کشمیر ہاؤس کے بورڈ اتار بھی دے، تو ایسا

ممکن ہے۔مگر ہمارا جی ایچ کیو کشمیر کاز کی خاطر ہمیشہ یکسو رہا ہے، جنرل اکبر ہوں یا جنرل اختر یا جنرل مشرف سب کے سب کشمیری مجاہدین کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئے ہیں۔

ہماری مسلح افواج نے کنٹرول لائن اور بین الاقوامی سرحد پر جس چوکسی کے ساتھ پہرہ دیا ہے اس سے دشمن کو جنگ کا دائرہ پھیلانے کی ہمت نہیں ہوسکی۔آج جو بھی شخص کہتا ہے کہ کشمیر کی خاطر پاکستان کو نہیں گنوا سکتے،اسے پاک فوج کی صلاحیتوں پر شبہ ہے۔

برادرم عباس اطہر نے بجا لکھا ہے کہ ایسے لوگ پورس کے ہاتھی ہیں جو اپنی سپاہ کو روندرہے ہیں۔

کچھ تبصرہ نگار نئے نئے سیم وزر کی تجوریوں پر بیٹھے ہیں، وہ اس شک میں مبتلا ہیں کہ کہیں یہ تجوریاں چھن نہ جائیں۔کوئی تبصرہ کسی پراپرٹی بورڈ کی میز کی دراز سے برآمد ہوتا ہے اور وہ بھارتی پروپیگنڈہ مشینری سے بھی زیادہ ڈرانے کی کوشش میں ہے۔

قومی صفوں میں بے ہمتوں اور بزدلوں کی کمی نہیں ہوا کرتی،لیکن قوم ان کی بولیوں پر کان دھرنے پر آمادہ نہیں،اس لیے کہ زی نیوز گزشتہ دو روز سے ہر پندرہ منٹ کے وقفے کے ساتھ دس نئی لاشوں کا نوحہ پڑھ رہا ہے۔

بھارت کے طول وعرض میں وہ لاشیں اگلے دو ہفتوں تک پہنچتی رہیں گی جو پچھلے دو ماہ سے کارگل کے پتھروں میں گل سڑ رہی ہیں۔جس بھارتی فوج کو جنگ کے دوران اپنی لاشیں اٹھانے کی ہمت نہیں ہوسکی، اس سے پاکستان کو کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

آیئے! ہم اس گناہ میں شریک نہ ہوں جس کا ارتکاب امریکی اور مغربی اخبارات کے صفحات میں کیا جا رہا ہے۔

کون سی گالی ہے جو ہندو لابی ہماری قومی افواج کو نہیں دے رہی۔اس سے پہلے کہ میں ان غلیظ اور مکروہ اشتہارات کے متن کو یہاں نقل کروں خدا کرے کہ میرے قلم میں لکھنے کی قوت نہ رہے۔قلم کی قسم خدا نے کھائی ہے اور جو کچھ قلم سے لکھا جاتا ہے اس کی قسم بھی خدا نے کھائی ہے،قلم اور اس سے نکلنے والی تحریر کو اس قسم کی لاج رکھنی چاہیے۔

مجھے لندن سے بیرسٹر ظہور بٹ نے فون پر بتایا ہے کہ انہوں نے برطانیہ میں اشتہارات کے بورڈ سے ان اشتہارات کی اشاعت پر احتجاج کیا ہے۔بیرسٹر ظہور بٹ کو یقین ہے کہ برطانوی قوانین اور روایات کے

تحت ان دلآزار اشتہارات کی اجازت نہیں، چنانچہ اگلے مرحلے میں بیرسٹر ظہور بٹ ان اشتہارات کے خلاف عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر امریکہ میں بھی ہمارے پاکستانی بھائی اسی طرح کی کارروائی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس محاذ پر بھی دشمن کو چت نہ کیا جا سکے۔

آیئے! خاکی وردی پر جمی ہوئی دھول کو اپنی آنکھوں کیلئے سرمہ بنائیں۔ اور شہید کی لاش سے بہنے والے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکانے کا عہد کریں۔

بھارتی لالہ بزدل ہے۔ وہ جو کارگل میں جنگ ہار گیا تھا وہ کسی تقریر نویس کے مسودے میں جنگ جیتنا چاہتا ہے۔ وہ جو ہمارے ٹی وی کے سامنے بے بس ہو گیا تھا اور اس کی نشریات سننے کو جرم گردانتا تھا، اب عالمی میڈیا میں ایک مکروہ مہم سے جنگ جیتنے کا خواہاں ہے۔

اگر بھارتی لالے کو دنیا کی بلندیوں پر ہزیمت اٹھانی پڑی ہے تو میڈیا جنگ اور سفارتی جنگ میں بھی اسے منہ کی کھانے پڑے گی۔ پی ٹی وی نے بھارت کی بولتی بند کیے رکھی ہے اور اب جبکہ بھارتی ٹی وی کو لاشے دکھانے اور نوحہ گردی سے فرصت نہیں تو ہمارا ٹی وی ایک بار پھر میدان میں ہے اور اپنے مدلل تجزیوں کے ساتھ بھارتی پروپیگنڈے کے ہر حملے کو پسپا کرنے میں مصروف ہے۔

میری رائے ہے کہ اگر پی ٹی وی پر کارگل کی سیٹلائٹ سے کھینچی ہوئی کوئی تصویر دکھائی جا سکے تو ہمارے تقریر نویسوں کو اپنے جغرافیے کی ابجد ٹھیک کرنے میں مدد ملے گی۔ کارگل سے کوئی راستہ سری نگر کو نہیں جاتا، جیسا فقرہ وزیراعظم کی تقریر میں ڈالنے والے کو پتہ چل جانا چاہیے کہ سری نگر سے سیاچین کو جانے والا راستہ ضرور کارگل سے گزرتا ہے اور مجاہدین نے اس راستے کی گردن دبوچ رکھی تھی۔

وزیراعظم کے تقریر نویس کا سانس بھارتی فوج کے ساتھ گھٹنے لگا ہے تو پھر رحم کھاتے ہوئے مجاہدین نے اس گردن سے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔ صدی کا نیا رزم نامہ شجاعت کی داستانوں سے لبریز ہے۔

پاک افواج اور مجاہدین لائق صد تبریک ہیں کہ ان کا دامن قابل فخر ہے اور مایہ ناز سپوتوں کی شجاعت کیلئے قصوں سے لبریز ہے۔ (17 جولائی 1999ء)

کارگل اور نواز شریف کی امریکہ یاترا

وزیراعظم نواز شریف امریکہ کے اس دورے پر روانہ ہوگئے ہیں جس کی خبر سب سے پہلے پاکستان آرمی چیف جنرل مشرف نے دی تھی۔ اگرچہ امریکی ذرائع اب تک اس مجوزہ ملاقات کی تردید ہی کرتے رہے ہیں بلکہ پاکستان میں متعین امریکی سفیر سے ملکی اخبارات کے ایڈیٹر بھی یہ راز نہیں اگلوا سکے۔

میں گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے بستر پر ہوں، اس لیے مرکزی دھارے سے دور ہوں، فوری طور پر کوئی مصدقہ معلومات قارئین تک پہنچانے سے قاصر ہوں، لیکن جب میری نظر رائٹر کی خبر پر پڑی ہے تو اس سے کچھ باتیں ضرور سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ رائٹر کا دعوی ہے کہ وزیراعظم نواز شریف نے امریکی صدر بل کلنٹن کو فون کر کے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس پر کلنٹن نے بھارتی نگران وزیراعظم واجپائی کو فون پر کہا کہ ممکن ہے نواز شریف اپنے ساتھ کوئی ٹھوس تجاویز لا رہے ہوں۔ اس کے بعد نواز شریف کو واشنگٹن آمد کا اشارے دے دیا گیا۔

امریکہ میں 4 جولائی اتوار کی چھٹی ہے۔ یہ دن امریکہ کا یوم آزادی بھی ہے اور امریکہ ہی نہیں پوری دنیا میں امریکی سفارتخانوں میں بھی یوم آزادی کی تقریبات منعقد ہو رہی ہیں۔ اتوار کو یوم آزدی ہونے کی وجہ سے امریکیوں کو سوموار کے دن متبادل چھٹی دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے امریکی صدر کا کسی بھی بیرونی مہمان کو اتوار کی سہ پہر ملاقات دینے کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ انتہائی اہم اور ملاقات غیر معمولی ہے۔ یہ معاملہ پاکستان کیلئے اہم ہو یا نہ ہو، امریکی صدر کلنٹن کیلئے واقعی بے حد اہم ہے۔ جو اقتدار سے رخصت ہونے سے قبل یہ کریڈٹ لینا چاہتا ہے کہ اگر سابق امریکی صدر جارج بش نے عالم عرب میں امریکی افواج کو اتارنے اور عراق کے گرد و نواح میں امریکی اثر و نفوذ کا اضافہ کر کے اپنے سر پر ایک قلغی سجائی تھی تو بل کلنٹن بھی جنوبی ایشیا میں اسی نوعیت کا کارنامہ سرانجام دینے چلا ہے۔

پاکستان میں وہ لوگ بہت ہیں اور ان کو معلومات کے ذرائع تک رسائی کا دعوی بھی ہے جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ پاکستان ہمیشہ میدان جنگ میں جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار گیا اور اب انہیں اسی ری پہلے کا خدشہ نظر آ رہا ہے۔ ایک اخبار نے جس کے مالک ایڈیٹر، میاں نواز شریف اور ان کے خاندان کے انتہائی قریب ہیں، اپنے ہفتہ کے روز کے اداریئے کا اختتام اس خدشے پر کیا ہے کہ

وہ ناداں گر گیا سجدے میں جب وقت قیام آیا

اس مصرعے میں واضح تحریف اس امر کو ڈھکا چھپا نہیں رہنے دیتی کہ اخبار کا اشارہ کس کی طرف ہے۔

چند روز قبل بھارت کے ذرائع نے اچانک یہ خبر افشا کی کہ پاکستان کا ایک خفیہ نمائندہ بھارت کے دورے پر ہے اور پاکستانی وزیراعظم کی طرف سے بھارتی وزیراعظم کے لئے حالیہ تنازعہ کے حل کا فارمولا لے کر آیا ہے۔ یہ ذات شریف ایک ریٹائرڈ سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک ہیں۔ ابھی پاکستان اور بھارت کی حکومتیں اس امر کی تردید ہی کر رہی تھیں کہ ایسی کوئی خفیہ سفارتکاری بروئے کار نہیں لائی گئی کہ جناب نائیک نے خود ہی بی بی سی پر یہ راز فاش کر دیا۔ چند دنوں میں دونوں ملکوں کے فوجی کمانڈر کشمیر سے فوجوں کی واپسی کا ٹائم ٹیبل اور فریم ورک طے کرتے نظر آئیں گے۔

میں خوش فہم ہوں، لیکن مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کارگل، دراس، بٹالک اور ترتوک میں نبرد آزما مجاہدین کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ ان قربانیوں کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اجاگر کیا جائے اور جن طاقتوں نے مسئلہ کشمیر کے حل میں مجرمانہ تغافل کا رویہ اختیار کیے رکھا ہے انہیں اب مجبور کر دیا جائے کہ اگر انہوں نے یہی روش جاری رکھی تو پھر جنوبی ایشیاء کا خرمن امن دو ایٹمی طاقتوں کے ہاتھوں خاکستر ہو کر رہ جائے گا اور بالخصوص امریکی نیو ورلڈ آرڈر کی یہ خواہش بھی اس چتا میں بھسم ہو کر رہ جائے گی کہ دنیا کو تنازعات اور لڑائی جھگڑوں سے پاک کیا جائے۔ تاکہ امریکہ کو تجارت کیلئے وسیع، پرامن منڈیاں میسر آ سکیں۔

مجاہدین اپنے پہلے اور بنیادی مقصد میں کامیاب و کامران ٹھہرے ہیں اور اب یہ پاکستانی قیادت پر منحصر ہے کہ ان قربانیوں کے دوسرے مقصد یعنی تنازع کشمیر کے منصفانہ، آبرومندانہ اور دیرپا حل میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

ہمارے تجزیہ نگار الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے 65ء میں جیتی ہوئی بازی تاشقند کی میز پر ہار دی تھی۔ مسٹر

بھٹو بھی برسہا برس تک تاشقند کے تھیلے سے بلی نکالنے کی ڈگڈگی بجاتے رہے۔ بھٹو صاحب نے یہ بلی کبھی باہر نہیں نکالی۔

میں افواج پاکستان کے افسروں اور جوانوں کی شجاعت افروز داستان کی بے توقیری نہیں کرسکتا جنہوں نے شہادت پائی اور وطن عزیز کو بھارتی ٹینکوں تلے روندنے سے بچایا۔

یہی تجزیہ نگار شملہ معاہدے کو پاکستانی مفادات کے منافی قرار دیتے ہیں جبکہ بھٹو صاحب کا کہنا تھا کہ شملہ معاہدہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے جس کی وجہ سے وہ نوے ہزار پاکستانی سپاہ کو کلکتہ کے جنگی کیمپوں سے چھڑا لائے ہیں۔

آج نواز شریف کے ہاتھ میں جو پتے ہیں وہ سب کو نظر آ رہے ہیں۔ مجاہدین جو کارنامہ سرانجام دے سکتے تھے، وہ برفانی چوٹیوں پر مورچہ بندی کی پہلی ساعت میں ہی حاصل ہو گیا تھا۔

بھارتی فوج ہفتوں نہیں، مہینوں نہیں، برسوں تک ان بلندیوں پر بیٹھے ہوئے اولوالعزم، پرجوش اور سنگلاخ ارادوں کے مالک مجاہدین سے ٹکراتی رہے، وہ ان پر حاوی نہیں ہوسکتی۔

اور دنیا کی کسی جنگی اسٹرٹیجی کے مطابق مجاہدین کے ''وار پلان'' میں یہ بات شامل نہیں ہوسکتی کہ وہ ان بلندیوں سے اتر کر وادی کشمیر کی طرف مارچ کریں۔

ریاست کشمیر کا کل رقبہ ستاسی ہزار مربع میل ہے اس میں سے 37 ہزار مربع میل رقبہ آزاد کشمیر کا حصہ ہے اور باقی 52 ہزار مربع میل رقبے میں سے 31 ہزار مربع میل رقبہ مجاہدین نے بھارتی قبضے سے فنی طور پر کاٹ دیا ہے۔ لداخ اور سیاچین میں بھارتی فوج بھی محاصرے میں ہے۔ اس صورتحال کو بدلنا بھارت کیلئے کسی فوجی ایکشن کے ذریعے ممکن ہی نہیں۔ آگے کیا ہوگا۔ میاں نواز شریف یہ کہہ کر تردید کر چکے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے بھارت اور پاکستان کو اپنے روایتی موقف میں لچک پیدا کرنا ہوگی۔ ان کی تردید کے بعد ان سے یہ بیان منسوب کرنا بددیانتی ہوگی لیکن پاکستان پر 1971 سے 1973 اور 77 سے 90 اور 93 سے 96 تک حکومت کرنے والی پارٹی، پی پی پی کی موجودہ سربراہ محترمہ بینظیر بھٹو یہ کہہ چکی ہیں کہ کشمیر کا تنازعہ کیمپ ڈیوڈ کی طرز پر طے کیا جائے۔ اگر محترمہ نے پاکستانی قوم کو ذلت اور بے حمیتی کا راستہ نہ دکھایا ہوتو میں اب تک یہ تجویز پیش کر چکا ہوتا کہ حکومت پاکستان ان کی کرپشن کے گناہوں اور اس پر سزاؤں کو فی الوقت بھول جائے اور انہیں امریکہ اور یورپ میں پاکستانی کاز کو روشناس کرانے کا خصوصی مشن سپرد کیا جائے۔

ملک کے اندر کوئی قابل ذکر گروہ ایسا نہیں جو ممکنہ کیمپ ڈیوڈ کے خلاف آواز بلند کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ کارگل، دراس، بٹالک اور ترتوک کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے مجاہد پاکستان کی حکومت کے تابع نہیں ہیں کہ وہ اس کے اشارے پر واپسی کی راہ لیں اور کسی کیمپ ڈیوڈ کو قبول کر لیں۔ ان مجاہدین کا رویہ کیا ہوگا، یہ آنے والے دنوں میں سامنے آسکے گا۔

میاں نواز شریف ذاتی طور پر کس قسم کے انسان ہیں، اس سوال کا جواب بھی مستقبل کے معاملات کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ میاں نواز شریف کی یہ مجبوری ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی حکومت چلانے میں امریکی تائید و حمایت کی طرف دیکھیں، لیکن گزشتہ برس ایٹم بم کے دھماکے میں انہوں نے اس مجبوری کا ذرہ برابر لحاظ نہیں کیا اور قومی امنگوں اور ملکی مفاد کے مطابق دھماکے کا فیصلہ کیا جبکہ ان کے گرد صلاح کار انہیں پاکستانی واجپائیوں سے ہوشیار رہنے کی پٹی پڑھا رہے تھے۔ تو آیئے! یہ خوش فہمی رکھیں کہ ''میڈ ان پاکستان'' سیاستدان میاں نواز شریف وہی راستہ اختیار کرے گا جو ''میڈ فار پاکستان'' ہوگا۔ کشمیریوں کے فائدے میں ہوگا۔ ستر ہزار کشمیری شہیدوں کے لہو سے وفا قرار پائے گا۔ عفت مآب کشمیری خواتین کی لٹی ہوئی عصمتوں اور راکھ بنی بستیوں کا سودا نہیں کہلائے گا۔

میاں نواز شریف کے سامنے تقدیر اور تاریخ نے ایک عظیم کردار ادا کرنے کا موقع رکھ دیا ہے۔ ایسا موقع کسی کیلئے ہر روز نہیں آتا۔ یہ موقع پاکستان کے حق میں استعمال ہونا چاہیے۔ (5 جولائی 1999ء)

قراقرم کی للکار

میاں نواز شریف کی تقریر کا لوگوں کو انتظار تھا۔ اسے ہر کسی نے شوق سے سنا اور ہر کسی نے اس پر اپنے انداز میں تبصرہ کیا۔ میاں نواز شریف کے ہونٹوں پر وہی کچھ تھا جو ان کے دل میں تھا اور جو کچھ لوگوں کے دل میں تھا وہ میاں نواز شریف کی زبان پر تھا۔ میاں نواز شریف نے عوام کے جذبات کی ترجمانی بھی کی اور یہ بھی ثابت کیا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک آہنی عزم وارادے کے مالک ایٹمی وزیر اعظم ہیں جنہیں نہ کوئی جھکا سکتا ہے اور نہ ڈرا سکتا ہے۔

میاں نواز شریف نے مسئلہ کشمیر کی تاریخی حقیقت کا اعادہ کیا۔ بھارت کو بدعہدی کے لئے مورد الزام ٹھہرایا۔ یو این او میں کیے ہوئے وعدے کو بھارت پورا کر دیتا تو یہ خطہ بار بار جنگ کی لپیٹ میں نہ آتا۔ میاں نواز شریف نے تحریک آزادی کشمیر کو خراج تحسین پیش کیا۔ جان و مال اور عزتوں کی قربانیاں دینے والوں کو سلام پیش کیا۔ میاں صاحب نے قیام امن کی خواہش کا کھل کر اظہار کیا لیکن اس اظہار میں بزدلی اور شکست خوردگی کا کوئی دخل نہیں، ایک ایٹمی قوت کے حامل ملک کے وزیر اعظم نے ایک برابر کی پوزیشن سے قیام امن کو پورے خطے کے عوام کی ضرورت قرار دیا۔ اس وقت جب بھارت کی قیادت جنگی جنون میں مبتلا ہے اور بھارت کے طول وعرض میں جنگ کا بخار اپنی انتہا پر ہے تو میاں صاحب نے صرف اتنا کہا کہ ''شکتی مہاراج شکتی''۔

میاں نواز شریف نے بھارت کے باؤلے پن کو آئینہ دکھایا۔ میاں نواز شریف کو کوسنے والوں کی کمی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میاں صاحب نے ایک طرف ذہن کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور دوسری طرف بار بار مذاکرات کی دعوت دے کر اپنی اور پاکستان کی امن پسندی کا لوہا منوایا ہے۔

یار لوگ میاں صاحب کی مخالفت میں واجپائی کو داد دے رہے تھے کہ اس نے امریکی دورے کیلئے بل

کلنٹن کی دعوت کو مسترد کر کے نیو ورلڈ آرڈر کے سامراج کے خلاف ڈٹے رہنے کا تاثر دیا جبکہ میاں صاحب کی واشنگٹن یاترا کو ہدف تنقید بنایا گیا کہ انہوں نے بھاگم بھاگ واشنگٹن پہنچ کر کمزوری کا ثبوت دیا۔ ان نقادوں سے کوئی یہ پوچھے کہ واشنگٹن اعلامیہ تو بل کلنٹن اور نواز شریف کے مابین ملاقات کا نتیجہ ہے۔ اس اعلامیہ کے مندرجات کی پابندی میاں نواز شریف کیلئے تو لازمی ہو سکتی ہے واجپائی کیلئے تو اس کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن واجپائی کے لشکر کی توپیں خاموش کیوں ہو گئی ہیں۔ اس کے ہوائی جہازوں کی اڑانیں بند کیوں ہو گئی ہیں۔ آخر واجپائی کی فوج کو کیا حیا آڑے آ رہی ہے۔ بڑا بنتا تھا منی سپر پاور! ایک ایسے اعلامیے کی پابندی میں غیر معمولی پھرتی دکھا رہا ہے جس پر اس کے دستخط بھی نہیں ہیں۔

میاں نواز شریف کی تقریر کے بعد بریگیڈیئر راشد قریشی کی معمول کی پریس بریفنگ کی ریکارڈنگ دکھائی گئی ہے جس میں یہ غیر معمولی انکشاف کیا گیا ہے کہ بھارت نے مجاہدین کو ایک انچ پیچھے ہٹانے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ 2 مئی کو مجاہدین اور بھارتی فوج کے مابین جس پوزیشن پر آمنا سامنا ہوا 11 جولائی تک اس پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بریگیڈیئر راشد قریشی نے طنزیہ انداز میں سوال پوچھا کہ بھارت تو گزشتہ روز تک بٹالک کے 99 فیصد علاقے پر قابض ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ دراس سیکٹر میں ٹائیگر ہلز پر قبضے کا دعویٰ تو وہ کئی دن سے کر رہا ہے۔ اور گزشتہ روز اس نے مشکوہ وادی سے بھی مجاہدین کا صفایا کرنے کا دعویٰ کر دیا تو اب وہ 16 جولائی کی صبح تک کن علاقوں سے مجاہدین کو واپس جانے کا الٹی میٹم دے رہا ہے۔ اگر یہ علاقے بھارت کے قبضے میں جا چکے ہیں اور ان علاقوں سے خدانخواستہ مجاہدین کا صفایا ہو چکا ہے تو پھر ان علاقوں سے اب مجاہدین کی واپسی کے الٹی میٹم کی ضرورت کیا آن پڑی۔ ظاہر ہے بھارت کی ان دو باتوں میں سے کوئی ایک تو ضرور غلط ہے اور یہ غلطی بڑی واضح ہے کہ مجاہدین ان علاقوں میں بدستور مصروف جہاد ہیں۔ بھارتی عوام کے سامنے ان کی فوج کے اس جھوٹ کا پول کھل گیا ہے، مجاہدین نے اپنی لازوال قربانیوں اور بے مثل بہادری سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ان کے مقابلے میں 60 ہزار سے زائد بھارتی فوج اپنے توپ خانے، میزائلوں اور ہوائی جہازوں کے مہلک بموں کے باوجود بے بس اور بے توقیر ہو کر رہ گئی۔ بھارت کو یہ ہمت بھی نہیں ہو سکی کہ وہ اپنی اس خجالت کا بدلہ لینے کیلئے لائن آف کنٹرول کو کسی دوسری جگہ سے پار کر کے پاکستانی فوج کے مقابل آتا یا بین الاقوامی سرحد کو روندنے کی جرات کرتا۔ بھارت کو بے بسی کی اس سطح پر لے جانے میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کا دخل ہے۔ 65ء میں چھمب جوڑیاں سیکٹر میں صرف دو

ہفتوں کی جھڑپوں کے بعد بھارت نے بین الاقوامی سرحد پر 6 ستمبری صبح کو چوروں کی طرح حملہ کر دیا تھا۔ آج بھارت کو کارگل، دراس، بٹالک کے علاقے میں دو ماہ سے زائد عرصہ لڑتے بھڑتے ہو چلا ہے لیکن اسے پاکستان یا آزاد کشمیر کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں ہو سکی۔

بھارت نے اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے تو پاکستان اگلے مرحلے میں بھارت کو قراقرم کی بلندیوں سے للکارے گا۔ مرضی کا محاذ اب بھارت نہیں، پاکستان چنے گا۔ (12 جولائی 1999ء)

کشمیر، تیری جنت میں آئیں گے ایک دن

بھارت میں کشمیر کے مسئلے پر جاری بحث میرے ضمیر کو جھنجھوڑ رہی ہے۔

لیکن یہ بحث پیچھے رہ گئی ہے، اب اس مسئلے نے فساد کی شکل اختیار کر لی ہے، عام آدمی پارٹی کے جس لیڈر پرشانت بھوشن نے تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر میں بھارتی فوج کی تعیناتی کے مسئلے پر ریفرنڈم کروالیا جائے، اس پر انتہا پسند تنظیم ہندو رکھشا دل کے غنڈوں نے غازی آباد کے علاقے میں آپ کے دفتر پر بدھ کے روز صبح گیارہ بجے دھاوا بول دیا۔

بھوشن نے کہا ہے کہ میں اپنی تجویز کی وضاحت کر چکا ہوں اور میری پارٹی بھی میرے موقف سے برات کا اظہار کر چکی ہے، میں کشمیر کی آزادی کے لئے ریفرنڈم کا حامی نہیں ہوں۔

آپ کے لیڈر اور دہلی کے وزیر اعلیٰ کجروال نے بھوشن کے بیان پر ردعمل دیتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر میں فوج کی تعیناتی کا فیصلہ (مرکزی) حکومت کرتی ہے۔ ریفرنڈم اس کا حل نہیں ہے۔

مگر یہ ساری وضاحتیں ہندو انتہا پسندوں کو مطمئن نہیں کر سکیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور راشٹریہ سیوک سنگھ نے بھی بھوشن کے بیان کی مذمت کی ہے۔

پاکستان میں ابھی تک ان واقعات کو زیر بحث نہیں لایا گیا اور جب کبھی ہمارے دانشوروں کو ہوش آئی تو وہ ایک ہی رٹ لگائیں گے کہ نئی دہلی کے فساد کے پیچھے پاکستان کی آئی ایس آئی ملوث ہے۔ بھارتی بلاگرز نے ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ حرکات پاکستان کہ شہہ پر کی جا رہی ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے فیورٹ اینکرز کے ہاتھ یہ مواد کب لگے گا۔ فوج اور اس سے متعلقہ اداروں کو بدنام کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

مگر یہ نکتہ نہ بھولنے پائے کہ بھارت میں اگر کشمیریوں کے حق میں کوئی بھی آواز اٹھتی ہے تو وہاں یہ سب کے لئے ناقابل برداشت ہے اور آواز اٹھانے والوں کو بھی اگر چہ مگر چہ کا سہارا لے کر اپنا بیان بدلنا پڑتا ہے۔

اس پس منظر میں ہمارے ہاں اگر کسی کو یہ امید ہو کہ امن کی آشا پوری ہو جائے گی تو یہ اس کی بھول ہے۔ خورشید قصوری نے میرے ساتھ آن دی ریکارڈ بات کرتے ہوئے کہا کہ انہیں امید تھی کہ ہم اپنا کشمیر فارمولہ کابینہ اور پارلیمنٹ سے منظور کروالیں گے اور یہ بھی کہ ہمارے اسی پچاسی فی صد عوام بھی اس فارمولے کو قبول کرلیں گے۔ بھارت میں حکومت اور عوام کی ذمے داری من موہن سنگھ نے اٹھائی تھی، مگر کہاں یہ کہ کشمیر کی سرحدوں کو غیر مئوثر کرنا، دونوں خطوں کے مابین آزادانہ سفر اور تجارت اور کہاں یہ کہ محض بھارتی فوج کی کشمیر کے شہری علاقوں میں تعیناتی پر بھی بھارتی لیڈر شپ اور عوام یک سو اور ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ صورت حال میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

مگر پھر بھی کشمیر کی کنٹرول لائن پر بہت کچھ ایسا ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

میں سن دو ہزار میں نیو یارک کے دورے پر تھا، اس وقت مقبوضہ کشمیر سے خبر آئی کہ حزب المجاہدین نے سیز فائر کا اعلان کر دیا ہے۔ نیو یارک میں جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد بھی موجود تھے، انہوں نے بروکلین میں ایک پاکستانی بلڈر کے گھر پر ہنگامی پریس کانفرنس منعقد کی، میں بھی وہاں موجود تھا، قاضی صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا اور ان کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا کہ حزب المجاہدین کے ایک فیلڈ کمانڈر کو سیز فائر کے اعلان کا کیا حق پہنچتا ہے اور پھر یہ اعلان اپنی موت آپ مر گیا۔

مگر کچھ ہی عرصہ بعد وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی نے اعلان کیا کہ پاکستان کنٹرول لائن پر یکطرفہ سیز فائر کر رہا ہے۔ اس فیصلے پر فوری عمل درآمد ہو گیا اور بھارت نے بھی جواب میں سیز فائر کا اعلان کر دیا۔ اس وقت قاضی صاحب نے کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ پھر مظفر آباد سری نگر دوستی بس سروس چلانے کا اعلان ہوا، پاکستان میں بہت سے حلقوں نے کہا کہ یہ بس ان کی لاشوں پر سے گزاری جا سکتی ہے مگر دو ہزار رپانچ کے زلزلے تک یہ بس چلتی رہی، کسی نے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اسی بس پر بس نہیں، کنٹرول لائن پر کئی مقامات کو کشمیر کے دونوں حصوں کے مابین تجارت کے لئے بھی کھول دیا گیا اور بعض مقامات کو آر پار رشتے داروں کی باہم میل ملاقات کے لئے مختص کر دیا گیا۔ اس عمل کے سامنے بھی کسی نے رکاوٹ نہیں ڈالی۔ کیوں نہیں ڈالی، میں اس کی وجہ نہیں جانتا، جو جانتا ہو، وہ دوسروں کا آگاہ کرے۔ شاید انہی اقدامات سے شہہ پا کر پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں نے سوچا کہ اب اس سے بڑے اقدامات بھی اٹھائے جا سکتے ہیں اور منموہن سنگھ اور خورشید قصوری جس معاہدے کی بات کرتے ہیں، وہ حقیقت کا روپ دھار لیتا مگر

پاکستان میں مشرف کی حکومت زوال پذیر ہوگئی۔

کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ جس کسی کو پاک بھارت دوستی پسند نہیں تھی، اس نے مشرف کے خلاف تحریک چلائی ہو یا مشرف کے خلاف چلنے والی تحریک کے محرکات کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں، بہر حال کشمیر امن فارمولہ کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ لیکن سرکریک معاہدہ تو دستخطوں کے لئے تیار تھا، مشرف کے جانے کے بعد زرداری پانچ سال گزار گئے، اس دوران بھارت نے اس معاہدے پر دستخط کیوں نہیں کئے، اور سیاچین میں ایک حادثہ ہوا، نواز شریف نے کہا کہ پاکستان کو وہاں سے یک طرفہ طور پر فوج واپس بلا لینی چاہئے، مگر بھارت نے اس سے انکار کیوں کر دیا۔ بھارت میں وہی وزیر اعظم موجود تھے جو سیاچین کو امن کا پہاڑ بنانے کی نوید سنا رہے تھے مگر اب کشمیر کی رام لیلی سنا کر وہ بھارتی سیاست کی اسٹیج سے رخصت ہونے کو ہیں۔

بھارت کا رویہ ہٹ دھرمی پر مبنی ہے، وہ کہہ مکرنی کے فلسفے پر عمل پیرا ہے اور ایک ہم ہیں کہ اس کے لئے مرے جا رہے ہیں، کیا امن کے پجاری منموہن سنگھ نے ہمارے نو منتخب وزیر اعظم نواز شریف کی یہ معصوم اور ننھی سی خواہش پوری کی کہ ان کی تقریب حلف برداری میں شرکت کریں۔ ہم بھارت سے بجلی لے کر اپنے اندھیرے دور کرنا چاہتے تھے، کیا بھارت نے ایک میگا واٹ بھی بجلی فراہم کی۔ ہم چاہتے ہیں کہ واہگہ کی لکیر بے حیثیت ہو جائے اور برصغیر کے عوام یورپی یونین کی طرز پر پورے خطے میں سفر کر سکیں، امرتسر میں ناشتہ، لاہور میں لنچ اور اسلام آباد میں ڈنر، اسی خواہش کا تو من موہن سنگھ نے اظہار کیا تھا اور جب ہم نے موٹر وے بنائی تھی تو یہی خواب دکھایا تھا کہ اسلام آباد سے آگے رات کا قہوہ کابل میں اور شب بسری تاشقند میں، ہم نے دعوی کیا تھا کہ یہ موٹر وے نہیں، ایک اقتصادی نہر سویز ہے جو کئی دنیاؤں کو آپس میں ملائے گی، یہ سب خواب کیوں بکھر گئے، کس نے یہ خواب مسل ڈالے۔ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کے باوجود ہم سبق نہیں سیکھتے، ہمیں ہندو لالے سے پہلے کب خیر ملی تھی جواب مل جائے گی۔

مگر اے کشمیر! میں تجھے نہیں بھول سکتا۔ ایک دن تیری جنت میں ضرور پاؤں رکھیں گے۔

(11 جنوری 2014ء)

کشمیر حل، میری اطلاع کیا ہے

میں نے گزشتہ روز بھارتی وزیر اعظم کی طرف سے کشمیر قضیئے کے ممکنہ حل اور اس پر بھارت کے اندر تبصروں کا ذکر کیا۔ اسی موضوع پر نوائے وقت کا مفصل اداریہ بھی ساتھ ہی شائع ہوا ہے جو ہماری قومی امنگوں کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ اخبارات میں خورشید قصوری کا بھی ایک تبصرہ شائع ہوا۔

خورشید قصوری سے اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی رہی ہیں، اس وقت بھی جب وہ اپنے منصب پر فائز تھے اور بعد میں بھی وہ اپنے گھر پر ماہانہ بنیاد پر محفلیں سجاتے ہیں۔ ان سے ہمیشہ کام کی اور ٹھوس بات سننے کو ملی۔ کشمیر پر ان کا موقف یہی ہوتا تھا کہ عدلیہ تحریک نہ چلتی تو یہ مسئلہ قریب قریب حل ہو گیا تھا، ایک معاہدہ بھی تیار تھا اور انگریزی محاورے کا ترجمہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس مسودے کی شین قاف درست کی جا رہی تھی۔ ہمارا ان سے تقاضہ ہوتا تھا کہ وہ اس معاہدے کے بارے میں کچھ بتائیں مگر وہ یہ کہہ کر طرح دے جاتے کہ میری کتاب تیاری کے مراحل میں ہے، اس کا انتظار کیجئے۔ مگر اب من موہن سنگھ نے اپنی کسی کتاب کی اشاعت کے چکر میں پڑے بغیر ایک بڑ ہانک دی تو لامحالہ بھارت کی طرح پاکستان میں بھی ایک تجسس پیدا ہونا چاہئے تھا کہ آخر وہ کیا معاہدہ تھا جسے دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔

میں نے کل رات سابق وزیر خارجہ خورشید قصوری سے فون پر کہا کہ وہ آن دی ریکارڈ بات کریں اور اس معاہدے کی تفصیل بیان فرمائیں۔ جواب ملا کہ صرف کشمیر کا معاہدہ نہیں، ایک کمپوزٹ معاہدہ جس میں پاک بھارت تمام تنازعات کا حل موجود تھا۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی، میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور میں نے سوال کیا: تمام حل طلب تنازعات کا حل، مگر وہ کیسے؟

کہنے لگے، سر کریک پر سب کچھ طے ہو گیا تھا، صرف دستخط کرنا باقی تھے، سیاچین سے دونوں طرف کی

افواج کے انخلا پر بھی اتفاق رائے ہو گیا تھا۔من موہن سنگھ کے الفاظ تھے کہ اب یہ علاقہ امن کا پہاڑ Mountain of Peace کہلائے گا۔اور کشمیر، میں نے بے تابی سے پوچھا۔

جواب ملا کہ اس کے لئے تین سال لگ گئے، بہت مشکل مسئلہ تھا، ایک طرف بھارت اسے اپنے آئین کی رو سے اٹوٹ انگ قرار دے چکا تھا، دوسری طرف پاکستان کا روائتی موقف تھا کہ اس پر استصواب کروایا جائے تا کہ کشمیری اپنی مرضی سے پاکستان اور بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کر سکیں اور تیسری طرف خود کشمیری تھے جن کے گھروں کی دہلیزوں اور دکانوں کے شٹروں کے سامنے بھارتی پولیس پہرے پر مامور تھی۔اور چوتھی طرف کشمیری خاندان لائن آف کنٹرول کے آر پار تقسیم تھے۔

خورشید قصوری نے بتایا کہ انہوں نے حریت راہنماؤں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں، ان کا ایک ہی کہنا تھا کہ کسی طرح بھارتی فوج کو کشمیر سے واپس بھجوائیں، اس نے تو ہماری آبادی کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے، خواتین گھروں میں بھی محفوظ نہیں، ان کی اجتماعی آبروریزی کی جاتی ہے، نوجوانوں کو دہشت گردی کے الزام میں اٹھا کر غائب کر دیا جاتا ہے اور زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔

پاکستان اور بھارت طویل سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ

(1) بھارت اپنی افواج کو شہری علاقوں سے نکال لے گا،

(2) مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے مابین کوئی لائن آف کنٹرول نہیں ہوگی

(3) دونوں طرف کے کشمیریوں کو ایک جیسا شناختی کارڈ جاری کیا جائے گا جس پر ان کی سکونت ریاست جموں و کشمیر ظاہر کی جائے گی اور

(4) وہ اس شناختی کارڈ پر وادی میں ہر جگہ آ جا سکیں گے۔

میرا سوال تھا کہ اگر کسی مقام پر کوئی چیکنگ ہی نہیں ہوگی تو پھر پاکستانی اور بھارتی باشندے اور دنیا بھر کے لوگ بھی آر پار جانے کے لئے آزاد ہوں گے۔قصوری صاحب کہنے لگے کہ اگر کوئی چاہے تو کسی کا شناختی کارڈ چیک کیا جا سکتا ہے، میں خود لاہور ایئر پورٹ پر اپنی ٹکٹ اور شناختی کارڈ چیک کرواتا ہوں، ہر شخص کا شناختی کارڈ کئی دفاتر میں چیک ہوتا ہے بنک کاؤنٹر پر، موبائل فون کے دفاتر میں، عدالتوں میں اور یہ ایک روٹین کی کاروائی ہے۔اور اس نئے خطے پر کس کا کنٹرول ہوگا، حکومت کس کی ہوگی، اسے بیرون وطن سفر کے لئے پاسپورٹ کون سا ملک جاری کرے گا یا ان کا اپنا پاسپورٹ ہوگا۔اس علاقے کا دفاع کون کرے

گا۔اس کی کرنسی کہاں سے آئے گی۔قصوری صاحب نے طویل گفتگوسن کر کہا کہ ہم نے جوائنٹ کنٹرول کا فارمولہ سوچا تھا۔لیکن یہ ایک لمبی کہانی ہے۔اوراصل کہانی ہی یہی ہے۔ بھارتی آئین کے آرٹیکل 370 کی رو سے کشمیر کوخصوصی حیثیت حاصل ہے جس کی رو سے دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور مالیات کے امور بھارتی حکومت کوسونپ دیئے گئے تھے۔اس آرٹیکل کی موجودگی میں کشمیر کے مستقبل میں تبدیلی کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔عام آدمی پارٹی کے شانت بھوشن نے کہا ہے کہ کشمیر میں ایک ریفرنڈم کروایا جائے جس سے پتہ چلے کہ کشمیری عوام بھارتی فوج کی تعیناتی کے حق میں ہیں یانہیں۔ بھوشن نے ہرگز یہ نہیں کہا یہ ریفرنڈم کشمیریوں کوآزادی کا فیصلہ کرنے کے لئے کروایا جائے۔جب اس پر ہرطرف سے اعتراض وارد ہوا تواس کوکہنا پڑا کہ دستور ہند کے تحت کشمیر کے مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔اوردستور ہند کا آرٹیکل 370 اپنی جگہ پرایک اٹل حقیقت ہے۔پچھلے دسمبر میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر نریندر مودی نے بھی تجویز پیش کی تھی کہ آرٹیکل 370 پرنظرثانی کے لئے بحث کی جائے،اس نے کہا کہ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس آرٹیکل کی وجہ سے کشمیریوں کی زندگی میں کوئی بنیادی اور قابل ذکرفرق واقع ہوایانہیں، خاص طور پر کشمیری خواتین کومساوی حقوق حاصل ہیں یانہیں۔اس نے سوال کیا کہ کیاوزیراعلیٰ کشمیرعمرعبداللہ کی بہن سارا کووہی حقوق حاصل ہیں جوخودوزیراعلیٰ کوحاصل ہیں،اس پر کشمیری وزیراعلیٰ عمرعبداللہ نے من موہن سنگھ اور سونیا گاندھی کی موجودگی میں نریندر مودی کومخاطب کرتے ہوئے چیلنج کیا کہ کوئی مائی کالال اس آرٹیکل سے چھیڑ چھاڑنہیں کرسکتا۔اس نے مزید کہا کہ مودی کونہ آرٹیکل 370 کا پتہ ہےاورنہ کشمیری خواتین کے حقوق کاعلم ہے۔تو یہ ہے وہ بحث جو بھارت کے مستقبل کی مئوثر سیاسی پارٹیوں کی قیادت کے مابین چل رہی ہے۔ بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی من موہن،مشرف سمجھوتے کا ذکرنہیں کررہا۔اورہم بھی نان اشوز میں الجھ کرلاکھوں کشمیریوں کی عذابناک زندگی سے لاتعلق ہیں جن کا وطن بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔(9 جنوری 2014ء)

کشمیر کا من موہنا حل

من موہن سنگھ نے گزشتہ جمعہ کو ایک میڈیا بریفنگ میں بہت بڑا انکشاف کیا، اس پر بھارت میں ایک واویلا مچ گیا مگر پاکستان میں کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

بھارتی وزیراعظم نے کہا کہ مشرف دور میں کشمیر کے حل کے قریب پہنچ گئے تھے لیکن پھر پاکستان میں عدلیہ اور وکلا تحریک نے سارا کچھ درہم برہم کر دیا اور تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔ برصغیر میں قیام امن کا سنہری موقع ضائع ہو گیا۔

بھارت اور کشمیر کے مسئلے کا حل، یہ سوچا بھی کیسے جا سکتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں لیکن اس کے باوجود بھارتی وزیراعظم نے ایک دعوی کیا، وہ ایک ذمے دار منصب پر فائز ہیں اور ان کی باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان میں اس بیان پر کوئی ہلچل نہیں مچی مگر بھارت میں ہاہا کار مچ گئی، راجہ سبھا میں بی جے پی کے رہنما ارون جیتلے نے سوال کیا کہ جب آئین کے تحت مقبوضہ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیا جا چکا ہے اور 1994 میں پارلیمنٹ کی ایک متفقہ قرارداد کی رو سے آزاد کشمیر کو بھی بھارت کا حصہ قرار دیا گیا تھا تو پھر کیسا سمجھوتہ، جیتلے نے کہا کہ وزیراعظم قوم کو بے وقوف نہ بنائیں، وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی کوئی سوانح عمری لکھ کر رائلٹی کمانے کے چکر میں ہیں تو اپنے ارمان پورے کرتے رہیں لیکن وزیراعظم کے طور پر اگر انہوں نے کشمیر کے حل کا دعوی کیا ہے تو انہیں صاف صاف بتانا ہوگا کہ آئین اور پارلیمنٹ کی پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ آسمان سے تارے توڑنے کی باتیں کس طرح کر رہے ہیں۔ جیتلے نے سخت الفاظ میں من موہن سنگھ سے پوچھا کہ وہ بھارت کے اقتدار اعلی پر کوئی سودے بازی کیسے کر سکتے ہیں۔ ارون جیتلے نے کہا کہ منموہن سنگھ نے وزارت عظمی کے منصب کو داغدار کر دیا ہے۔

نئی دہلی میں حکومت بنانے والی آپ سرکار کے ایک اعلی عہدیدار نے ایک اور پخ لگائی۔ان کا نام پرشانت بھوشن ہے۔انہوں نے کہا کہ اگر اگلے عام انتخابات میں ان کی پارٹی مرکز میں برسراقتدار آ گئی تو نئی دہلی جیسا ریفرنڈم کشمیر میں بھی کروایا جا سکتا ہے اور کشمیری عوام سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ بھارتی افواج کی موجودگی کے حق میں ہیں یا نہیں۔کشمیری عوام کی مرضی کے خلاف کوئی بھی فیصلہ غیر جمہوری ہوگا۔اگر کشمیری عوام سمجھتے ہیں کہ بھارتی فوج انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو رہی ہے تو فوج کو وہاں سے واپس بلا لیا جانا چاہیے۔بھوشن نے یہ بھی کہا کہ حکومت صرف یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ فوج کو سرحدوں کی نگہبانی کے لئے فریضہ سونپا جائے یا دراندازی روکنے پر مامور کیا جائے یا اسے اقلیتوں کے دفاع پر مامور کیا جائے لیکن شہروں، قصبوں اور دیہات میں امن و امان کو کنٹرول کرنے کے لئے فوج کی تعیناتی کا کوئی حق، حکومت کو حاصل نہیں ہے۔بھوشن صاحب اس سے پہلے ستمبر 2011 میں کہہ چکے ہیں کہ کشمیر میں استصواب کا انعقاد کیا جائے۔ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر کشمیریوں نے یہ فیصلہ دے دیا کہ وہ بھارت سے الگ ہونا چاہتے ہیں تو بھوشن کہتے ہیں کہ ہمیں انکے دل جیتنے کی کوشش کرنی چاہیئے، علیحدگی کا حق تو انہیں نہیں دیا جا سکتا۔ہمیں کوئی بھی حل آئین کے اندر رہتے ہوئے تلاش کرنا چاہیئے۔گویا جو ایک بھارتی رہنما استصواب کی بات کرتا ہے وہ بھی کشمیر کو بھارت کے چنگل سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا۔

مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیراعلیٰ عمر عبداللہ نے بھوشن کے بیان پر اعتراض کیا ہے کہ ان کی حکومت کو دہلی میں دور بیٹھے کیا پتہ ہے کہ کشمیر کو کیسے چلانا ہے، اس کا فیصلہ صرف اور صرف سری نگر کی حکومت کرنے کی اہل ہے۔

بی جے پی کے ترجمان سدھارتھ ناتھ سنگھ نے کہا ہے کہ بھوشن ایک ایسی زبان ستعمال کر رہے ہیں جس سے علیحدگی اور ملک توڑنے کی بو آتی ہے۔یہ زبان تو کشمیری علیحدگی پسند بولتے ہیں۔آپ سرکار کو ان کے ہاتھ کھلونا نہیں بننا چاہیئے۔جب تک سرحد پار سے دراندازی کے امکانات ختم نہیں ہوتے، بھارتی افواج میں کمی انتہائی تباہ کن ثابت ہوگی۔

سابق بھارتی آرمی چیف وی پی ملک بھی بھوشن پر حملہ آور ہونے میں پیچھے نہیں رہے۔ان کے بقول جن لوگوں کو کشمیر کے سیاسی حالات اور دفاعی خطرات کا ذرہ بھر احساس نہیں، وہ نت نئے مشورے دینے میں پیش پیش ہیں۔بھوشن کو کشمیر میں بیرونی مداخلت کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔

راجوڑی میں بھارتی فوجوں کے سابق کمانڈر میجر جنرل جی ڈی بخشی نے بحث میں کودتے ہوئے کہا ہے کہ کہ بھوشن صاحب نہیں جانتے کہ جونہی افغانستان سے امریکی افواج کا انخلا مکمل ہوا تو دنیا بھر کے مجاہدین کا رخ کشمیر کی طرف مڑ جائے گا۔

کشمیر کی صرف ایک لیڈر محبوبہ مفتی کی پارٹی، پی ڈی پی نے بھوشن کی تجویز کو سراہا ہے۔ پارٹی کی ترجمان سمیر کول نے کہا ہے کہ ہمیں بھوشن کے یہ خیالات سن کر خوشی ہوئی ہے کہ کشمیر سے بھارتی افواج کے مستقبل کا تعین کرنے کے لئے استصواب کروایا جائے۔

یہ ہے وہ منظر نامہ جو کشمیر کے مسئلے پر اس وقت بھارت میں دیکھنے کو ملتا ہے، میں نے وہاں کے ہر طبقہ فکر کی آرا پیش کر دی ہیں۔ اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے کہ کشمیر پر ہمارا پڑوسی دشمن ملک کیا سوچ رکھتا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ بھارت کی ایک بڑی جماعت کانگرس نے اس موقع پر اپنی زبان بند رکھنے کو ترجیح دی ہے، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اسے اگلے الیکشن میں اپنی کشتی ڈوبتی نظر آتی ہے اور وہ حالات کے دھارے سے اپنے آپ کو کٹتا دیکھ کر کشمیر کے ممکنہ حل پر خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے اور ماضی کا قصہ چھیڑ کر اپنے سر پر کلغی سجانا چاہتی ہے۔ حالانکہ جو کام اس کے ہاتھوں انجام کو پہنچا نہیں، اس کا کریڈٹ اسے کون لینے دے گا۔ بی جے پی کے راہنماؤں نے من موہن سنگھ کی میڈیا بریفنگ میں بلند بانگ دعووں پر یہی کہا ہے کہ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ (8 جنوری 2014ء)

کشمیری یوم شہدا

رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی۔

اب ہم کوئی نہ کوئی یوم منانے کی رسم پوری کرنے کے لئے زندہ ہیں۔ ہفتہ 13 جولائی کو دنیا بھر میں یوم شہدائے کشمیر منایا گیا، ڈوگرہ مہاراجہ کی سیکورٹی فورسز نے بے رحمی سے فائر کھول دیا اور آزادی کی تڑپ سے سرشار کشمیریوں کو شہید کر دیا گیا۔ یہ کشمیر کی تحریک آزادی کا آغاز تھا، تب سے اب تک بے گناہوں کا خون مسلسل بہایا جا رہا ہے۔ کشمیر کی سرزمین کے افق پر اسی سرخی کا رنگ غالب ہے۔ یہ خون کشمیری نوجوانوں کی آنکھوں میں اتر آتا ہے تو وہ دیوانہ وار سامراجی طاقتوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ ایک لاکھ سے زاید قبروں کے سرہانے شہیدوں کے نام کندہ ہیں۔ کشمیر کا نوحہ کون لکھے گا اور شہیدوں کا شاہنامہ کون لکھے گا، اب تو ایسی جسارت کرنے والے کو عالمی سطح پر دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر سے انگریز رخصت ہونے لگا تو آزادی کے فارمولے میں طے کر دیا گیا تھا کہ مسلم آبادی کی اکثریت والے ملحقہ علاقے پاکستان کا حصہ ہوں گے مگر ایک بار پھر کشمیری مہاراجہ نے غداری اور بے اصولی کا ارتکاب کیا اور بھارت سے الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیئے جس پر عمل درآمد کے لئے بھارتی فوجیں سری نگر اتر گئیں۔ پاکستان کے آرمی چیف نے قائداعظم کی حکم عدولی کی تو قبائلی لشکر نے کشمیر میں موجود بھارتی لشکر کو للکارا، قریب تھا کہ وہ سری نگر ایئرپورٹ پر قابض ہو جاتے اور بھارت کی سپلائی لائن کاٹ کر رکھ دیتے کہ بھارت نے چالاکی اور عیاری سے سلامتی کونسل کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ بھارت کو فائدہ پہنچانے کے لئے جنگ بندی کی قرارداد منظور ہوگئی مگر اس میں طے کیا گیا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ایک آزادانہ، غیر جانبدارنہ استصواب کے ذریعے کیا جائے گا، وہ دن، آج کا دن، بھارت نے اس قرارداد پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آنے دی، اس نے جب کبھی ریاستی انتخابات کروائے تو یہ دعوی کر دیا کہ یہی استصواب ہے۔ دنیا نے اس کے ڈھونگ کو تسلیم کیا۔ پاکستان کی حکومتیں عالمی سطح پر اس

مسئلے کو اجاگر نے میں ناکام رہیں۔ جنرل مشرف کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری آج بھی مصر ہیں کہ عدلیہ اور وکلا تحریک نہ چلتی تو کشمیر کا مسئلہ طے ہو چکا ہوتا، اس کے لئے ایک معاہدہ طے کر لیا گیا تھا اور محض شین قاف درست کی جا رہی تھی کہ پاکستان اندرونی عدم استحکام سے دوچار ہو گیا۔ خورشید قصوری کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس معاہدے کا مسودہ تو قوم کے سامنے لائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ اس کے ذریعے یہ مسئلہ طے ہونا تھا یا تہہ ہونا تھا۔

نائن الیون کے سانحے نے مسلم دنیا میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، کشمیر کی تحریک آزادی ہو، چیچن مسلمانوں کی جدوجہد ہو، فلسطین کا سنگین مسئلہ ہو، مورو مسلمانوں کی طویل جنگ آزادی ہو، یہ سب کچھ دہشت گردی کے زمرے میں چلا گیا۔ نائن الیون کے بعد ایک صلیبی جنگ کا بگل بجا جس کا نشانہ بظاہر القاعدہ تھی لیکن اصل میں ساری مسلم دنیا اس کا ٹارگٹ بنی، غیر ملکی ایئر پورٹوں پر ہر ڈاڑھی والے کی شامت آ گئی، محمد اور احمد کے ناموں کی اسکریننگ کی جاتی اور انہیں خصوصی تفتیش کا نشانہ بنایا جاتا، عام مسلمانوں کو ہوائی اڈوں میں سرعام لباس اتارنے کا حکم دیا جاتا اور ذرا شک ہوتا تو جوتے تک اتروا لئے جاتے۔ امریکی اور اتحادی فوجوں نے افغانستان اور عراق پر قابض ہو کر بے گناہوں کا قتل عام کیا اور پاکستان کو ڈرون حملوں سے لے کر خودکش دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا جبکہ نائن الیون میں کسی پاکستانی کا دور و نزدیک تک تعلق نہ تھا۔ اس پس منظر میں مسئلہ کشمیر پس منظر میں دھکیل دیا گیا۔

کشمیر میں آج بھی خون ناحق بہہ رہا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں بھارتی فوجیں اس چھوٹی سی ریاست کے کونے کھدرے میں شب روز چھاپے مارتی ہیں اور جس کو چاہے گولیوں سے بھون دیتی ہیں۔ یا خفیہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیتی ہیں، کشمیری قیادت پر جبر کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ مسجدیں شہید کی جاتی ہیں، مزاروں کو آگ دکھائی جاتی ہے، کھیتیوں پر بلڈوزر چلا دئے جاتے ہیں۔ دکانوں کو مسمار کر دیا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں ایک منظم سازش کے تحت نسل کشی کی جا رہی ہے۔ دنیا تو ہٹلر کے ایک ہولوکاسٹ کو روتی ہے، کشمیر میں آئے روز ہولوکاسٹ کا ہولناک منظر رونما ہوتا ہے۔ کشمیریوں کی نوجوان نسل کو چن چن کر شہید کیا جا چکا ہے اور بھارتی استبداد کی کوشش ہے کہ دس بیس برس بعد کشمیر کا نام لیوا کوئی نہ ہو۔ کیا ہم پاکستانی اپنے فرض کی ادائیگی میں سنجیدہ ہیں۔ کشمیر میں ہمارے مسلمان بھائی بند شہید ہو رہے ہیں۔ ہم نے تو سندھ میں ایک مظلوم لڑکی کی پکار پر راجہ داہر کا قلع قمع کر دیا تھا، اب کشمیری خواتین ہر روز ہمیں پکارتی ہیں اور ہمارا

طرز عمل یہ ہے کہ ہم انڈیا میں شہریار خاں کو نمایندہ خصوصی کے طور پر بھیج کر دوستی کا پیغام دیتے ہیں۔ ہمارے وزیراعظم کی خواہش تھی کہ ان کی رسم حلف برداری میں بھارتی وزیراعظم شرکت فرمائیں، یہ بھی کہا کہ بھارت بلائے یہ نہ بلائے، میں بھارت کو دورہ ضرور کروں گا۔ سیفما کے اجلاس میں میاں نواز شریف جو کچھ کہہ چکے، اس کو میرا قلم اپنی نوک پر لانے کا روادار نہیں ہے۔ ہماری قوم نے محترمہ بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے مابین مسکراہٹوں کے تبادلے پر خفگی کا اظہار کیا، سارک کانفرنس کے لئے راجیو اسلام آباد آئے تو محترمہ نے سڑکوں سے کشمیر ہاؤس کا بورڈ اتروا دیا، پی ٹی وی سے کشمیری خبرنامہ اڑا دیا اور سری نگر کے موسم تک کا احوال بیان کرنا ترک کر دیا۔ کیا پی پی پی اور پاکستان کی بانی جماعت ہونے کی دعویدار مسلم لیگی جماعت کے درمیان انڈیا سے دوستی کے بارے میں کوئی فرق نہیں، کیا دونوں کو کشمیریوں کے خون کی کوئی پروا نہیں۔ میاں نواز شریف اپنے آپ کو کشمیری نژاد کہتے ہیں تو وہ کشمیریوں کی ابتلا کو کیوں بھول رہے ہیں، انکے میڈیا کے امور کے ایک مصاحب وانی صاحب ہیں، وہ بھی نام سے تو کشمیری لگتے ہیں ہیں۔ تو ان سے کشمیریوں کے بے پناہ توقعات ہیں، اگر وزیراعظم کشمیریوں کو بھارتی تسلط سے آزاد کرا دیں تو پھر نئی دہلی کے وارے نیارے جانے کا شوق پورا کر لیں، اس سے کھل کر تجارت کریں، وفود کے تبادلے کریں۔ ٹاپ کرنے والے طالب علموں کو یورپ بھیجنے کے بجائے علی گڑھ بھجوائیں یا ڈیرہ دون۔ پیسہ بھی بہت بچے گا۔

بھارت نے پاکستان کے حصے کا پانی بھی روک رکھا ہے، وہ پاکستان کو بنجر بنانے پر تلا ہوا ہے۔ کون ہے جو بھارت کی اس آبی جارحیت سے آگاہ نہیں، وزیراعظم اور وزیراعلیٰ پنجاب لوڈ شیڈنگ کے عذاب پر تڑپ رہے ہیں تو پھر جس بھارت نے ہمیں اس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، اس کی دوستی کی تڑپ کیوں، کشمیری شہدا کے خون کا ہی کچھ خیال کریں۔ (14 جولائی 2013ء)

بھارت کا یوم سیاہ!!

ممتاز کشمیری حریت پسند رہنما سید علی گیلانی نے یہ کہا تو غلط نہیں کہا کہ بھارتی تسلط کے خلاف کشمیریوں نے ریفرنڈم میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ یہ 26 جنوری کا دن تھا، بھارت اسے اپنا یوم جمہور یہ سمجھتا ہے لیکن کشمیری ہر سال اس دن کو بھارت کے یوم سیاہ کے طور پر مناتے ہیں۔ ہڑتال کرنے کا ہنر کوئی کشمیریوں سے سیکھے، کیا مجال کوئی دکان، کوئی مکان، یا کوئی دفتر کھلا ہو، کسی سڑک پر سائیکل تک رینگتی دکھائی دے، ایسا شٹر ڈاؤن اور کہیں نہیں ہوتا ہوگا، کشمیری ہر سال یہ ریفرنڈم جیت جاتے ہین، مگر بھارت بڑا ڈھیٹ ہے، اسے کوئی پروا نہیں کہ ایک پوری ریاست کی سوچ کیا ہے، اس کے عوام کی امنگیں کیا ہیں، چناروں کے جنگل میں متحرک سایوں کے اندر کیا طوفان مچل رہے ہیں، ڈل جھیل کی لہریں کیسے کرب کے ساز چھیڑ رہی ہیں۔

جب دیوار برلن گری تھی اور دنیا میں تبدیلی کی تیز رفتار ہوائیں چلی تو پاکستان کی ایک بیٹی جو اس وقت ملک کی وزیر اعظم بھی تھی، سینز فائر لائن پر پہنچی، ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس نے اپنا آنچل ہوا میں لہراتے ہوئے عالم وارفتگی میں نعرے بلند کئے: آزادی! آزادی! آزادی! یہ دختر مشرق محترمہ بے نظیر بھٹو تھیں اور پھر کشمیری اپنے ادھورے خواب کی تکمیل کے لئے ایسے متحرک ہوئے کہ قبرستانوں میں نئی قبریں ابھرنے لگیں، وادی میں ان دنوں صرف اسی ہزار فوج تھی، آج یہ آٹھ لاکھ ہے اور ایک لاکھ شہدا کی قبریں بھی کشمیریوں کے قربانی کی داستان سناتی ہیں۔ اور اجتماعی قبریں تو بے حد وحساب ہیں، ریاستی پولیس نے عدالت میں اقرار کیا ہے کہ ان کے کوائف فراہم کرنے سے امن عامہ کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ مشرف دور میں بھارت اور پاکستان نے کشمیر کے مسئلے کے حل پر غور کیا تو پاکستان کی یہ پیش کش ریکارڈ پر ہے کہ جن بھارتی خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی گئی اور جو اس صدمے میں گرفتار ہیں، ان کی نفسیاتی بحالی کے لئے پاکستان مدد کے لئے تیار ہے۔ پچھلے باسٹھ برس میں بھارتی قابض فوج نے کیا جبر نہیں کیا، چنگیز اور ہٹلر بھی

شاید اس پر شرمندہ ہوں گے، لیکن بھارت ٹس سے مس نہیں ہوتا کیونکہ وہ جمہوریت کی ماں ہے، اسے حق حاصل ہے کہ وہ جمہوری اصولوں کی نفی کرے، کشمیریوں کے جمہوری حقوق کو تاراج کرے، ان کی کھیتیوں، ان کی مسجدوں، ان کے گھروں، ان کے مزاروں کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دے۔ بھارت نسل کشی کا مجرم ہے، اس نے کشمیر کی ایک جوان نسل کا گلا گھونٹ کر تحریک آزادی کو دبانے کی کوشش کی ہے، اس کا خیال ہے کہ بوڑھے اکیلے کیا کر لیں گے لیکن علی گیلانی، یاسین ملک اور شبیر احمد نے استقامت کا وہ مظاہرہ کیا ہے کہ ان پر کئی شاہنامے قربان کئے جا سکتے ہیں۔

کشمیر کا مقدمہ کیا ہے، یہ سارا قضیہ کیا ہے، غور کیا جائے تو بہت سادہ! کشمیر پاکستان سے ملحق مسلم اکثریت کی ایک ریاست ہے، تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت اسے پاکستان کا حصہ بننا تھا، مگر ریاست کے غیر مسلم مہاراجہ نے غیر قانونی طور پر بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ بھارت نے ناجائز تسلط کے لئے اپنی فوجیں اتار دیں۔ اس ناجائز قبضے میں آسانی پیدا کرنے کے لئے ریڈکلف نے باؤنڈری لائن آخری لمحات میں تبدیل کر دی، فیروز پور، امرتسر، گورداسپور کے مسلم اکثریتی علاقے بھارت کو دے دئے، اس طرح بھارت کا کشمیر سے زمینی رابطہ استوار ہو گیا، یہ سازش کی پہلی کڑی تھی اور جب اس مسئلے پر دونوں ملکوں میں جنگ چھڑی تو بھارت خود سلامتی کونسل گیا جس نے سیز فائر کی قرارداد اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ، غیر جانبدارانہ استصواب کروایا جائے گا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اس شرط کو قبول کیا لیکن اس پر عمل کرنے سے گریز کی راہ اختیار کی، جس سے کشمیریوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی، پاکستان ایک کمزور فریق تھا، وہ کشمیریوں کی مادی مدد کے قابل نہیں تھا، اخلاقی، سفارتی مدد کشمیریوں کے کام نہ آئی، ایک دو بار پاکستان نے طاقت سے بھی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر دیکھی لیکن اس کے لئے فضا سازگار نہ تھی، کارگل کی جنگ نے البتہ خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں۔ دنیا کو تشویش لاحق ہوئی کہ اگر ایٹم بموں سے لیس دونوں ملک ایک مکمل جنگ میں الجھ گئے تو برصغیر کی ڈیڑھ دو ارب کی آبادی کا تذکرہ محض تاریخ کے صفحات تک محدود ہو جائے گا، جغرافئے میں ان کا کہیں اتا پتا نہیں چلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی پارلیمنٹ پر حملے اور ممبئی سانحے کے بعد جب دونوں ملکوں کی فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہوئیں تو عالمی طاقتوں نے اس آویزش کو پھیلنے سے روک لیا لیکن دنیا پر واضح رہنا چاہیئے کہ جب تک مسئلہ کشمیر سلگ رہا ہے، برصغیر کے خرمن امن کو کسی بھی وقت نقصان پہنچ سکتا ہے۔

دنیا میں دہشت گردی اور آزادی کی جنگ کو بھی گڈ مڈ کر دیا گیا ہے، کوئی بھی اس فرق کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ بدقسمتی سے کشمیریوں کی تحریک کو بھی دہشت گردی کے زمرے میں شمار کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ مجاہدین کے لئے تربیتی کیمپ بند کر دے، جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کر دے، جہاد کے لئے فنڈ اکٹھا کرنا بھی ممنوع قرار پایا، اس طرح کشمیری عوام یکہ و تنہا رہ گئے۔ اور بھارت ان کو کچلنے کے لئے آزاد ہو گیا۔ پچھلے بارہ برس سے بھارت، کشمیر کے مسئلہ کو زیر بحث لانے کے لئے بھی تیار نہیں، اب دنیا اس مسئلے کا ایسا حل تھوپنے کی کوشش میں ہے جس سے کشمیریوں کا اصل مسئلہ پس پشت چلا جائے، کنٹرول لائن کھول کر بچھڑے ہوئے خاندانوں کو آپس میں ملنے کی اجازت دینے تک یہ مسئلہ محدود کر دیا گیا ہے، کشمیریوں کو محدود پیمانے پر باہمی تجارت کا موقع بھی دیا گیا اور مظفر آباد، سری نگر بس بھی چلا دی گئی ہے جو زیادہ عرصہ بند رہتی ہے، امریکہ کے نزدیک کشمیر کے مسئلے کا حل یہی ہے جبکہ پاکستان کا ایک ہمسایہ دوست چین بھی مسلح جدوجہد کے خلاف ہے، اس کا کہنا ہے کہ اس نے ہانگ کانگ کے لئے پچاس برس انتظار کیا اور تائیوان کی واپسی کے لئے اگلے پچاس برس تک صبر کرے گا لیکن چین بھول جاتا ہے کہ ان دونوں علاقوں پر کسی کا ناجائز قبضہ نہیں اور اسے بھارت جیسے کسی عیار سے واسطہ نہیں پڑا۔ ان حالات میں پاکستان اور کشمیریوں کے سامنے سوائے مذاکرات کے اور کوئی راستہ نہیں لیکن بھارت اس مسئلے پر بات کرنے سے ہی انکاری ہے، وہ فوجی طاقت کے بل پر اپنا ناجائز تسلط برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اگر یو این او نے بھی آزادی اور دہشت گردی کے فرق کو واضح کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تو کشمیری مجبور ہوں گے کہ ہر سال یوم سیاہ منا کر اپنے جذبات کی تسکین کریں، فلسطین کے ساتھ بھی یہی ظلم روا رکھا گیا اور اب یہی تجربہ کشمیر میں بھی دہرایا جا رہا ہے، جبکہ دیوار برلن کے انہدام اور سوویت روس کی شکست و ریخت کے بعد درجنوں ممالک نے آزادی حاصل کی ہے۔ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے۔۔۔۔ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔ (30 جنوری 2012ء)

سیسل چودھری کو سلام

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بہار کا آسمان راتوں کو اچانک رونے کیوں لگتا ہے۔ پھر اچانک میں نے ایک سنگل سطری خبر پڑھی کہ 65 کی جنگ کے ہیرو گروپ کیپٹن سیسل چودھری کی زندگی بچانے کے لئے لاہور کے فوجی ہسپتال میں ان کو مشینوں پر منتقل کر دیا گیا ہے اور محض چوبیس گھنٹے کی کشمکش کے بعد وہ زندگی کی بازی ہار گئے، گزری رات لاہور کا آسمان پھر رو دیا۔ لاہور کی جیل روڈ اور ظفر علی روڈ کے سنگم پر واقع گورا قبرستان ہمیشہ پھولوں کی مہک سے لبریز دکھائی دیتا ہے مگر 15 اپریل کو اس میں ایک سدا بہار پھول کا اضافہ ہوا، جس نے گورا قبرستان کو ایک نئی پاکیزگی، ایک نیا تقدس اور ایک نیا احترام بخشا ہے۔ اس پھول کے رنگوں سے لاہور ہی نہیں، پورا وطن قوس قزح کے رنگوں میں نہا گیا ہے۔

ہمارے بزرگ صحافی دوست ایف ای چودھری وہیل چیئر پر آخری رسومات میں شریک ہوئے۔ سیسل کی تین بیٹیاں، مشعل، کیرول، میرلن اور دو بیٹے، سیسل ایس چودھری اور ایان ایلڈرڈ بھی اپنے عظیم باپ کی میت کے سرہانے سر جھکائے کھڑے تھے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان کے باپ نے ان کو کس قدر سر بلند کر دیا ہے۔ مجھے صرف اس بات پر فخر ہے کہ میں نے نو سال قبل اس عظیم انسان سے چند منٹ تک ٹیلی فون پر گفتگو کی تھی۔ سیسل چودھری ستارہ جرات 65 کی جنگ کے ہیرو کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ جب بھی چھ ستمبر کے پاکیزہ لمحات کا ذکر ہوگا، تو سیسل چودھری کا اسم گرامی اس شاہنامے کے صفحات میں سنہری حروف میں چمکے گا۔ سیسل چودھری اس فارمیشن کا حصہ تھے جس نے چار جہازوں کے ساتھ اسکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی کی قیادت میں ہلواڑہ کے بھارتی اڈے کو تہس نہس کرنا تھا۔ آخری لمحات میں ایک جہاز اڑان نہ کر سکا چنانچہ باقی تین جہاز اس مشن پر روانہ ہوئے جو انتہائی دشوار تھا، اس لئے کہ چوتھے جہاز کی مرمت میں مصروفیت کی وجہ سے روانگی میں ایک گھنٹے کی تاخیر ہو گئی تھی، اس دوران میں ہماری ایک فارمیشن پٹھانکوٹ

کے بھارتی اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی تھی۔ اسکواڈرن لیڈر رفیقی، فلائٹ لیفٹننٹ سیسل چودھری اور فلائٹ لیفٹننٹ یونس حسن جب دشمن کی فضائی حدود میں داخل ہوئے تو پٹھان کوٹ کے معرکے سے واپس آنے والے فارمیشن نے انہیں خبردار کیا کہ دشمن کے ہنٹر طیارے بڑی تعداد میں فضا میں موجود ہیں۔ مگر خلاف توقع ہلواڑہ کی طرف محو پرواز تینوں سیبر طیاروں کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تاریکی تیزی سے پھیل رہی تھی، ہمارے جہاز صرف پندرہ سوفٹ کی بلندی پر تھے، انہیں زمین پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ قاعدے کے مطابق انہیں پینتیس سوفٹ کی بلندی سے دشمن پر وار کرنا تھا۔ انہوں نے حملے کی پوزیشن اختیار کی، سیسل چودھری کا جہاز زمین سے دوسوفٹ بلند تھا کہ انہیں دشمن کا ایک ٹرانسپورٹ طیارہ نظر آیا، انہوں نے اپنے لیڈر کو اس کے بارے میں بتایا۔ سیسل کے وائرلیس سیٹ پر لیڈر کی ہدائت موصول ہوئی کہ اسے بھول جاؤ، ہمیں اس سے بہتر نشانے ملیں گے۔ مگر اگلے پانچ منٹ تک وہ دشمن کی فضا میں چکر کاٹتے رہے، اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے انہیں زمین پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب جنگی جہاز، جدید دور کی نیوی گیشن کی سہولتوں سے لیس نہ تھے اور کاک پٹ میں بیٹھے، ہوا باز کو اپنی آنکھوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ سیسل چودھری نے ایندھن کے فالتو ٹینک زمین پر گرا دیئے، رفیقی نے حسن کو ہدائت کی کہ وہ ابھی اپنے فالتو ٹینک نہ گرائے، رفیقی کو اندیشہ تھا کہ جنگ طول پکڑ گئی تو پاک فضائیہ کو فالتو ٹینکوں کی زیادہ سے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ اسی دوران میں سیسل کے کاک پٹ میں وائرلیس سیٹ پر رفیقی کی آواز گونجی: دو ہنٹر، بارہ بجے کی بلندی پر، ان پر نظر رکھیں۔ اس وقت سیبر جہاز سیدھی اڑان میں تھے اور ان کی بلندی سو سے ڈیڑھ سوفٹ تک تھی۔ یونس کی آواز آئی: لیڈر، ہمیں ان کو نشانہ بنانا چاہئے۔ رفیقی نے جواب دیا: ٹھیک ہے، سیسل، آپ بائیں والے کو نشانے پر لو اور میں دائیں والے سے نبٹتا ہوں۔ ڈاگ فائٹ کے دوران یونس اور سیسل اپنے لیڈر کے عقب میں دائیں بائیں گھومتے رہے۔ رفیقی کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون، کس جانب ہے۔ جبکہ اس کی کمان میں دونوں ہوابازوں کی توجہ ایک ہی نکتے پر مرکوز تھی کہ وہ جان پر کھیل کر اپنے کمانڈر کی حفاظت کریں گے۔ یونس نے اس دوران تجویز پیش کی کہ لیڈر بائیں والے ہنٹر کو نشانہ بنائے اور وہ دائیں والے پر جھپٹے گا۔ سیسل نے وائرلیس پر کہا، ایلفا، تمہارا عقب کلیئر ہے، فائر کرو۔ سیسل نے دیکھا کہ بائیں جانب والا ہنٹر آگ کے شعلے میں تبدیل ہو کو نیچے گر رہا ہے۔ یونس نے ابھی تک فائر نہیں کھولا تھا، رفیقی پوچھنے ہی والا تھا کہ یونس نے ایکشن کیوں نہیں لیا کہ سیسل کی آواز گونجی: دو مزید ہنٹر سامنے آ گئے ہیں۔ رفیقی نے

ہدائت دی: ان کو الجھاؤ۔ سیسل کی پھر آواز گونجی: بائیں طرف سے دو اور ھنٹر آ گئے ہیں اور ان کے پیچھے دو اور طیارے ہیں۔ رفیقی نے کہا: راجر، میرا عقب کلیئر رکھو۔ اس وقت تین اور ایک کا مقابلہ تھا لیکن کمانڈر انتہائی پر اعتماد تھا۔ دشمن کی سرزمین پر لڑائی ہو رہی تھی اور سارا شہر اپنی ایئر فورس کے پٹنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس اثنا میں یونس دوسرے ہنٹر کا پیچھا کرتے ہوئے ان سے الگ ہو گیا۔ ابھی تک یونس اور رفیقی نے ایندھن کے فالتو ٹینک نہیں گرائے تھے۔ رفیقی دو ہنٹروں کے پیچھے آ چکا تھا، اس نے فائر کھولا لیکن، میرے خدایا۔۔ اس کی گنیں جام ہو چکی تھیں۔ رفیقی کی آواز گونجی: سیسل، میری گنیں کام نہیں کر رہیں، اب تم کمان سنبھالو۔ اس وقت تک تاریکی گہری ہو گئی تھی، گنیں جام تھیں اور جنگی اصولوں کے تحت رفیقی کو واپسی کی راہ لینا چاہئے تھی لیکن اس صورت میں یونس پیچھے اکیلا رہ جاتا اور وہ دشمن کے نرغے میں آ کر آسانی سے شکار ہو سکتا تھا۔ سیسل، اپنے جہاز کو اگلی پوزیشن میں لے جا چکا تھا کہ یہ اس کے کمانڈر کا حکم تھا۔ اس نے دیکھا کہ بائیں جانب چار ھنٹر ہیں اور دائیں جانب دو ھنٹر۔ رفیقی کی آواز گونجی: تمہارا عقب کلیئر ہے۔ سیسل دائیں جانب کے دو ہنٹروں پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ پہلا ہنٹر دم دبا کر بھاگ نکلا لیکن دوسرا ہنٹر نشانے پر آ گیا۔ اس کے پائلٹ نے جان بچانے کے لئے کاک پٹ سے چھلانگ لگا دی۔ سیسل نے اپنے ساتھیوں کو پکارا مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ ابھی تک سو سے ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر تھا، چند لمحوں کے لئے اسے اپنے اردگرد کچھ نظر نہ آیا، پھر اسے محسوس ہوا کہ دو ہنٹر طیارے اس پر فائر کھول چکے ہیں۔ سیسل نے غوطہ لگایا۔ دونوں ہنٹر اس کے اور زمین کے درمیان سینڈوچ ہو چکے تھے۔ اگلا جہاز اس کے نیچے سے نکل گیا لیکن دوسرا جہاز زمین کے بہت قریب تھا، وہ ڈگمگانے لگا۔ سیسل نے اپنا جہاز اوپر اٹھایا، جہاز کی رفتار کم کر کے اسے ایک سو بیس ناٹ پر لے آیا۔ حسب توقع ہنٹر بھی اوپر اٹھا اور عین اس کے سامنے آ گیا، سیسل نے ٹریگر دبایا۔ ھنٹر آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گیا، سیسل آگ کے اس مرغولے کو چیرتا ہوا اوپر اٹھا۔ اسے رفیقی نظر نہیں آ رہا تھا، اچانک اس نے دیکھا کہ ایک سیبر اور ہنٹر قینچی کی طرح ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہیں۔ سیبر نے فائر کھولا اور ہنٹر منہ کے بل زمین پر آن گرا۔ یونس بہت اچھا نشانہ باز تھا، سیسل نے وائرلیس پر پوچھا: کیا تم نے ہنٹر مار گرایا ہے۔ یونس نے اثبات میں جواب دیا۔ سیسل نے کہا۔ تمہارے پیچھے دو اور ہنٹر آ گئے ہیں۔ سیسل نے محسوس کیا کہ یونس کا طیارہ ہٹ ہو گیا ہے۔ اسے آگ لگ چکی تھی، سیسل نے کئی مرتبہ یونس کو پکارا، اس اثنا میں دو ہنٹر فضا میں نمودار ہوئے، سیسل نے ایسی پوزیشن اختیار کی کہ ھنٹر اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس نے

ان کا پیچھا کیا۔ ہنٹر دب دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے، ہلواڑہ کی سرزمین، پانچ ہنٹرز کے قبرستان میں تبدیل ہو گئی تھی، سیسل کا کمانڈر رفیقی اور ساتھی یونس بھی شہید ہو چکے تھے، اس سانس روک دینے والے معرکے کی تفصیلات یہاں ختم نہیں ہوتیں، یہ 1971 کی جنگ تک محیط ہیں لیکن اس شاہنامے کا ہیرو آخری سانس لے چکا ہے، وہ لاہور کے گورا قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے، چھ ستمبر کے معرکے میں اس نے اپنے سے چار گنا بڑی فضائی قوت کو للکارا تھا، اس کی للکار سے دشمن آج تک مبہوت ہے اور میں گورا قبرستان کے سامنے سانس روکے، سر جھکائے کھڑا ہوں، پاکستان کے ایک سچے سپاہی کے سامنے میرا سر عجز و نیاز سے جھکا ہوا ہے۔ اس کے زندہ جاوید کارناموں کو سلام، اس کی جیتی جاگتی روح اور اس کے انمٹ جذبوں کو سلام!

(16 اپریل 2012ء)

یوم فضائیہ کی حدت

الحمرا ہال میں پاکستان ایئر فورس نے چھ ستمبر کو جنگی تصویروں اور جہازوں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ ایئر مارشل طاہر رفیق بٹ سے کچھ یاد اللہ ہوگئی ہے، انہوں نے خصوصی طور پر تقریب کا دعوت نامہ بھجوایا۔ میں اس بہادر اور نڈر کمانڈر کو آنکھوں سے دیکھنے کا متمنی تھا جو بھارتی ایئر چیف کی دھمکی کا عملی طور پر جواب دینے کے لئے ایک فائٹر طیارے کے کاک پٹ میں سیٹ سنبھال لی تھی، قریبی فضاؤں میں ایک اور طیارہ محو پرواز تھا جس میں آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی سوار تھے اور وہ ایئر چیف اور پاک فضائیہ کے دیگر طیاروں کی نقل وحرکت کو مانیٹر کر رہے تھے جو ایک معمول کی تربیتی مشق کا حصہ تھے۔

ایئر مارشل طاہر رفیق بٹ نے بھارت کو واضح پیغام دے دیا تھا کہ پاک فضائیہ اسی جذبے کی حدت سے تمتمار ہی ہے جس کا مظاہرہ جنگ ستمبر میں کیا گیا۔

الحمرا ہال میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ محمد شہباز شریف نے نمائش کا فیتہ کاٹا، میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، یہ وہی وقت تھا جب چھ ستمبر کو لاہور کی فضاؤں میں ایم ایم عالم کے طیارے نے ساؤنڈ بیریئر توڑا تھا، میں نے چائے کی میز پر شہباز میاں سے پوچھا کہ آپ تو جنگ ستمبر میں ہائی اسکول کے طالب علم تھے، آپ نے لاہور کی فضاؤں میں پاک فضائیہ کی مہارت کا نظارہ تو کیا ہوگا، انہوں نے کہا، میں کیا، لاہور کے زندہ دلان چھتوں پر چڑھے ہوتے تھے اور ڈاگ فائٹ پر اس طرح تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے جیسے کوئی پتنگوں کا تہوار ہو۔ فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر سے گونج اٹھتی۔ ریڈیو پاکستان سے شکیل احمد کی زبانی پاک فضائیہ کے کارنامے سننے کے لئے ہر کوئی بے تاب رہتا، بھارت نے اپنے نیوز بلیٹن میں شکیل کی آواز کی بھونڈی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر وہ حرارت اور وہ جذبہ کہاں سے لاتے، شکیل احمد کی آواز کے زیر و بم سے یوں لگتا تھا جیسے وہ پاک فضائیہ کے بمباروں کے ساتھ محو پرواز ہے اور ان کی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور گنوں کی تڑ

تڑاہٹ پر لائیو کمنٹری کر رہا ہو، شکیل کا لب ولہجہ تو قلب وروح کو گرما دیتا تھا۔ پاک فضائیہ کے ہوابازشجاعت کی ایک نئی داستان رقم کر رہے تھے، ایم ایم عالم سات ستمبر کو سرگودھا کے نواح میں پرواز کر رہے تھے جب ان کو پیغام ملا کہ دشمن کے طیاروں کا تعاقب کیا جائے۔ اگلے تیس سیکنڈ میں ایک معجزہ ہوا اور جنگی ہوابازی کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم ہوا، ایم ایم عالم نے ایسی چابکدستی کا مظاہرہ کیا کہ دشمن کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دیا، تیس سیکنڈ میں چار طیاروں کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا، پانچواں حملہ آور طیارہ ساتھیوں کا حشر دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایم ایم عالم نے اسے بھی اگلے تیس سیکنڈ میں ڈھیر کر دیا، دنیا میں بڑے بڑے فضائی جنگی معرکے ہوئے لیکن ایم ایم عالم نے ساٹھ سیکنڈ کے اندر دشمن کے پانچ طیاروں کا شکار کر کے ہوا بازی کے رستموں کو دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ایک عالمی ریکارڈ بن گیا۔

الحمرا ہال کے سکوت میں مجھے سیسل چودھری بھی یاد آ رہے تھے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ایک الھڑ نوجوان ہوتا ہے، اس کی آنکھیں خوابوں سے سرشار ہوتی ہیں۔ وہ گروپ کیپٹن سرفراز رفیقی اور فلائٹ لیفٹیننٹ یونس حسن کے ساتھ ہلواڑہ پر حملے کے لئے روانہ ہوئے، ٹارگٹ پر پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا چھا رہا تھا، دشمن کے طیارے ان سے مڈبھیڑ کے لئے تیار تھے۔ اور اگلے چند لمحوں میں ایک ایسا سانس روک دینے والا ڈرامہ رونما ہوا جسے ہلواڑہ کے لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ پاک فضائیہ کے ہواباز کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ دشمن کو عددی برتری حاصل تھی مگر یہ جنگ فیصلہ کن لمحے تک جاری رہی، گروپ کیپٹن سرفراز رفیقی کے جہاز کی گنیں جام ہو گئیں، انہوں نے سیسل چودھری سے کہا کہ وہ حملے کی قیادت کرے اور وہ خود اسے عقب سے تحفظ دیں گے۔ اس گھمسان کے رن میں یونس حسن کا طیارہ دور نکل گیا، سیسل چودھری نے جب تک دشمن کے تمام جہازوں کو ٹھکانے نہیں لگا لیا، انہوں نے واپسی کی راہ نہیں لی، اس معرکے میں سرفراز رفیقی نے جام شہادت نوش کیا، انہیں ہلال جرات سے نوازا گیا، یونس حسن کو بعد از شہادت ستارہ جرات عطا کیا گیا، اس معرکے میں سیسل چودھری واحد ہواباز تھے جو زندہ واپس آئے۔

ایک کہکشاں ہے جو پاک فضائیہ کے رزم نامے پر روشنیاں بکھیر رہی ہے۔ چھ ستمبر کی صبح اسکواڈرن لیڈر حیدر ستارہ جرات کی سربراہی میں چھ سیبر طیاروں نے پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے پر حملہ کیا۔ اور جب تک اس کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دی گئی، یہ فارمیشن واپس نہ آئی۔

بھارت نے لاہور کی سرحد پر ایک تحیر خیز حملہ تو کر دیا لیکن وہ پاکستان کی دفاعی صلاحیت کا اندازہ لگانے

سے قاصر رہا۔ پاک آرمی نے ہر محاذ پر کامیابی سے دفاع کیا تاہم ہماری فضائیہ کی کارکردگی نے بھارتی منصوبہ سازوں کو چاروں شانے چت کر دیا کیونکہ چھ ستمبر کی صبح سویرے وہ ہمارے دفاعی فضائی حملے کی ہرگز توقع نہ کر رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا۔ پاک فوج اکھنور کے محاذ پر بھارت کے دانت کھٹے کر چکی تھی۔ لاہور، کھیم کرن اور سیالکوٹ میں بھی بھارتی فوج کے چھکے چھڑا دیئے گئے۔ بھارتی فضائیہ نے ایک واضح شکست کو دیکھ کر پاکستان کے شہریوں سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا، لاہور ریلوے اسٹیشن، سیالکوٹ شہر اور قصور ریلوے اسٹیشن کے اردگرد کے علاقے کو بھارتی ہوابازوں نے اندھا دھند بمباری کا نشانہ بنایا۔ مگر پاکستان کے غیور عوام نے اف تک نہیں کی اور اپنی بہادر افواج کے شانہ بشانہ سترہ دنوں تک جاگ کر ملک کی حفاظت کی اور اپنے ہوابازوں کی حفاظت کے لئے دعائیں مانگیں۔ میری آنکھوں کے سامنے گاؤں میں میری پھوپھی زاد بہن کا جسم بھارتی بموں سے قیمہ بن گیا، میں خود تین مرتبہ بھارتی حملوں کی زد میں آیا، لیکن جس دن فرصت ملتی میں قصور میں اپنے گاؤں فتوحی والہ کا رخ کر لیتا۔ اسے وقتی طور پر خالی کر دیا گیا تھا لیکن کھانے پینے، پہننے کا سارا سامان وہاں پڑا تھا اور سب سے بڑھ کر ہمارے دلیر شیر بہادر غازی چاروں طرف مورچہ زن تھے، ان کے گرد سے اٹے ہوئے جسموں کی خوشبو میری روح کو آج بھی معطر کر رہی ہے۔

مجھے پاکستان ایئر فورس پر فخر ہے اور ذاتی طور پر میں اس کے ہر سربراہ کا احترام کرتا ہوں، مگر اصغر خاں، نور خاں اور اب طاہر رفیق بٹ کی غیر معمولی شجاعت کا میں دلی طور پر معترف ہوں۔ مجھے قوم سے ایک درخواست کرنی ہے کہ چک لالہ ایئر پورٹ کا نام بدل کر نور خاں ایئر پورٹ رکھ دیا گیا ہے، کم از کم اسے اسی نام سے پکارا اور لکھا جائے۔ سات ستمبر کو یوم فضائیہ منایا جاتا رہا ہے، کوئی ہے جو آج لاہور کینٹ کی سرفراز رفیقی روڈ کو گلاب کے پھولوں سے بھر دے اور کوئی ہے جو لاہور کے گورا قبرستان میں سیسل چودھری کی قبر پر سر جھکا کر اس ہیرو کی روح کو سلام پیش کرے۔ (7 ستمبر 2013ء)

پاک فضائیہ کے مسیحی ہیرو

وزیراعظم کو اگر پشاور سانحے کی خبر دوران پرواز ملی تھی تو وہ ایئر فورس ون سے یہ حکم جاری کر سکتے تھے کہ پشاور ایئر بیس کا نام سیسل چودھری بیس رکھ دیا گیا ہے۔اس سے دو پیغام ملتے۔ایک، ملک کی مسیحی برادری کے زخموں پر مرہم رکھا جاتا اور دوسرے وطن دشمنوں کو پتہ چلتا کہ پاکستان اپنی مسیحی برادری کی کس حد تک عزت افزائی کرتا ہے۔اس سے قائداعظم کی روح کو بھی آسودگی ملتی جنہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان بن چکا، اب یہاں سب کے حقوق مساوی ہیں۔سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ جسٹس کارنیلیس کی تاریخی کار کو اس کے میوزیم کی زینت بنایا جائے گا، یہ کار عدلیہ ہی کی نہیں، پوری قوم کا افتخار ہے، اسے مینار پاکستان کے سائے میں جگہ ملنی چاہئے۔مجھے سمجھ نہیں آتی کہ سانحہ پشاور کے غم زدہ خاندانوں کی آنکھوں سے آنسو کیسے پونچھوں، مرنے والے میرے اہل وطن تھے، انہیں کوئی مسیحی کیوں کہتا ہے، اور اگر وہ مسیحی تھے بھی تو ان کا کردار ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

آج میں ان قومی ہیروز کے سامنے سخت شرمندہ ہوں جنہوں نے مادر وطن کے دفاع میں تن من دھن کی بازی لگائی۔ان میں مسیحی ہیروز بھی پیش پیش ہیں۔بھارت کے ساتھ پینسٹھ اور اکہتر کی دو جنگوں میں پاک فضائیہ کے ہوابازوں کو ستر ستارہ جرات عطا کئے گئے، ان میں سات مسیحی ہوباز بھی شامل ہیں۔ان میں سے ایک ایک کی قربانی اور دلیری کا ذکر کرنے کے لئے کئی کئی شاہنامے تصنیف کئے جا سکتے ہیں۔

ایئر مارشل ایرک گورڈن ہال نے آزادی کے بعد پاک فضائیہ کا انتخاب کیا، وہ بھارتی ایئر فورس کا انتخاب بھی کر سکتے تھے لیکن پاکستان میں انہوں ایک مضبوط اور توانا فضائی قوت منظّم کرنے میں شاندار کردار ادا کیا۔وہ ڈپٹی چیف آف ایئر سٹاف کے منصب تک پہنچے، پینسٹھ میں وہ چک لالہ جسے اب نور خاں ایئر بیس کا نام دے دیا گیا ہے، کے ٹرانسپورٹ کے شعبے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔لڑائی چھڑی تو انہیں احساس ہوا

کہ پاک فضائیہ کے پاس بمبار طیاروں کی کمی ہے، انہوں نے سی ون تھرٹی ٹرانسپورٹ طیارے میں تبدیلی کی اور اسے بمباری کے قابل بنایا۔ گروپ کیپٹن کے طور پر پہلے مشن پر وہ خود روانہ ہوئے، ٹرانسپورٹ طیارہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا مگر انہوں نے کشمیر میں کٹھوعہ کے پل کو بمباری کر کے اڑا دیا۔ ہائی کمان ان کے ایکشن پر اس قدر مطمئن تھی کہ انہیں تیرہ مزید حملوں کی اجازت دی گئی۔ ان طیاروں کی مدد سے انہوں نے لاہور کے اٹاری سیکٹر میں بھارت کے ہیوی توپ خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، قوم نے ستارہ جرات سے نواز کر ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

ایئر کمودونذیر لطیف، پینسٹھ کی جنگ میں ایک بمبار ونگ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے بھارت کے اندر انبالہ پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے۔ بھارتی اڈے کی حفاظت کے لئے روسی سام میزائلوں کا حصار قائم کیا گیا تھا مگر نذیر لطیف نے بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ دو مواقع پر ان کے جہاز کو شدید نقصان بھی پہنچا لیکن وہ طیارے کو بحفاظت اڈے پر اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے سینے پر ستارہ جرات سجایا گیا۔

ونگ کمانڈر میرون لیزلی مڈل کوٹ کا تذکرہ جذبہ حب الوطنی سے لبریز ہے۔ وہ پینسٹھ کی جنگ میں ایف 104 سٹار فائٹر کے سکواڈرن کی کمان کر رہے تھے، انہوں نے دشمن پر بڑھ چڑھ کر وار کیا۔ اور اس کی پیش قدمی کو ناممکن بنا دیا۔ اکہتر کی جنگ میں وہ بیرون وطن تربیت پر تھے مگر وہ فوری طور پر واپس آ گئے۔ انہیں اگلے ہی روز بھارت کے محفوظ تریں اڈے جام نگر پر بمباری کا مشن سونپا گیا۔ وہ اپنے مشن میں کامیابی کے بعد واپس آ رہے تھے کہ دشمن کے دمگ ایکس طیاروں سے ان کی مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ایک میزائل ان کے جہاز کو لگا، وہ جہاز سے کود گئے مگر تلاش کے باوجود ان کا سراغ نہ ملا۔

سیسل چودھری کا نام زبان پر آتا ہے تو شجاعت کی عظیم داستانیں ان کے کارناموں کے سامنے گہنا جاتی ہیں۔ چھ ستمبر پینسٹھ کو انہوں نے لاہور اور سیالکوٹ محاذ پر دشمن کا کچومر نکالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اگلے روز شام کو انہیں ہلواڑہ پر حملے کا ٹاسک دیا گیا، ان کے گروپ کیپٹن سرفراز رفیقی اس مشن کی قیادت کر رہے تھے اور فلائٹ لیفٹننٹ حسن بھی انکے ہمراہ تھے، کسی فنی خرابی کی وجہ سے مشن کی پرواز میں تاخیر ہو گئی جس کی وجہ سے دشمن چوکنا ہو گیا، پٹھان کوٹ پر پی اے ایف کے ہوا باز کامیابی سے حملے کے بعد واپس آ رہے تھے، انہوں نے خبردار کیا کہ فضا میں بھارتی ہنٹر طیارے موجود ہیں۔ ہنٹر اور سیبر کا کوئی مقابلہ نہیں، مگر ہلواڑہ کے شہریوں نے دیکھا کہ ہمارے جہازوں نے دشمن کا کس دلیری سے سامنا کیا، مسلسل فائرنگ کی وجہ سے

سرفراز رفیقی کی گنیں جام ہوگئیں تو انہوں نے سیسل چودھری سے کہا کہ وہ حملے کی قیادت سنبھالے۔ سیسل نے تاک کر نشانہ لگایا اور ایک بھارتی ہنٹر کو مار گرایا، ہلواڑہ کے شہریوں پر یہ طیارہ آتش فشاں بن کر گرا۔ حسن بھی ایک اور ہنٹر کے تعاقب میں دور نکل گیا اور اس کا کچھ پتہ نہ چلا، سرفراز رفیقی نے آخر دم تک عقب سے سیسل کو تحفظ فراہم کیا۔ جب تک سیسل نے بھارتی ہنٹرز کو لڑائی سے منہ موڑ کر بھاگنے پر مجبور نہیں کر دیا، وہ ہلواڑہ کی فضاؤں میں ڈٹا رہا۔ اکہتر کی جنگ میں سیسل چودھری، اسکوڈرن لیڈر کے منصب پر فائز تھا، ظفر وال شکر گڑھ سیکٹر میں اس کے طیارے کو نقصان پہنچا، اس نے کاک پٹ سے چھلانگ لگا دی، وہ دشمن کے علاقے میں گرا، اس کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی مگر وہ اپنے اڈے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

سکواڈرن لیڈر ولیم ڈیسمونڈ ہارنے کی دلیری پاک فضائیہ میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ پینسٹھ کی جنگ میں اس کا ایک ہاتھ سخت زخمی تھا مگر اسے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا منظور نہ تھا، اس نے اپنی خدمات دفاع وطن کے لئے پیش کیں اور آدم پور، ہلواڑہ، جودھپور، پٹھان کوٹ اور انبالہ کے بھارتی اڈوں پر حملوں میں سرگرم حصہ لیا، پاک فضائیہ کے یہی وہ حملے تھے جن کا ذکر ریڈیو پاکستان کی خبروں میں شکیل احمد کی زبان سے لوگ سنتے تھے کہ ہمارے ہوابازوں نے آج دن بھر دشمن کے اڈوں پر نیچی نیچی پرواز کر کے ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے تو گلی کوچے پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھتے تھے۔ سکواڈرن لیڈر ہارنے کو بھی قوم نے ستارہ جرات سے نوازا۔

سکواڈرن لیڈر پیٹر کرسٹی نے نیوی گیٹر کے طور پر پینسٹھ میں مادر وطن کا دفاع کیا۔ اکہتر کی جنگ میں وہ پی آئی اے میں ڈیپوٹیشن پر تھا مگر وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے لئے ایئر فورس میں واپس چلا آیا۔ جام نگر کے اڈے پر سخت مقابلہ پیش آیا اور وہ لاپتہ ہوگیا، پیشے سے لگن اور فرض شناسی کے بے مثل مظاہرے پر اسے بعد از مرگ ستارہ جرات عطا کیا گیا۔

پاکستانی قوم ستارہ جرات پانے والے ان سات محسنوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سانحہ پشاور کے بعد ان مسیحی محسنوں کے سامنے ہماری گردن کچھ زیادہ ہی جھک گئی ہے۔ (24 ستمبر 2013ء)

چھ ستمبر کی قوس قزح

ڈاکٹر وید پرتاپ ویدک، ڈاکٹر مجید نظامی کے دفتر میں تشریف لائے، انہوں نے طنزیہ انداز میں پوچھا، نظامی صاحب! سنا ہے آپ کو ٹینک پر بیٹھ کر بھارت جانے کا شوق ہے، کیا میں ایک ٹینک بھارت سے بھجوا دوں۔

نظامی صاحب نے کہا، مہاراج، اپنے دائیں ہاتھ دیوار پر آویزاں تصویر کو غور سے دیکھئے، میں آپ کو ایک بھارتی ٹینک پر ہی بیٹھا نظر آؤں گا جسے ہم نے پینسٹھ کی جنگ میں کھیم کرن سے پکڑا تھا۔

چند روز پہلے جنگ ستمبر کے ایک ہیرو بریگیڈئر عبدالقیوم شیر ہلال جرات کے انتقال پر میں نے کالم میں لکھا کہ بریگیڈیئر صاحب کے برق رفتار حملے سے بھارتی ڈویژن کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد بدحواس ہو کر اپنی جیپ، اور ذاتی ڈائری چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

اس دور کے بھارتی وزیر دفاع چون نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ لاہور کے محاذ پر اچانک حملہ تو کر دیا گیا لیکن بھارتی فوج کے تینوں حملہ آور بریگیڈز سے پچھلے پہر تک رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ ان کا اتا پتہ معلوم کرنے کے لئے بھارت کے پندرھویں ڈویژن کے کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد نے ایک جیپ پکڑی اور اگلے مورچوں کا رخ کیا مگر وہ پاکستان کے ایک جوابی حملے میں پھنس گئے، جان بچانے کے لئے انہوں نے جبل پور میں تیار کردہ نسان جونگا جیپ سے چھلانگ لگا دی۔ انہوں نے اپنی ہائی کمان کو پیغام بھیجا کہ پاکستان نے دو ڈویژن فوج سے جوابی حملہ کر دیا ہے، اس لئے بھارتی فوج کو سرحد سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس پیغام نے بھارت کی مغربی کمان میں سراسیمگی پھیلا دی اور جنرل ہربخش سنگھ اپنے کور کمانڈر جنرل جے ایس ڈھلوں کے ساتھ آگے بڑھے، انہوں نے ڈویژنل کمان سے جنرل چودھری کے بارے میں پوچھا مگر سبھی لاعلم تھے، آخر ایک شخص کماد کے کھیت سے باہر آتا دکھائی دیا، اس کے بوٹ کیچڑ سے لت پت تھے، اس کے

سینے پر کوئی بیج آویزاں نہ تھا اور سر پر ٹوپی بھی نہ تھی، شیو بڑھی ہوئی، جنرل ہربخش سنگھ نے پوچھا کہ کیا تم ڈویژنل کمانڈر ہو یا کوئی قلی۔ سات ستمبر کی شام کو ریڈیو پاکستان سے جنرل پرشاد کی ذاتی ڈائری سے اقتباسات نشر ہونے لگے تو جنرل نرنجن پرشاد سے استعفیٰ لے لیا گیا۔

یہی جنرل نرنجن پرشاد تھا جس نے بدمستی میں کہا تھا کہ وہ چھ ستمبر کی شام لاہور کے جم خانہ میں فتح کا جام نوش کرے گا۔

اور اسی جنرل کے بارے میں میجر شفقت بلوچ نے کہا تھا کہ میں اس نڈھے نوں تن دن ہڈیارے نالے دے گندے پانی دا گھٹ نئیں پین دتا۔

پاکستان نے چھمب جوڑیاں کے محاذ پر بھارت کا بھرکس نکال کر رکھ دیا تھا۔ بھارت نے حواس باختگی میں لاہور اور سیالکوٹ پر رات کی تاریکی میں جارحانہ حملہ کر دیا۔ یہ بھارت کی بھول تھی کہ وہ پاکستان کو اچانک جا لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ رن آف کچھ کے بعد جب شاستری نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ مرضی کے وقت اور محاذ کا فیصلہ کرے گا تو ہماری افواج نے سرحد پر دفاعی مورچے سنبھال لئے تھے، رن آف کچھ کی لڑائی کے دوران میں گنڈا سنگھ والا ہائی اسکول کا طالب علم تھا، ہمارے اسکول کے سامنے علی قلی خان کے فوجی دستے مورچہ زن تھے، وہ بارہ بلوچ کے لیفٹین تھے جس کے کمانڈر کرنل آفتاب حسین سے میرا اب بھی ٹیلی فون پر رابطہ رہتا ہے۔ میرا گاؤں فتوحی والا، بی آر بی کے پار بھارت کی مشین گنوں کی زد میں واقع ہے اور ہمارے کھیتوں میں بارودی سرنگیں لگا دی گئی تھیں اور جہاں کہیں درختوں کا جھنڈ میسر تھا، اس کے نیچے بھاری اسلحہ اور متحرک راڈار کیموفلاج کر دیئے گئے تھے۔

چھ ستمبر کی صبح میں لاہور میں تھا، رات گئے توپوں کے شور سے آنکھیں کھل گئیں، مگر لاہور کی زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی، میں وقت پر گورنمنٹ کالج میں اپنی کلاس میں حاضر ہوا، خالی پیریڈ میں باہر نکلا تو ضلع کچہری والے گیٹ پر مجھے اپنے گاؤں کا ایوب دکاندار ملا، وہ کوئی پیشی بھگتنے آیا تھا، اس نے بتایا کہ لاہور قصور روڈ پر بسیں رواں دواں ہیں، کبھی کبھار بھارتی ایئر فورس کا حملہ ہو جاتا ہے تو بسیں درختوں کی آڑ لے لیتی ہیں۔ اسی اثنا میں لاہور کی فضا میں دو دھماکے ہوئے، لوگوں نے سمجھا کہ بم گر گئے ہیں، بعد میں ریڈیو کی خبروں سے معلوم ہوا کہ ایم ایم عالم کے جہاز نے ساؤنڈ بیریر توڑا ہے جس سے بعض عمارتوں کے شیشوں کو نقصان پہنچا ہے، اس وقت تک ہماری فضائیہ کے بہادر ہوا باز بھارت کے ایڈوانس ہوائی اڈوں کی اینٹ

سے اینٹ بجا چکے تھے۔ رات کے وقت یہ حملہ پھر دہرایا گیا اور ریڈیو سے جب نیوز ریڈر کی آواز گونجتی کہ ہمارے ہوا بازوں نے آدم پور، ہلواڑہ، جام پور، امرتسر، اور پٹھانکوٹ پر نیچی نیچی پرواز کر کے ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے تو لاہور کی فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ بھارت کے اچانک حملے کی منصوبہ بندی اس قدر خام تھی کہ پاکستان کے جوابی اقدام کی توقع تک نہ کی گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ چھ ستمبر کی صبح صرف پٹھانکوٹ کے اڈے پر دمگ، چار مسٹیئرز، دو ناٹ اور ایک پیکٹ طیارہ کسی مزاحمت کے بغیر ڈھیر ہو گئے۔ ہماری فضائیہ نے واہگہ سے جی ٹی روڈ پر باٹا پور تک کا علاقہ بھارتی ٹینکوں، توپوں، مشین گنوں اور جیپوں کا مرگھٹ بنا دیا، مغربی کمان کے جنرل ہربخش سنگھ نے سہ پہر کو اگلے مورچوں کا معائنہ کیا تو اس نے دیکھا کہ بعض فوجی گاڑیوں کے انجن چل رہے تھے لیکن ان کے ڈرائیور فرار ہو چکے تھے۔

بھارت کے سامنے لاہور میں نمبر دس ڈویژن دفاع میں متعین تھا جس کی کمان جنرل سرفراز کے ہاتھ میں تھی، اس ڈویژن کو بی آر بی پر بیس پلوں کی حفاظت کرنا تھی جہاں سے دشمن لاہور کی حدود میں داخل ہو سکتا تھا۔ باٹا پور کا پل جی ٹی روڈ پر واقع تھا جسے کرنل آفتاب کے جوانوں نے جان پر کھیل کر بارود سے تباہ کیا، برکی کے پل کے سامنے میجر عزیز بھٹی دشمن کے قیامت خیز فائر کے سامنے ڈٹے رہے اور داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا، انہیں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز نشان حیدر عطا کیا گیا، بھسین سے بریگیڈئر قیوم شیر نے جوابی حملہ کر کے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔

ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے، تو لبھ دی پھریں بازار کڑے۔

لاہور کی مال روڈ پر صفدر میر ادیبوں اور شاعروں کے جلو میں اپنی برجستہ نظم پڑھ رہے تھے، چلو واہگہ کی سرحد پر، وطن پر وقت آیا ہے، وطن پہ کٹ کے مر جانے کا یارو وقت آیا ہے۔

آئیڈیل بک ہاؤس انارکلی کی نکڑ پر واقع تھا، وہاں سے قیوم نظر اور امجد الطاف کے ساتھ میں بھی اس قافلے میں شامل ہو جاتا تھا، صفدر میر کی آواز ابھرتی، میں پھر جلایا جاؤں، پھر شہید ہوں، میں پھر جلایا جاؤں، پھر شہید ہوں۔

چھ ستمبر کی کہانی ایک ایسا رزم نامہ ہے جو شاہ ناموں سے زیادہ گرما دینے والا ہے، کھیم کرن کی فتح اس رزم نامے کا ایک روشن باب ہے جس میں پاکستان نے بڑی تعداد میں بھارتی ٹینک اور فوجی پکڑے، جنرل ہربخش سنگھ کو اپنی وار ڈائری میں لکھنا پڑا کہ ڈیڑھ لاکھ بھارتی فوجیوں کے ہوتے ہوئے کھیم کرن سے پسپائی

ایک شرمناک باب ہے، یہیں سے پکڑے گئے بھارتی ٹینکوں کی نمائش کئی ماہ تک قصور کے اسٹیل باغ میں جاری رہی اور ڈاکٹر مجید نظامی نے ایک مقبوضہ بھارتی ٹینک پر اپنی تاریخی تصویر بنوائی۔اسے کہتے ہیں وار ٹرافی!! چھ ستمبر کی قوس قزح کے رنگوں کا جلوہ دیکھنا ہو تو یہ اصل تصویر غازی پاکستان ڈاکٹر مجید نظامی کے دفتر کی زینت بنی ہوئی ہے۔(6 ستمبر 2013ء)

محافظ لاہور بریگیڈئر عبدالقیوم شیر کا رزم نامہ

میرے لئے چھ ستمبر دس روز پہلے آ گیا ہے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر ڈاکٹر مجید نظامی سے چند روز پہلے درخواست کی تھی کہ چھ ستمبر کے لئے میں جو کالم بھیجوں گا، اس میں ان کے کمرے میں آویزاں ایک تصویر بھی لگے گی، جس کی انہوں نے اجازت دے دی۔

یہ کالم تو میں انشا اللہ اس کے وقت پر لکھوں گا لیکن آج مجھے معرکہ لاہور کے ہیرو بریگیڈیر عبدالقیوم شیر کی اچانک رحلت پر لکھنا ہے۔ میں ابھی ڈیفنس لاہور کے بی بلاک کے مکان نمبر 150 سے ہو کر آیا ہوں، ان کی بیٹیاں سفید اجلے لباس میں ایک کمرے میں سر جھکائے بیٹھی تھیں اور مجھے زمین سے آسمان تک قطار در قطار رحمت کے فرشتوں کی خوشبو محسوس ہوئی جو مرحوم بریگیڈیر کی پرنور روح کے استقبال کے لئے آسمانوں سے اتر رہے تھے۔ چھ ستمبر 65 کو بھارت نے عالمی ذرائع ابلاغ میں یہ خبر پھیلا دی تھی کہ اس کی فوج لاہور کی انارکلی میں مٹرگشت کر رہی ہے۔ مگر عین اس وقت بریگیڈیر عبدالقیوم شیر کی کمان میں ایک مختصر سا فوجی دستہ بھینی سے پیش قدمی کرتا ہوا لاہور امرتسر روڈ کو چودھویں میل پر کاٹ چکا تھا اور ہمارے سرفروش انجینئرز باٹا پور کا پل اڑانے کے لئے رات کی تاریکی میں کامیابی سے ہمکنار ہو چکے تھے۔

یہ کوئی تاریخی اتفاق ہے کہ پاک فوج کے دسویں ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل سرفراز خاں نے اپنی زیر کمان فوج کو پانچ اور چھ ستمبر کی درمیانی شب تین بجے صبح اپنے دفاعی مورچے سنبھالنے کا حکم جاری کیا تھا اور بھارت نے بھی جارحانہ حملہ کے لئے یہی وقت مقرر کیا تھا۔ نمبر 22 بریگیڈ کو باٹا پور کے دفاع کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اس کے سربراہ بریگیڈیر عبدالقیوم شیر تھے جن کا تعلق نمبر 11 بلوچ سے تھا اور وہ 1948 کی کشمیر کی جنگ آزادی میں پانڈو کے معرکے میں ایک کپتان کی حیثیت سے اپنی بہادری کا لوہا منوا چکے تھے۔ دشمن نے لاہور پر تین اطراف سے حملہ کیا تھا۔ بھارتی فوج کے پندرہویں انفنٹری ڈویژن کے

کمانڈر میجر جنرل نرنجن پرشاد نے بڑھک ماری تھی کہ وہ اسی شام فتح کا جام لارنس گارڈن کے کلب میں نوش کریں گے۔لیکن بریگیڈیر عبدالقیوم شیر کے جوابی حملے میں اس بھارتی جنرل کو اپنی فلیگ جیپ چھوڑ کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی،اس کی جیپ سے پاک فوج کو وہ نقشے مل گئے جن سے بھارتی جارحیت کے تمام راز آشکارا ہو گئے۔یہ جیپ جی ایچ کیو کے میوزیم میں آج بھی جنگی ٹرافی کے طور پر موجود ہے۔میری تجویز ہے کہ اس جیپ کو آنے والے چھ ستمبر کو لاہور کے چیئرنگ کراس میں لا کر رکھا جائے۔میاں نواز شریف کو بھارت سے دوستی عزیز ہو گی لیکن پاکستان کے غیور شہری اپنی فوج کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں اور انہیں چھ ستمبر کو اس کے اظہار کا پورا پورا موقع ملنا چاہیئے۔اس طرح یہ ریفرنڈم بھی ہو جائے گا کہ قوم اپنے وزیراعظم کے بھارت سے دوستی کے ایجنڈے کو کس قدر اہمیت دیتی ہے۔

بھارتی جنرل کی بڑھک پر ایک تبصرہ کرنل شفقت بلوچ نے اپنی موت سے چند روز پہلے فون پر گفتگو کرتے ہوئے میرے ساتھ کیا تھا۔انہوں نے ٹھیٹھ پنجابی میں کہا تھا: اوہ نڈھا چھ ستمبر دی شام نوں فتح دا جام پینا چاہندا سی،میں اس نوں تن دن ہڈیارے نالے دے گندے پانی دا گھٹ وی نئیں پین دتا۔

آٹھ روز بعد ستمبر کی جنگ کو اڑتالیس برس ہو جائیں گے۔جنگ ستمبر کے ہیرو ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔بریگیڈیر عبدالقیوم شیر بھی شاید یہ غم برداشت نہیں کر پائے کہ درسی کتابوں سے نشان حیدر پانے والوں کا نام حذف کر دیا گیا ہے۔وہ چورانوے سال زندہ رہے،شنواری قبیلے سے تعلق رکھنے والا یہ سپوت کوہاٹ کے گاؤں جنگل خیل میں پیدا ہوا،وہ اس شہر کی مٹی میں ابدی نیند سو گیا جس کی حفاظت کے لئے اس نے دشمن کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔لاہور کا معرکہ بھارت کے لئے انتہائی اہم تھا،سرحد سے قریب تر ہونے کی وجہ سے وہ اسے آسانی سے فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔راستے میں ایک رکاوٹ حائل تھی اور وہ تھی بی آر بی نہر۔اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اچانک یلغار کر کے وہ پاک فوج کی دفاعی پوزیشنوں کو روندتے ہوئے لاہور کے تاریخی شہر میں داخل ہو جائے۔اس نے چوروں کی طرح سرحد پار کی۔مگر اسے ایک ناقابل شکست فوج کا سامنا کرنا پڑا۔عزیز بھٹی شہید نشان حیدر جیسے باکمال اور نڈر کمانڈر اس کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے،ایوب خان کو آج جتنی مرضی گالیاں دے لیں لیکن چھ ستمبر کو دن کے گیارہ بجے ریڈیو پر اس کی آواز گونجی کہ لا الہ کا ورد کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑو تو قوم کے تن بدن میں بجلیاں کوند گئیں۔یہ الگ بات ہے کہ یہی ایوب خان جب فوت ہوا تو بھٹو نے اس کی نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی اور یہی بھٹو،فرانس کے مرحوم

صدر جارج پومپید و کے جنازے میں شرکت کے لئے اہتمام سے پیرس پہنچا۔ سیاسی امور پر فوج سے ہزار اختلا فات ہو سکتے ہیں لیکن مادر وطن کے دفاع پر قوم اور فوج شانہ بشانہ نہیں ہوں گے تو ہمارے دشمن خدا نخواستہ ہمیں کسی وقت بھی ڈھیر کر سکتے ہیں۔ بریگیڈئر عبدالقیوم کے جسد خاکی کو پاک فوج نے پورے فوجی اعزاز سے دفن کیا ہے، انہیں ایک چاق و چوبند دستے نے سلامی پیش کی ہے۔ اور عوام نے جوق در جوق ان کے جنازے میں شرکت کی ہے اور ان کی میت کو کندھا دیا ہے۔

بریگیڈیر عبدالقیوم شیر کا فاتحانہ معرکہ پوری قوم کے لئے باعث فخر ہے۔ چھ ستمبر کو بھارت نے واہگہ بارڈر پر جارحیت کر کے بی آر بی نہر کے مشرقی کنارے پر قبضہ جما لیا تھا، واہگہ پوسٹ کو آزاد کرانے کا فریضہ بریگیڈیر عبدالقیوم کو سونپا گیا۔ وہ بھینی کے پل سے آگے بڑھے تو دشمن نے ان کے ایڈوانس دو ٹینکوں کو تباہ کر دیا اور چاروں طرف سے گولیوں اور بموں کی بارش کر دی، خطرہ یہ تھا کہ پاک فوج کا ایکشن رک جائے گا لیکن بریگیڈیر عبدالقیوم شیر نے ذاتی جرات، دلیری اور قائدانہ صلاحیت کی بہترین مثال پیش کرتے ہوئے حملے کی قیادت سنبھالی، ان کے جوانوں کا خون بھی جوش میں آیا، ان کی منزل ابھی پانچ چھ میل دور تھی، دشمن نے ہر طرف سے ان کا محاصرہ کر رکھا تھا لیکن بریگیڈیر عبدالقیوم شیر بے خوفی سے آگے بڑھتے چلے گئے، اور انہوں نے لاہور امرتسر روڈ کو کاٹ کر دشمن کے عقب میں پوزیشن سنبھال لی، یہی وہ موقع تھا جب بھارتی جنرل نرنجن پرشاد نے راہ فراہ اختیار کی، میرے پاس اس لمحے کی تصویر موجود ہے جب پاک فوج کے جوانوں نے اس جیپ کو گھیر کر اپنے قبضے میں لیا، بھارتی فوج کے اس جنرل کو ذلت کا سامنا کرنا پڑا اور اسے ایک روز بعد فوج کی نوکری سے نکال دیا گیا جبکہ پاک فوج کے سربراہ جنرل موسی نے اگلے مورچوں میں جا کر بہادر بریگیڈیر عبدالقیوم شیر کے سینے پر ہلال جرات آویزاں کیا۔

اس ہلال جرات کی تابنا کی قوم کی راہیں روشن کرتی رہے گی۔ (29 اگست 2013ء)

چھ ستمبر سے ملاقات

میں آج صبح سویرے ہڈیارہ، برکی، باٹا پور اور واہگہ کی طرف نکل گیا تھا۔ دفاعی یادوں کی طرف ٹولیوں اور ٹرالیوں میں لوگ جا رہے تھے۔ جگہ جگہ جنگی ترانے گونج رہے تھے۔

میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر کا مزار پر جمگھٹا تھا۔ قریب ہی ایک گمنام سپاہی کی قبر بھی ہے جس پر لوگ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ بچوں کے چہرے تمتما رہے تھے اور بڑی عمر کے لوگوں کی آنکھوں میں ان شہیدوں کی یاد میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

1965ء کی جنگ کو چار عشرے گزر گئے ہیں لیکن لوگ اس کے نوسٹلجیا سے نہیں نکل سکے۔ قومی زندگی کا یہ ایک اہم سنگ میل ہے جس پر آنے والی نسلیں فخر کرتی رہیں گی۔ بھارت نے کوشش کی تھی کہ وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے اگلے مورچوں کو روند ڈالے اور دن کے دس بجے باغ جناح کے کلب میں بھارتی جرنیل فتح کا جام نوش کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

میں ستمبر 65ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں سیکنڈ ایئر کا طالبعلم تھا۔ چھ ستمبر کی اوائل صبح توپوں کی گھن گرج سنائی دی تو میں اور میرے بڑے بھائی میاں محمد اسلامیہ پارک کے کمرے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ہم قصور کے ایک سرحدی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے بھارتی جارحیت کوئی زیادہ غیر متوقع نہ تھی۔ ہمارے گاؤں کے کھیتوں میں کئی مہینوں سے فوج نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کبھی بارودی سرنگیں نصب کر دی جاتی تھیں اور کبھی اکھاڑ دی جاتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ ان بارودی سرنگوں کے عادی ہو گئے تھے اور احتیاط سے چارہ وغیرہ کاٹ لیتے تھے۔ فوجی بھی کوئی تعرض نہیں کرتے تھے۔

میں پیدل گورنمنٹ کالج جایا کرتا تھا۔ چوبرجی کے قریب ایک دکان پر ریڈیو کے گرد کافی لوگ جمع تھے۔ اس وقت صدر ایوب خاں کی تقریر نشر ہو رہی تھی۔ جب فیلڈ مارشل نے یہ فقرہ ادا کیا کہ جوانو! لا الہ الا اللہ کا

ورد کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑو تو ہجوم نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ میں نے کالج میں ایک دو پیریڈ پڑھنے کے بعد کچہری والے گیٹ سے باہر نکل کر دیکھا، سڑک پر معمول کی ٹریفک جاری تھا۔ کچہری کی طرف سے مجھے اپنے گاؤں کے ایک نوجوان محمد ایوب آتے دکھائی دیے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ گاؤں والوں کا کیا حال ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ آج کچہری میں کسی پیشی کے لئے آئے ہیں تاہم صبح سویرے گاؤں کے لوگ ضروری سامان کے ساتھ قرب وجوار کے مقامات کی طرف پناہ کے لئے نکل رہے تھے۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ فضا میں دو دھماکے ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ شیر دل ہوا باز ایم ایم عالم نے لاہور کے اُوپر سپیڈ بیریر کو کراس کیا ہے۔ جس سے یہ دھماکے ہوئے ہیں۔ ایم ایم عالم نے اہل لاہور کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی تھی کہ گھبرائیں نہیں۔ فوج پوری طرح چوکس ہے۔ پچھلے پہر میں پرانی انارکلی میں بائیبل سوسائٹی کے پاس کھڑا تھا کہ شہر کے اوپر پاک فضائیہ اور بھارتی حملہ آور طیاروں کے مابین ڈاگ فائیٹ شروع ہوگئی۔ لاہوریوں کیلئے یہ کوئی پتنگ بازی کے بوکاٹے والا منظر تھا۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کر نعرہ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ کسی کو خوف تک نہ تھا کہ جہاز سے گرنے والا کوئی بم ان کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوسکتا ہے۔

لاہور کی مال روڈ پر ہر روز کوئی نہ کوئی جلوس نکلنے لگا۔ ادیبوں، شاعروں کے جلو میں صفدر میر اپنی تازہ نظم بلند آہنگ سے پڑھ رہے تھے۔

''چلو واہگہ کی سرحد پر
وطن پر وقت آیا ہے،
وطن پہ کٹ کے مرجانے کا یارو وقت آیا ہے''

صفدر میر جب اس طویل نظم کے آخری مصرعے تک پہنچے کہ

میں شہید ہوں،
پھر شہید ہوں''

تو لوگوں کے جذبات سمندر کی طغیانی سے زیادہ تلاطم خیز نظر آتے تھے۔

لاہور ریڈیو پر دن رات شاعروں اور ادیبوں کا ایک ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ ہر کوئی اپنی تازہ نظم یا تاثرات نشر کرنے کے لئے بے تاب رہتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم کے اس مصرع کا تاثر آج بھی میرے لہو میں

رچا بسا ہوا ہے ''چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود۔۔اتنا بے رنگ تھا جیسے کسی معصوم کی لاش''۔نظام دین نے اپنے پروگرام میں جیسے ہی یہ اعلان کیا کہ بھارت لاہور کے ویران علاقوں میں گھس بیٹھیے اتار دیئے ہیں تو چشم زدن میں اہل لاہور ڈنڈے لے کر میانی صاحب میں گھس گئے۔خواتین کے ہاتھوں میں کپڑے دھونے والے تھاپے تھے۔افسوس کسی گھس بیٹھئے سے مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔دشمن محض زندہ دلان لاہور کو ہراساں کرنے کیلئے انٹ شنٹ چھوڑ رہا تھا۔

جنگ کے تیسرے روز میں نے سوچا کے قصور جا کر اپنی والدہ اور دیگر عزیزوں کی خیر خیریت معلوم کر آؤں۔قصور اڈے میں بس سے اترا تو سڑک کے کنارے کھیم کرن کے فاتح شہیدوں کی لاشیں قطار اندر قطار پڑی تھیں۔ان کو امانتاً یہاں دفن کیا جانا تھا۔شہیدوں کے جسموں کی مہک سے روح معطر ہو گئی۔نوجوان دھول سے اٹے ہوئے چہروں کے ساتھ یوں لیٹے تھے جیسے ابھی ابھی آنکھ لگی ہو۔

''خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں''

اور میں نے اس زندگی کا راز پا لیا تھا تر و تازہ نکھرے چہرے جن پر صد رنگ بہاریں بھی قربان جائیں، یہ تھے زندہ شہید۔

محافظ لاہور جنرل سرفراز خاں سے ان کی موت تک سینکڑوں صحبتیں رہیں۔بریگیڈیئر قیوم شیر، بریگیڈیئر عطا محمد، بریگیڈیئر امجد علی چودھری، کرنل شفقت بلوچ، بیگم شامی شہید سے نیاز مندی رہی۔اس وقت جب میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں تو میں اپنے کمپیوٹر پر ستمبر 65 کے جنگی نغمے سن رہا ہوں۔

''ایہہ پتر ھٹاں تے نئیں وکدے''

''میریا ڈھول سپاہیا، تینوں رب دیاں رکھاں''

''رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو''

''اے راہ حق کے شہیدو، وفا کی تصویرو''

اور میرے قلم سے آنسو بہہ نکلے ہیں۔۔۔(8 ستمبر 2006ء)

یوم شہدا کی قوس قزح

وہ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، انہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شعور نہیں، یہ اللہ کا فرمان ہے۔

افق تا افق خوں رنگ کہکشائیں چمک رہی ہیں۔ گلابی نور کے ہالے نے وطن کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

آج پاک فوج شہیدوں کی یاد منا رہی ہے۔ اور میری یادوں کی قوس قزح روشن ہو گئی ہے۔

چھ ستمبر پینسٹھ کی جنگ کے دو روز بعد میں قصور گیا۔ لاری اڈے کے سامنے سڑک کنارے چھوٹا سا ہجوم تھا۔ زمین پر چٹائیاں بچھی تھیں، ان پر گبھرو جوانوں کی لاشیں رکھی تھیں، یوں لگتا تھا کہ وہ کسی کھیت میں کام کرتے کرتے، مٹی سے اٹے ہوئے، دم بھر کے لئے سو گئے ہیں، یہ لاشیں چند روز پرانی تھیں، مگر پوری طرح تر و تازہ۔ کوئی سڑاند نہیں، فضا ایک خوشبو سے لبریز، میں نے شہیدوں کو زندہ شکل میں دیکھ لیا تھا، یہ کھیم کرن کے محاذ پر ڈٹ گئے تھے، بھارت کے اخباروں میں لیڈیں چھپ رہی تھیں کہ پاک فوج قصور کو چھوڑ کر بھاگ گئی، لاہور پر قبضے کی خبریں بھی اچھالی جا رہی تھیں، میرے پاس ان اخبارات کے فوٹو آج بھی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ کسی کو یقین نہ آتا ہو تو غریب خانے پر تشریف لے آئے اور آنکھوں سے بھارتی گوئبلز کا جھوٹ دیکھ لے۔ میں نے بعد میں کھیم کرن بھی دیکھا۔ یہ تاریخی قصبہ، پاک فوج کے شہیدوں کے خون کا ورثہ، ایک عرصہ تک پاکستان کے قبضے میں رہا۔

یہ شہید میری سوچ کا انمٹ حصہ بن گئے، کالج کے دنوں میں، میں نے ایک نظم لکھی: اے میرے زندہ مجاہد، اے میرے زندہ شہید، کئی بین الکلیاتی مشاعروں میں اس نظم پر مجھے انعامات ملے۔ اکھنور کی جنگ کو میں نے ایک ایمبیڈڈ اخبار نویس کے طور پر کور کیا، قصر ہند کے معرکے میں پہلے شہید میجر حنیف ملک کے گلے

میں گولے کا ایک ٹکڑا لگا، خون کا ایک فوارہ بہہ نکلا لیکن میجر حنیف ملک اپنے جوانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے نعرہ تکبیر بلند کرتے رہے، ایک لمحہ وہ بھی آیا جب ان کی آواز کٹے ہوئے نرخرے سے نکلتی محسوس ہوئی، میں نے کوشش کی کہ شہید کے جس سے پھوٹنے والے خون کے پہلے قطرے کی حرارت اپنی تحریر میں سمودوں، مگر یہاں تو ہر طرف شہیدوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، تھر پنجاب رجمنٹ نے پہلی شہادت اپنے بٹالین کمانڈر کرنل غلام حسین کی پیش کی، دشمن کے مورچے سے مشین گن کا پورا برسٹ ان کے ہیلمٹ کو چھیدتا ہوا آر پار نکل گیا، تھری پنجاب آج جہاں کہیں بھی ہوگی، اس کے ہیڈ کوارٹر میں کرنل غلام حسین شہید کا یہ ہیلمٹ شجاعت کے ایک تمغے کے طور پر موجود ہوگا، میں نے اس ہیلمٹ کا دیدار ڈبل پھاٹک کی تکون میں واقع ایڈوانس ہیڈ کوارٹر میں کیا اور میری نظروں نے اس کو بے ساختہ چوم لیا تھا۔ حسینی والہ بارڈر کو اسی شہید کرنل کے نام سے ہمیشہ کے لئے موسوم کر دیا گیا۔ 47 برس گزر گئے، کرنل غلام حسین چیک پوسٹ پر ہر شام فوجی پریڈ ہوتی ہے اور فضا نعرہ تکبیر سے گونج اٹھتی ہے۔ شہید اور کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔ اے میرے زندہ مجاہد، اے میرے زندہ شہید!! تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں۔ اڑ کے پہنچو گے تم جس فلک تک، ساتھ جائے گی آواز میری، اور ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وک دے، توں لبھ دی پھریں بازار کڑے۔ یہ ہیں راہ حق کے شہید، یہ ہیں وفا کی تصویریں!! پاک فوج شہیدوں کی امانت دار ہے، اس نے شہیدوں کی میراث کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا، اسے حرز جاں بنائے رکھا۔ ہمیشہ شہیدوں کے راستے پر گامزن رہنے کی کوشش کی۔ وطن کو جب بھی کسی بیرونی یا اندرونی جارحیت کا سامنا ہوتا ہے تو پاک فوج کے جوان اور افسر شہادتوں کا گل و گلزار مہکا دیتے ہیں۔ رن آف کچھ کا معرکہ درپیش ہو، سلیمانکی، برکی یا ہڈیارہ کی آزمائشیں ہوں، جسڑ، ظفر وال اور شکر گڑھ کے محاذ ہوں یا چھمب، جوڑیاں، کارگل اور سیاچین میں دشمن سے سامنا ہو، ہمارے جوانوں اور افسروں نے دلیری اور شجاعت کے شاہنامے اپنے خون سے تحریر کئے جو تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن کر چمکتے رہیں گے۔ میجر طفیل، میجر عزیز بھٹی، میجر سرور اور ان جیسے دیگر جانبازوں نے نشان حیدر کی شاہراہیں روشن کیں، فضاؤں میں اور سمندروں میں دلیر، شیر اور گھبرو، قوم کی آنکھوں کی چمک بن کر زندہ و پائندہ بن گئے۔ سرفراز رفیقی، علاؤالدین اور سیسل چودھری کے کارنامے ابد تک زندہ و تابندہ رہیں گے، ان کے ذکر پر دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، آنکھیں عجز و نیاز سے جھک جاتی ہیں، اور ولولے اور جذبے ہمالہ کی رفعتوں سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں ایک المیہ یہ ہوا کہ فوج مارشل لا میں الجھ گئی اور عوام کے ایک طبقے نے اسے نفرت کا نشانہ بنا لیا۔فوج اور عوام کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے گئے، جنرل اشفاق پرویز کیانی نے کمان سنبھالی تو انہیں اس المیے کا پورا پورا احساس تھا، انہوں نے فوج کو سیاست سے دور کرنے کا اعلان کیا، فوج کے شہدا کی یاد منانے کے لئے ہر سال تیس اپریل کا دن مخصوص کر دیا۔آج پورے ملک میں شہیدوں کو سلامی پیش کی جا رہی ہے، ایک مرکزی تقریب جی ایچ کیو میں ہے جہاں جنرل کیانی مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کریں گے اور ہر کور ہیڈ کوارٹر میں بھی شہیدوں کی لازوال عظمت کے سامنے جھکے ہوئے سروں کی قطار نمایاں ہوگی۔ پاک فوج نے اپنے سربراہ کے قول کو نبھا کر دکھا دیا مگر قوم کا ایک حصہ ابھی تک بدگمانیاں پھیلانے میں مصروف ہے۔اسی لئے چند روز پہلے کاکول میں پاؤسنگ آؤٹ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے جنرل کیانی نے اس نکتے کو نمایاں کیا تھا کہ قوم اور مسلح افواج متحد ہو کر ملک کی سیکورٹی کو یقینی بنا سکتی ہیں۔فوج نے اس اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی، نازک اور سنگین لمحات میں بھی صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، کئی لوگوں نے اسے بار بار پکارا اور کئی لوگوں نے اسے بار بار للکارا مگر فوج نے اپنے کام سے کام رکھا، اس نے شہیدوں کے لہو کی لاج رکھنے کی کامیاب کوشش کی اور اس کا سہرا بجا طور پر جنرل کیانی کے سر سجتا ہے۔

پچھلے ایک عشرے میں فوج کے مجموعی کردار کی تحسین نہ کی جائے تو یہ ایک ناقابل معافی بخل ہوگا۔ملک کو اندر اور باہر سے ایک پیچیدہ صورت حال کا سامنا ہے، دشمن نظر نہیں آتا، یہ بے چہرہ ہے، ہماری صفوں کے اندر گھسا ہوا ہے، ہمارے بھیس میں ملبوس ہے، ہماری شکلوں سے ملتا جلتا ہے مگر اس کا ایجنڈہ اس ملک کا نہیں، کسی اور کا ہے۔وہ ہمیں تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے، اس نے ہمارے پچاس ہزار شہریوں کا خون بہا دیا، ان میں آٹھ ہزار فوجی جوان اور افسر بھی شامل ہیں۔کسی قوم نے اور کسی فوج نے اتنے قلیل عرصے میں اس قدر بیش بہا اور ان گنت قربانیاں پیش نہیں کیں۔دنیا کی بہترین اور جدید ترین اسلحے سے لیس امریکی اور اتحادی افواج میدان سے پسپائی اختیار کر کے جا رہی ہیں مگر پاک فوج پکے پاؤں ڈٹی ہوئی ہے، سرفروشی کی نئی داستانیں رقم کر رہی ہے، اس کے ساتھ قوم بھی ہر روز قربانیاں پیش کر رہی ہے، ملک نئے انتخابات کے مرحلے میں ہے مگر دشمن ان کو سبوتاژ کرنے پر تلا ہوا ہے، ہمیں اس خطرے کا متحد ہو کر سدباب کرنا ہے، ایک ان دیکھے، بے چہرہ، بے نام دشمن کے عزائم کو خاک میں ملانا ہے، ہمارے قومی شہید ہمارے لئے مینارہ نور ہیں، ان کی روشن کردہ کہکشاؤں پر چلتے ہوئے ہم منزل کو یقینی طور پر پا سکتے ہیں، ان شہیدوں کو سلام، ان کی

عظمت اور جرات کو سلام۔ اور ان کے سپاہ سالار کو سلام جس نے شہیدوں کی یاد سے وطن کی فضائیں معطر کر دی ہیں۔ اے وطن ہم ہیں تری شمع کے پروانوں میں۔ ان پروانوں پر ہمارے جان و دل نثار!!!

(29اپریل2013ء)

میاں صاحب! 28 مئی والی تقریر اور تاریخ دہرائیں!

میاں نواز شریف ایک عرصے کے بعد یوم تکبیر سے خطاب کر رہے ہیں، یہ ایک اعزاز ہے جس کے وہ حقدار ہیں لیکن اس رزم نامے کے پیچھے کچھ باغیرت پاکستانیوں کے کردار کا ذکر بھی ضروری ہے۔

بھارت نے گیارہ مئی کو ایٹمی دھماکے کئے، پاکستان کو جوابی دھماکے سے روکنے کے لئے ایک دنیا حرکت میں آ گئی، امریکہ نے پیسوں کا لالچ دیا، ساتھ ہی پاکستان میں ایک لابی سرگرم عمل ہوگئی کہ ہمیں بھارت کی کشتی میں سواری نہیں کرنی چاہئے، کسی نے کہا کہ ہماری ایٹمی صلاحیت کا سب کو پتہ ہے، اگر پیسے ملتے ہیں تو مال پانی بنالینا چاہئے، دھماکوں سے گریز کرنا چاہئے۔ بھارتی وزیر دفاع نے دھمکی دی کہ آگے بڑھ کر آزاد کشمیر کو ہڑپ کرلیں گے۔

میاں نواز شریف کے قدم شاید ڈگمگا جاتے مگر ایک باغیرت پاکستانی مجید نظامی نے کہا کہ میاں صاحب، آپ دھماکہ نہیں کریں گے تو قوم آپ کی حکومت کا دھماکہ کردے گی۔ ایک اور محبّ وطن نے تجویز دی کہ اگر پیسے ہی کمانے کا ارادہ ہے تو کندھوں پر۔۔ پرنا۔۔ رکھ لیں اور بہنوں، بیٹیوں، بہوؤں کو کوٹھوں پر بٹھا دیں۔ میں نے بھی لکھا کہ ہمیں میر جعفروں اور میر صادقوں کی سازشوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔

لیکن اس رزم نامے کا نہ تو یہ آغاز ہے، نہ اختتام۔ بھارت نے اپنے ایٹمی دانت 1974 میں دکھا دیئے تھے۔ پاکستان شکست کے زخموں سے نڈھال تھا اور دولخت ہو چکا تھا۔ ایک نئے پاکستان کا چارج پی پی پی کے بانی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے للکار بلند کی کہ گھاس کھائیں گے، ایٹم بم بنائیں گے۔ ایٹمی توانائی کمیشن کے منیر احمد خان اور ڈاکٹر عبدالسلام نے شروعات کیں، ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے لازوال شاہنامہ رقم کیا۔ بھٹو کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا مگر ایٹمی پروگرام کا گلا کسی کو گھونٹنے کی ہمت نہیں ہوسکی، افواج پاکستان کی نگرانی میں اسے تندہی سے آگے بڑھایا گیا۔ امریکی سفیر نے ایک تقریب

سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ پاکستان ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں سرخ بتی عبور کر چکا ہے۔اس سے قبل جنرل ضیا الحق بھی ایک امریکی جریدے ٹائم کو انٹرویو میں کہہ چکے تھے کہ پاکستان نے ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔

یہی وہ وقت ہے جب بھارت نے براس ٹیک نامی جنگی مشقیں شروع کیں۔ان مشقوں میں روائت سے ہٹ کر اصلی گولہ بارود اور دشمن ملک، پاکستان کے حقیقی ٹارگٹ سامنے رکھے گئے تھے۔مشقوں کی آڑ میں بھارت نے اپنی فوجیں سرحد پر جارحانہ عزائم کے ساتھ متعین کر دیں، پاکستان کو بھی جواب میں اپنی فوج نکالنا پڑی، یہ وہ وقت ہے جب ایک بار پھر نوائے وقت ،نیشن گروپ نے لیڈ لی اور یہ خبر شائع کی کہ پاکستان ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہے۔ جنرل ضیا الحق نے جہاز پکڑا اور جے پور جا اترے، جہاں پاک بھارت کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کو پروٹوکول کی پابندی کے باعث وہاں آنا پڑا۔ضیا الحق کی دلچسپی کرکٹ میں کم تھی اور وہ راجیو کے کان میں کھسر پھسر زیادہ کر رہے تھے۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خبردار کیا تھا کہ اگر بھارت نے کوئی شرارت کی تو لالہ جی! ہم ایٹم بم کا استعمال کریں گے۔اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کی سرحد سے تناؤ ختم ہو گیا۔ 1999 میں کارگل میں دونوں ملکوں کی افواج کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی، بھارت کے جہازوں نے پاکستان کی سپلائی لائن منقطع کرنے کے لئے کنٹرول لائن پار کی تو آن واحد میں پاک فضائیہ نے بھارت کے دو طیارے بھسم کر دیئے۔ پھر ساری جنگ کارگل کی چوٹیوں تک محدود رہی۔لیکن دنیا کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کشمیر کا مسئلہ کسی وقت بھی برصغیر میں ایٹمی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔یہی کچھ 2002 میں ایک بار پھر ہوا جب نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کا ڈرامہ رچایا گیا۔ بھارت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی افواج کو پاکستان کی سرحد پر جمع کر دیا۔ پاکستان نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی تھیں۔اس نے ایٹمی میزائل عین سرحد کے اوپر نصب کر دیئے، دنیا بھر کے سٹیلائٹ واضح طور پر یہ سب کچھ مانیٹر کر رہے تھے اور یوں عالمی دارالحکومتوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں کہ برصغیر میں ایٹمی تصادم ہونے والا ہے۔ بھارت نے اپنی فضائی حدود پاکستانی طیاروں کے لئے بند کر دی تھی اور جواب میں پاکستان کو بھی ایسا ہی قدم اٹھانا پڑا، اسی ماحول میں نیپال میں سارک کانفرنس ہوئی جہاں پہنچنے کے لئے جنرل مشرف کو چین کے اوپر سے ایک طویل اور پر خطر فضائی روٹ اختیار کرنا پڑا جس میں جہاز کی نیوی گیشن چینیوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ جنرل مشرف نے تقریر کے بعد اچانک اپنا ہاتھ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے واجپائی کی

طرف بڑھا دیا۔اس مصافحے نے بھارتی افواج کو سرحدی مورچوں سے پسپا کر دیا۔مگر ممبئی سانحے کے بعد بھارت نے پھر طبل جنگ بجا دیا،اس کا کہنا تھا کہ اگر امریکہ کو سرجیکل اسٹرائیک کا اختیار ہے تو وہ بھی پاکستان میں کشمیری حریت پسندوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنائے گا۔ ادھر بھارتی فضائیہ کے جہاز فضاؤں میں بلند ہوئے،ادھر پاک فضائیہ کے سرفروش سرحد پر گشت کرنے لگے، ہر ایک کو معلوم تھا کہ دونوں طرف کے جہاز ایٹمی اسلحے سے لیس ہیں۔مگر پاکستان نے جس طرح سینہ تان کر بھارت کا جواب دیا،اس سے بھارت کو پہل کی جرات نہ ہو سکی۔

آج کے دن ہم سینہ پھلا کر اپنی جمہوریت پر فخر کر رہے ہیں،اور جمہوریت کی شکل بھی اپنی اپنی ہے،مگر ایٹمی پروگرام کی حد تک یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں جس برانڈ کی بھی جمہوریت تھی یا فوجی آمریت تھی، ہر ایک نے اس پروگرام میں اپنا حصہ ڈالا،بھٹو،ضیا،اسحاق،محترمہ بے نظیر،نواز شریف،لغاری اور مشرف،سبھی نے اپنا قومی فرض ادا کیا، ان سب نے پاکستان کو بیرونی جارحیت سے محفوظ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اندرونی پالیسیوں پر اختلاف رائے ہوا ہوگا اور سب نے غلطیاں کی ہوں گی مگر ملک وقوم کے دفاع پر کسی کے قدم پیچھے نہیں ہٹے۔سبھی قدم سے قدم ملا کر چلے۔

میاں نواز شریف آج اگر کوئی نئی تقریر نہ کریں اور اپنی وہی تقریر دہرا دیں جو انہوں نے ایٹمی دھماکوں کے بعد کی تھی اور اسی کو قومی ایجنڈہ اور منشور بنا لیں تو وہ تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف سے رقم کر سکیں گے۔ انہوں نے اس تقریر میں بہت کچھ کہا تھا مگر مجھے ایک بات رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ قوم نے ایک وقت کی روٹی کھائی تو میرے بچے بھی ایک وقت کی ہی روٹی کھائیں گے۔یہ وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔میاں صاحب!اپنے بچوں کو لوڈ شیڈنگ سے سلگتے پاکستان میں تو لائیے!(27 مئی 2013ء)

عید ایٹم بم

پاکستانی قوم آج کے دن خدائے عزوجل کے حضور سر بسجود ہے جس نے ایٹمی صلاحیت کے حصول کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور چودہ سو برس بعد پاکستان کو اسلامی دنیا کی پہلی جوہری طاقت بننے کا اعزاز بخشا۔

آیئے ان سائنس دانوں کو سلام پیش کریں جنہوں نے ایک پر آشوب دور میں تمام دنیاوی رکاوٹوں کے باوجود اپنا مشن پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں بلاشبہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے ہیرو ہیں لیکن ان کی ٹیم کے بڑے سے لے کر چھوٹے فنی ماہر تک کو قوم سر جھکائے ہدیہ عقیدت پیش کرتی ہے۔

ہمیں پاکستان کی اس سیاسی قیادت کو بھی عقیدت اور احترام کے ساتھ یاد کرنا چاہیے جس نے ایٹمی قوت بنانے کا فیصلہ کیا، اس پروگرام کو آگے بڑھایا اور بالآخر دھماکہ کر کے دنیا سے اپنی ایٹمی قوت کا لوہا منوایا پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی اور سابق ویزاعظم۔ ذوالفقار علی بھٹو کا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھول سکتے کہ انہوں نے ''گھاس کھائیں گے ایٹم بم بنائیں گے'' کا نعرہ بلند کیا، اس پروگرام کی داغ بیل ڈالی، ہم پاک فوج کے سابق سربراہ، سابق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے دنیا کی دو سپر طاقتوں کی مخالفت کے باوجود ایٹمی میدان میں پیش رفت جاری رکھی اور بالآخر امریکہ بلبلا اٹھا کہ ''پاکستان سرخ بتی عبور کر چکا ہے''۔ جنرل ضیاء الحق کو دنیا کی سخت ترین سزا دینے کا فیصلہ ہوا۔ وہ ایک ہوائی حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہمیں اپنے سابق صدر غلام اسحاق خان کو بھی ہدیہ عقیدت پیش کرنا ہے جو بھٹو اور ضیاء کے ادوار میں مسلسل پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے نگہبان رہے۔ امریکہ کو انکی یہ ادا پسند نہ آئی اور انہیں رسوا کن طریقے سے اقتدار سے رخصت کیا گیا، آج جب وہ قعر گمنامی میں پڑے ہیں تو وہ خاطر جمع رکھیں، پاکستانی قوم انہیں ماتھے کا جھومر سمجھتی ہے اور وہ شخص جو سب سے کڑے امتحان سے گزرا اور جس نے دھماکے کا فیصلہ کیا جس کو

امریکی صدر کلنٹن ذاتی طور پر فون کر کے باز رہنے کے مشورے دے رہا تھا جسے ''سونے میں تولنے'' کی پیش کش کی جارہی تھی، جسے سخت سزا سے ڈرایا جارہا تھا، جسے سودے بازی کرنے کے مشورے دیئے جارہے تھے لیکن اس نے کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے 28 مئی کی سہ پہر کو ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان کی عالمی برادری میں دھاک بٹھادی، وہ شخص محمد نواز شریف ہے۔ پاکستان کا وزیراعظم اور پوری ملت اسلامیہ کا سرمایہ افتخار!! نواز شریف نے ثابت کیا کہ کہ امریکہ کا بندہ نہیں، خدا کا بندہ ہے، میڈ ان پاکستان ہے، میڈ فار پاکستان ہے۔ یہی نواز شریف قوم کو آج بھی یاد دلا رہا ہے کہ 65 اور 71ء میں دوسروں کے بحری بیڑے کے انتظار کرتے رہے، کوئی مدد کو نہیں آیا، آج بھی کوئی دوسرا مدد نہیں کرے گا، اپنی مدد آپ کرنا ہوگی، خدا سے مدد مانگنا ہوگی، خدا کی عطا کردہ صلاحیت اور طاقت پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

پاکستان عالم اسلام کا قلعہ ہے، ایٹمی قوت سے لیس ہونے کے بعد علاقے کی دیگر کمزور اقوام بھی پاکستان کو اپنے تحفظ کی ضمانت سمجھ رہی ہیں۔ 1986ء میں کوالالمپور کی ایک ورکشاپ میں فجی اخبار دی سن کے ڈپٹی ایڈیٹر ستندرا نے مجھے کہا تھا ''میرا ملک بحرالکاہل میں ایک نقطے کی مانند ہے ہزاروں میل دور اس ملک کو بھارت کا خوف لاحق ہے لیکن جب سے پاکستان نے ایٹمی پروگرام میں پیش رفت کی ہے ہم اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور کرتے ہیں۔''

بھارت کے بارے میں ہر کسی کو علم ہے کہ وہ ایک منی سپر پاور بن کر اردگرد کے علاقے پر اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔ بھارت کو ہندو انڈیا بننے کا جنون ہے، مہا بھارت کے خواب کی تکمیل اس کا اول و آخر مشن ہے لیکن پاکستان نے ایٹمی قوت بن کر بھارت کے ان خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔

پاکستان کے بارے میں دنیا کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ یہ کوئی جنگ جو یا امن کا دشمن ملک ہے، اقوام عالم کی برادری میں پاکستان کو امن اتنا ہی عزیز ہے جتنا کسی دوسری قوم کو، پاکستان نے ایٹمی پروگرام کو منطقی منزل سے ہمکنار کر کے علاقائی کشیدگی اور بدامنی کے سامنے ایک ڈیٹرنٹ کھڑا کر دیا ہے۔ اب بھارت کو جرات نہیں ہوگی کہ وہ نیپال کی ناکہ بندی کرے یا سری لنکا میں دہشت گردی جاری رکھے یا مالدیپ پر کشتیوں سے یلغار کر دے۔ بھارت حجم اور جثّے کے اعتبار سے بڑا ملک سہی لیکن اس کی جارحانہ صلاحیت کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام نے شل کر کے رکھ دیا ہے۔ اب علاقے میں کسی کو بھارت سے کوئی خوف و خطر نہیں۔

آیئے! آج ہم عید ایٹم بم منائیں ۔ایک دوسرے کو گلے لگائیں ۔مبارکباد دیں ۔عید ایٹم بم ملت اسلامیہ کا ایسا تہوار ہے جس کی سرخوشی اور سرشاری میں ہمیں قرآن پاک کے اس فرمان کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ

''اے مومنو! اپنے گھوڑے تیار رکھو!''

رب عزوجل! تیرا فرمان سر آنکھوں پر، ہمارے گھوڑے تیار ہیں، اپنی رحمت کا سایہ ہم پر رکھ۔

(28 مئی 1999ء)

28 مئی کی یاد۔۔۔

امت مسلمہ نے سرشاری اور کیف کے اس لمحے کا چودہ صدیوں تک انتظار کیا۔ 28 مئی 1998ء کو چاغی کی چوٹیوں کا رنگ کیا بدلا، امت مسلمہ کی تقدیر کا افق قوس قزح کے ہفت رنگوں سے جگمگا اٹھا۔ پاکستان نے ایٹمی طاقت بننے کا اعلان یکے بعد دیگرے پانچ دھماکوں کی گونج میں کیا۔ بھارت اس سے پہلے 11 مئی کو ایٹمی دھماکہ کر چکا تھا اور اب دنیا کو پاکستان کے ردعمل کا انتظار تھا۔

پاکستان میں بحث چل نکلی تھی کہ ایٹمی طاقت تو ہیں ہی، دھماکے نہ بھی کئے جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ امریکہ کا مسلسل دباؤ تھا کہ دھماکہ نہ کیا جائے۔ 11 مئی کو بھارتی دھماکوں کے بعد پاکستانی قوم پل صراط پر معلق تھی۔ امریکہ لالچ دے رہا تھا کہ پاکستان دھماکے سے باز رہے تو اسے مالا مال کر دیا جائے گا اور اگر دھماکہ کر دیا تو اس کا حقہ پانی بند۔ ایک طرف ڈراوا تھا، دوسری طرف بہلاوا۔ پاکستانی رائے عامہ تقسیم تھی۔ وہ لوگ جو ابتداء میں دھماکے کے حق میں تھے ان کی سوچ بھی بدلنے لگی۔ نواز شریف کی حکومت ان دو انتہاؤں کے منجدھار میں پھنسی ہوئی تھی۔ ایک طرف بیرون ملک سے دھمکیاں تھیں، دوسری طرف اندرونی طبقے پھنکار رہے تھے کہ نواز شریف نے دھماکہ نہ کیا تو قوم اس کا دھماکہ کر دے گی۔ نواز شریف نے ترازو ہاتھ میں لیا، نفع نقصان کا جائزہ لیا اور پھر بزن کا اشارہ دے دیا۔ پاکستانی قوم ہی نہیں، پوری امت مسلمہ جھوم جھوم اٹھی۔ یہ قرآنی حکم کی تعمیل تھی، ''مسلمانو اپنے گھوڑے تیار رکھو''۔ مسلمانوں نے جب تک قرآنی حکم پر عمل کیا وہ فاتح عالم رہے، جب انہوں نے اس حکم کو پس پشت ڈال دیا تو وہ مفتوح عالم ٹھہرے۔ ہر کسی نے ان کو تاراج کیا۔

پاکستان تو 28 مئی 1998ء سے پہلے ہی ایٹمی طاقت تھا۔ صدر ضیا الحق کے حوالے سے یہ دعویٰ امریکی ہفت روزہ ٹائم نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے حوالے سے ایک خبر سید مشاہد حسین اور کلدیپ نائر

نے رپورٹ کی تھی۔ امریکی سفیر متعینہ اسلام آباد چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ پاکستان نے ''سرخ بتی عبور کر لی ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو پروان چڑھانے میں ہر کسی نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے زخم خوردہ پاکستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے اعلان کیا تھا کہ ''ہم گھاس کھائیں گے لیکن ایٹم بم بنائیں گے''۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو بیرون ملک سے طلب کر کے یہ مشن سونپا گیا۔ صدر ضیاء الحق اور ان کے بعد صدر غلام اسحاق خان نے اس مشن کی تکمیل میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ضیاء الحق کو ایٹمی پروگرام کے فروغ کی سزا دی گئی اور ان کا طیارہ بہاولپور کی فضاؤں میں بھسم کر دیا گیا۔ غلام اسحاق خاں کو بھی انتہائی رسوائی کے عالم میں ایوان صدر سے رخصت کیا گیا۔ نواز شریف نے قوم کے جذبات اور مطالبوں کے پیش نظر دھماکہ تو کر دیا لیکن صرف ایک سال بعد خود ان کی حکومت کا دھماکہ کر دیا گیا۔ پہلے انہیں پابند سلاسل کیا گیا اور پھر ان کے پورے خاندان کو جلاوطنی کی سزا دے دی گئی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں جنہوں نے دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود تنکا تنکا جمع کیا اور یورینیم کی افزودگی کا راستہ نکالا، آج پس پردہ دھکیل دیئے گئے ہیں۔ ان کا نام گالی بنا دیا گیا ہے اور ان کی حیثیت ایک عالمی مجرم کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ بھارت نے اپنے ایٹمی ہیرو عبدالکلام کو صدر مملکت کے مرتبے پر فائز کیا ہے، ہم نے محسن پاکستان اور ایٹمی ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔

نائن الیون کے بعد جب امریکی لشکر دھاڑ رہے تھے اور بی 52 فضاؤں میں چنگھاڑ رہے تھے تو قوم کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا کہ ہماری ایٹمی ڈیٹرنس کہاں ہے اور ہم اس کے ہوتے ہوئے کمزوری کے راستے پر کیوں چل نکلے ہیں۔ سوال اس حد تک درست تھا کہ قوم کو میرے جیسے کالم نویسوں نے باور کرا دیا تھا کہ ہم ایٹمی طاقت سے لیس ہیں۔ ہم عالم اسلام کا قلعہ ہیں اور کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا، لیکن جب پاؤں پر کھڑے ہونے کا وقت آیا تو ہماری ٹانگیں کپکپانے لگیں اور ہماری گھگھی بندھ گئی۔ ہم امریکی صدر کی ایک ٹیلیفونک دھمکی پر ساری چوکڑی بھول گئے۔

میرے نزدیک اس کمزوری، بزدلی اور کم ہمتی کے مظاہرے کے باوجود پاکستان کے ایٹمی ڈیٹرنس پر کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ پاکستان اس اسلحے سے لیس ہے اور دنیا جانتی ہے کہ ایٹم بم کیا بلا ہے۔ اس لئے افغانستان اور عراق پر امریکی اتحادی افواج کی جارحیت کے باوجود کسی کو پاکستان سے چھیڑ چھاڑ کی جرات نہیں ہو سکی۔ ایٹمی ڈیٹرنس آج بھی قرآنی گھوڑے کی طرح اللہ کی چھتری بن کر ہمارے تحفظ کو یقینی بنانے کے

لئے کافی ہے۔

مجھے شدید رنج ہے کہ پاکستان کی شاہراہوں اور عوامی مقامات سے چاغی کے ماڈل مسمار کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ بھارت کو خوش کرنے اور دنیا کو پاکستان کا ''سوفٹ'' چہرہ دکھانے کیلئے ہے لیکن ہمارے دشمنوں پر اچھی طرح واضح ہے کہ پاکستان ناقابل تسخیر ہے۔ اس کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا اور دنیا مجبور ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مابین تنازع کشمیر کو حل کرائے۔ یہ ہل چل پاکستان کے ایٹمی ڈیٹرنس کا کرشمہ ہے۔

کاش! آج کے دن ایٹمی دھماکوں کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر نواز شریف اور ڈاکٹر عبدالقدیر خاں بھی ہمارے درمیان کیک کاٹنے کیلئے موجود ہوتے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کو بھی ''پیرول'' پر آنے کی اجازت دی جاتی کہ ان کے والد نے اسی ایٹمی ڈیٹرنس کی خاطر پھانسی کے تختے کو چوما تھا۔

میری خواہش ہے کہ آج 28 مئی کی گھڑیاں تھم جائیں اور آنے والے ہزاروں برسوں پر محیط ہو جائیں۔ آج کا سورج ہمیشہ چمکتا رہے اور میرے وطن کے بچے بچے کی پیشانی 28 مئی کے جذبوں سے دمکتی رہے!

(28 مئی 2005ء)

پاکستان کے جوہری پروگرام پر اعتراضات

وزیراعظم نے جنوبی کوریا کے دورے پر روانہ ہونے سے قبل میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان کے جوہری اثاثے پوری طرح محفوظ ہیں اور کمانڈ اور کنٹرول کے نام سے جو ادارہ تشکیل دیا گیا ہے، اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ان دنوں جنوبی کوریا میں جوہری طاقتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں ایٹمی ہتھیاروں کے مستقبل پر بحث کی جائے گی۔ بدقسمتی سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی شروع ہی سے مخالفت کی جا رہی ہے۔ جناب بھٹو نے اس پروگرام کی بنیاد رکھی اور اسے پروان چڑھانے کے لئے ڈاکٹر قدیر کی خدمات حاصل کیں تو جیسے ایک زمانہ ہمارا مخالف ہو گیا۔ ہنری کسنجر نے بھٹو صاحب کو دھمکی دی کہ یہ پروگرام بند کر دیا جائے۔ ورنہ انہیں دنیا کے سامنے نشان عبرت بنا دیا جائے گا اور ہوا بھی یہی، جرنیلوں نے بھٹو کا تختہ الٹا اور پھر انہیں قتل کے ایک الزام میں تختے پر لٹکا دیا گیا۔ مارشل لا لگانے والے جرنیل بڑے مزے سے گیارہ برس تک حکمران رہے اور امریکہ کے شانہ بشانہ افغانستان میں سوویت روس کے خلاف جہاد کا خطیر معاوضہ وصول کرتے رہے۔ مگر امریکہ نے الزام لگایا کہ پاکستان دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہوٹہ پلانٹ کا منصوبہ مکمل کر چکا ہے، ایک امریکی سفیر نے انکشاف کیا کہ پاکستان ایٹمی پروگرام کی سرخ بتی عبور کر چکا ہے۔ اس اثنا میں مارشل لا حکمران کا طیارہ فضا میں پھٹ گیا، باور کیا جاتا ہے کہ انہیں بھی نشان عبرت ہی بنانے کی کوشش کی گئی، مگر ان کے بعد وزیراعظم بھٹو کی بیٹی محترمہ بے نظیر نے ایٹمی اسلحے کی ڈیلوری کے لئے میزائل سسٹم حاصل کیا، ڈاکٹر بابر اعوان راوی ہیں کہ جب محترمہ یہ

میزائل شمالی کوریا سے اپنے سرکاری جہاز میں لا رہی تھیں تو امریکہ نے دھمکایا تھا کہ اس طیارے کو راستے میں اڑا دیا جائے گا مگر محترمہ نے جان پر کھیل کر یہ میزائل پاکستان پہنچائے۔ پاکستان نے ہمیشہ یہ واضح کیا ہے کہ اس کا ایٹمی پروگرام خطے میں قیام امن کو یقینی بنانے کے لئے ہے اور یہ مقصد ہمیشہ پورا ہوا۔ انیس سو ستاسی میں بھارت نے براس ٹیک فوجی مشقوں کی آڑ میں پاکستان کی سرحدوں پر جارحانہ مورچہ بندی کی تو جے پور کے اسٹیڈیم میں ایک کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے جنرل ضیا الحق نے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے کان میں سرگوشی کی کہ مہاراج! ہمارا ایٹم بم تیار ہے۔ اس پر راجیو کا رنگ فق پڑ گیا اور اس نے کرکٹ میچ سے فارغ ہو کر پہلا کام یہ کیا کہ پاکستان کی سرحدوں سے اپنی افواج واپس بلا لیں۔ ممبئی سانحے کے بعد ایک بار پھر بھارت نے لام بندی کی اور خطے میں جنگ کے خطرات پیدا ہو گئے، پاکستان نے اپنے ایٹمی میزائل عین سرحدوں پر نصب کر دیئے تا کہ ان کی مار کی آخری حد حاصل کی جا سکے۔ ساتھ ہی پاکستان نے ایٹمی اسلحے سے لیس اپنے بمبار طیارے چوبیس گھنٹے فضا میں بلند کر دیئے۔ بھارت کی خواہش تھی کہ جس طرح امریکہ کو اسامہ بن لادن اور القائدہ کے تعاقب کا حق حاصل ہے، وہ بھی ایسا ہی حق استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں سرجیکل اسٹرائیک کرے اور مخصوص مقامات کو نشانہ بنائے، لیکن پاکستان کے عزم و حوصلے کے سامنے بھارت کے عزائم خاک میں مل گئے۔

عالمی سطح پر پاکستان کو ایک غیر ذمے دار ایٹمی طاقت قرار دینے کے لئے دن رات پروپیگنڈہ جاری رہا۔ سن دو ہزار میں پاکستان اور بھارت کے چار چار ایڈیٹرز امریکی وزارت خارجہ کی دعوت پر واشنگٹن پہنچے، میں بھی اس وفد کا حصہ تھا۔ پہلی بریفنگ کی ابتدا ہی اس الزام سے ہوئی کہ دہشت گردوں کے پاس ایٹمی اور دیگر خطرناک اسلحہ موجود ہے، پینٹاگان میں سینئر ترین امریکی جرنیلوں نے جب اس الزام کو دہرایا تو میری برداشت سے باہر ہو گیا اور وفد کے ارکان آج بھی گواہی دیں گے کہ میں نے جوابی سوال پوچھا کی کیا اسامہ ایٹمی اسلحہ، غلیلوں سے داغے گا۔ آخر اس کے لئے مکمل ڈیلوری سسٹم چاہئے، اس پر بریف کیس بم کی اصطلاح گھڑی گئی۔ یعنی اگر منفی اور مثبت قوت کے دو ایٹمی گیند

کسی مقام پر بریف کیس میں بند کر کے رکھ دیئے جائیں تو اس بریف کیس کو جو شخص ہلائے گا، اس سے منفی اور مثبت طاقت کے ایٹمی گیند آپس میں ٹکرا کر وہی تباہی لائیں گے جو کسی ایٹم بم کے پھٹنے سے مچتی ہے۔ واہ! کیا دلیل تھی۔ اور پھر افغانستان پر امریکہ نے یلغار کی تو پاکستان کے ایک اردو اور ایک انگریزی اخبار نے اسامہ بن لادن کا حامد میر کے ساتھ یہ انٹرویو شہہ سرخی کے ساتھ شائع کیا کہ وہ ایٹمی، کیمیاوی اور حیاتیاتی اسلحے سے لیس ہے اور مناسب وقت پر امریکی افواج کو اس کا نشانہ بنائے گا۔ کچھ ایسے ہی دعوے عراق کے صدر صدام حسین کے بارے میں کئے گئے مگر تاریخ نے دیکھا کہ عراق چند دن بھی امریکی افواج کے سامنے پاؤں نہ جما سکا۔ خود صدام اس حالت میں ایک بنکر سے پکڑا گیا کہ اس کے پاس واحد ہتھیار ایک پستول تھا جسے چلانے کی اس کے اندر ہمت نہ تھی، اسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں نشانہ بنانے کا دعوی کیا گیا ہے لیکن تحقیقاتی کمیشن کا کہنا ہے کہ اس کے گھر میں صرف ایک فائر کا نشان ملا ہے اور وہ بھی کسی بلندی سے کیا گیا تھا، اب تو ہم نے اس عمارت کو ہی مسمار کر دیا ہے تا کہ آخری معرکے کی تفصیلات (اگر کوئی ہیں تو) اگلی نسلیں بھی نہ دیکھ سکیں۔ افغان جنگ کو شروع ہوئے گیارہ برس گزر گئے، اسامہ یا اسکے ساتھی کوئی ایٹمی اسلحی نہیں چلا سکے، لیکن اس تمام بلیم گیم کا مقصد پاکستان کو بدنام کرنا تھا کہ اس کا ایٹمی پروگرام انتہائی غیر محفوظ ہے اور ہر ایک کو دستیاب ہے، رہی سہی کسر میرے ہی ایک ممدوح حکمران جنرل پرویز مشرف اور خود ڈاکٹر قدیر نے پوری کر دی جب ان کے الزامات اور اعترافات منظر عام پر لائے گئے۔ کیا کوئی عدالتی کمیشن اس سانحے کی تفصیلات منظر عام پر لائے گا کہ یہ سب کیا ہوا اور ہم نے اپنا منہ اپنے ہی تھپڑوں سے سرخ کیوں کر لیا تھا۔

میں یہاں اس امر کی بھی ایک شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق بھی مذکورہ امریکی سرکاری دورے سے ہے۔ کیلی فورنیا سے چند سو کلومیٹر دور بحرالکاہل کے کنارے واقع ایک پرفضا قصبے مانترے کے تحقیقاتی انسٹی ٹیوٹ کے ایک پاکستانی نژاد بھارتی سائنس دان نے اعتراف کیا تھا کہ پاکستان کے ایٹمی دھماکے فول پروف تھے جبکہ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کی کامیابی پر شکوک و شبہات کا

اظہار کیا جاتا ہے۔اسی سائنس دان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پاکستان نے میزائلوں کے تجربے انتہائی اعتماد کے ساتھ کیے اور یہ میزائل پورے ملک کی آبادی کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے اپنے نشانوں پر گرے جبکہ بھارت اور کئی دیگر ممالک اس اعتماد سے محروم ہیں اور وہ اپنے میزائل تجربے، ریگستانوں یا سمندری حدود میں کرتے ہیں۔کیا یہ حقیقت نہیں کہ پاکستان میں ابھی تک کوئی ایٹمی حادثہ نہیں ہوا جبکہ روس، بھارت اور اب جاپان میں اس نوع کے سانحے رونما ہو چکے ہیں۔میں انیس سو چھیاسی میں ملائیشیا کے ایک ماہ کے مطالعاتی دورے پر گیا تو ان کا ایٹمی ری ایکٹر بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ری ایکٹر کے اندر جھانکتے ہوئے میں نے میزبان ملک کے ایٹمی ادارے کی خاتون نائب صدر سے پوچھا تھا کہ کیا انہیں یہاں کام کرتے ڈر نہیں لگتا تو انہوں نے جھٹ جواب دیا کہ وہ گھر سے یہاں تک گاڑی میں سفر کرتے ہوئے خود کو زیادہ غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔میں ایک زمانے میں اداریہ نویسی کے فرائض ادا کرتا تھا تو اکانومسٹ لندن کا اداریہ میرا پسندیدہ ہوا کرتا تھا۔ایک مرتبہ چرنوبل سانحے پر اس نے اداریہ تحریر کیا کہ اس حادثے سے قبل ایٹمی ری ایکٹر کو ایک بسکٹ فیکٹری سے بھی زیادہ محفوظ خیال کیا جاتا تھا۔اب تو پلوں کے نیچے سے بہت سا بھاری پانی بہہ چکا ہے اور امریکہ اور یورپ میں کئی حادثات رونما ہو چکے ہیں۔جاپان کے سانحے نے تو ایک سونامی برپا کر دیا تھا،اس کو ایک سال ہو چکا ،مگر اس کی تلخ یادیں ذہن کو اب بھی ماؤف کیے دیتی ہیں۔کیا پاکستان میں ایسا کوئی بھی سانحہ ہوا، جواب نفی میں ہے کیا ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم پاکستانی انتہا پسندوں نے گرائے تھے۔الزام لگانے والوں کو آئینے میں اپنی شکل ضرور دیکھ لینی چاہئے۔(26 مارچ 2012ء)

وہ جنہوں نے بم چلانے کا حوصلہ بخشا

جس روز بھارت نے ایٹمی دھماکے کیے، وہ رواں موسم گرما کا ایک معمول کا دن تھا، لیکن دھماکوں کے بعد یہ فضا ایک غیر معمولی اہمیت کر گئی۔ ابھی کچھ سوچ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ بھارت نے مزید دھماکے کر دیئے۔

پاکستان کی منتخب قیادت بھاری مینڈیٹ کے ساتھ وسط ایشیا کے خشک علاقوں میں اپنے دورے میں توسیع کر کے آرام میں مصروف تھی اور پاکستانی قوم حیران و پریشان تھی کہ اس کی آزادی کو درپیش نئے چیلنج کا سامنا کون کرے گا، کیسے کرے گا؟ حکمران پارٹی کے لوگ آئین کی ترمیم کے سامنے بس گونگے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کا قائد کیا سوچ رہا ہے، لہذا وہ اپنی رائے بھی نوک زباں پر لانے سے ڈر رہے تھے، کانپ رہے تھے۔ ادھر ہندو نے خوف طاری کر دیا تھا، ادھر فلور کراسنگ والی ترمیم کی دہشت نے لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ قوم بیک زبان مطالبہ کر رہی تھی کہ بم کا دھماکہ کرو اور ہندو کے منہ پر جوہری طمانچہ رسید کرو لیکن منتخب حکومت نے جیسے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہوں۔

مجھے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ میں کرہ ارض پر اربوں کروڑں حشرات الارض میں سے ایک بے بس حقیر کیڑا ہوں۔ مجھے پاکستان عالمی گلوب پر سکڑ کر ایک نقطے کی مانند نظر آ رہا تھا، لیکن پھر جیسے بجلی کا کوندا لہرایا۔

میرے بیٹے نعیم چوہدری نے کہا ابو، آپ نے دو قسطوں میں ''اب یا کبھی نہیں'' کے عنوان سے کالم لکھا تھا، موت اور غلامی میں سے انتخاب کرنے میں مشکل کیوں آ رہی ہے۔

گلاسگو سے سرفراز احمد نے کہا تھا کہ بھٹو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قوم کو گھاس کھانے پر قناعت کرنا ہوگی ،لیکن بم کا دھماکہ ضرور ہونا چاہئے۔

پیرس سے بلو بھائی کا پیغام تھا کہ ہم پردیس کے پاکستانی ہر قربانی دینے کو تیار ہیں، لیکن خدارا بم

چلائیں۔

فرینکفرٹ سے جرمن مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل سید اقبال حیدر کا کہنا تھا، نواز شریف امتحان پر پورا اترو اور قوم کے دل کی آواز پر لبیک کہو۔

نیویارک سے مسلم لیگ کے لئے برس ہا برس قربانیاں دینے والے سردار نصر اللہ خان نے درمندی سے لکھا تھا، ہندوؤں کے سامنے ہمارے سر جھکے ہوئے ہیں۔ سبزی کی دکان پر کیش اینڈ کیری کے سامنے نیوز سٹال پر ہمیں طعنے مل رہے ہیں۔ نواز شریف بم باہر نکال۔

مانچسٹر سے تحریک استقلال کے چوہدری غلام محی الدین کی رائے تھی، پاکستان کی بقا ایٹمی راستہ اختیار کرنے میں ہے۔

لندن سے بیرسٹر ظہور بٹ کا پیغام تھا۔ پاکستان کڑے امتحان میں ہے، ہمیں جوہری دھماکہ کر کے ہندو کا قرض اتار دینا چاہئے۔

بلیک پول سے وحید اختر نے لکھا، میں ہسپتال میں پڑا ہوں اور مجھے صرف اور صرف ایک فکر لاحق ہے کہ پاکستان کی آزادی، قومی سلامتی اور اقتدار اعلیٰ پر کوئی حرف نہ آئے۔

ہالینڈ سے مہر علی نے لکھا، آج ہر مسلمان کی آرزو ہے کہ پاکستان دھماکہ کر کے طاقت دکھائے۔ ہر شخص نے ایک نکتے پر زور دیا کہ ان کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے اپنا قلم ایٹمی دھماکہ کے حق میں وقف کر دیں۔ ان دوستوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں یکسو ہو گیا۔ میں نے خدا سے فضل کی دعا مانگی اور پھر ایک ایسی لڑائی میں کود گیا جس میں پیچھے مڑنا ناممکن نہ تھا۔

میرے ایک دوست امتیاز عالم نے کہا: تم موت کو پسند ہو، تم موت کے سوداگر ہو، تم دنیا کو نار نمرود میں جلانا چاہتے ہو۔

کسی نے کہا: تم محمد بن قاسم کے ساتھ واپس کیوں نہیں چلے گئے، یہاں تمہارے آباؤ اجداد کیوں رہ گئے، اس خطے کا امن کیوں خاکستر کرنے کے درپے ہو۔

میں نے سب کچھ سنا اور اپنی دھن میں مست رہا، لیکن میں اکیلا نہیں تھا۔ عبدالقادر حسن میرے لشکر کا سپہ سالار تھا۔ اس نے ایمان افروز کالم لکھے۔ گھوڑوں کے شہہ سواروں کو آواز دی۔ اس کی آواز صدا صحرا ثابت نہ ہوئی۔ گھوڑے ہنہنائے، ان پر شہسوار ایک شان سے بیٹھے۔ گھوڑوں کے سموں سے بجلی کوندی اور نئی دہلی

سے تل ابیب اور نیویارک تک ایک ہیبت چھا گئی۔

امت مسلمہ دوسو سال بعد سرخرو ہوگئی تھی۔ پیرس سے بلو بھائی نے مبارکباد دی۔ ملک یاسین نے کہا ،نواز شریف نے ایک عظیم فیصلہ کر دکھایا۔ ظہور بٹ لندن سے مسرور تھے۔ غلام محی الدین چوہدری مانچسٹر میں پاکستانی پرچم کو سلیوٹ کر رہے تھے۔ سرفراز احمد، شوکت بٹ، مقبول رسول نے گلاسگو سے فون کئے اور قوم کو مبارکباد دی۔ نیویارک میں سردار نصراللہ اور سعید اختر کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ صلالہ، عمان میں پاکستانی محنت کش حاجی محمد اشرف کیانی بھی اپنے آپ کو سربلند محسوس کر رہا ہوگا۔ اس کی دکان، اردگرد کے علاقے میں پھیلے ہوئے پاکستانیوں کے لئے خبروں کا مرکز ہے۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے ایک خط میں لکھا اور دعا دی کہ خداوند کریم آپ کو ہمیشہ حق بات کہنے اور لکھنے کی توفیق دے اور جرات مندی سے آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشے۔ جناب اشرف کیانی صاحب! میری بھی دعا ہے کہ خدا آپ کی دعائیں قبول کرے۔ آپ جیسے محبّ وطن اور دردِ دل رکھنے والے پاکستانیوں نے وطن کو سرخرو کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ معلوم نہیں میری تحریر آپ کی نظر سے گزرتی ہے یا نہیں کیونکہ آپ محنت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اخبار پڑھنے کا موقع آپ کو کم ملتا ہوگا لیکن خاطر جمع رکھیئے ہم لکھنے والے اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہم دشمن کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گے۔

مجھے معلوم ہے کہ دشمن کو ذرا پیش قدمی کا موقع ملا تو سب سے پہلے اس کے ٹینک حسینی والا بارڈر پر بی آر بی نہر کے کنارے قبر کی اس ڈھیری پر سے گزریں گے جس میں میری ماں ابدی نیند سو رہی ہے۔

لیکن اس سے پہلے کے دشمن کے ٹینک میری دھرتی ماں کی طرف بڑھیں، میں اپنے سینے پر بم اندھ کر اس کے آگے لیٹ جاؤں گا۔

خدا کی قسم میں دشمن کو غارت کر دوں گا۔ میری دھرتی سدا پھولے پھلے۔ اس کی آغوش میں میری ماں سکون سے ابدی نیند سوئے۔ دشمن کو اب جرات نہیں کہ وہ پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے۔

(28 مئی 1998)

ہندو کیلئے اگلے ہزار سال کی غلامی

پاکستان کی تقدیر باجپائی کے منشیوں کے ہاتھ میں ہوتی تو آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت دو دن تک کنٹرول لائن کے اگلے مورچوں پر نہ رہتے۔

میر جعفروں، میر صادقوں اور عمر عیاروں نے بہتری کوشش کی کہ وہ نواز شریف، فوج اور قوم کو امریکی ڈالروں کی چمک کے فریب میں مبتلا رکھیں۔ ادھر انڈیا میں دھما کہ ہوا، ادھر پاکستان میں اس کے منشیوں کا لشکر حرکت میں آیا۔ ''دھما کہ نہ کرو'' کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ''امریکی ڈالروں سے لدے پھندے جہاز آئیں گے'' باجپائی کے منشی قوم کو چکمہ دینے کی کوشش میں لگے رہے کہ، بس امریکی بحری بیڑہ پاکستان کی حفاظت کرے گا۔

دو ہفتے سے زائد وقت گزر گیا، امریکی وفد آئے اور چلے گئے، وہ کوئی صندوق ساتھ لائے ہی نہ تھے ،سوان سے ڈالر کیا برآمد ہونے تھے، پاکستان کے ایف سولہ بدستور ایری زونا کے ریگستان میں زنگ آلود کھڑے ہیں، قرضوں کا بوجھ بدستور موجود ہے۔ پاکستان نہ جاپان بن سکا ہے، نہ ہانگ کانگ کی چھینٹ اس پر پڑی، نہ سنگاپور کا ساحل ہمارے قریب آیا، کوئی ''سیکورٹی امبریلا'' ہمارے سروں پر نہیں تانا گیا۔ ایک نیلی چھت کا آسرا تھا، وہ مملکت خداداد پاکستان پر ہمیشہ قائم رہے گا، انشاءاللہ۔

باجپائی کے منشی تو اوندھے منہ پاکستانی قوم کو گرانے پر تلے ہوئے تھے لیکن پاکستان پر اللہ کا سایہ ہے۔ یہ اس کے کرم سے وجود میں آیا، اسی کی عطا کردہ نعمتوں سے مالا مال ہے اور میرے رب نے چاہا تو سدا نہال رہے گا، آباد رہے گا، شاد رہے گا۔

دو ہفتوں میں باجپائی کے منشیوں، میر جعفروں اور میر صادقوں کی مایوسی بڑھ گئی ہے۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آتا ہے۔ ان کی حالت نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی ہو رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پاکستان کی

آزادی اور قومی سلامتی کا سودا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا چلا جا رہا ہے، خدا پاکستانی قوم کے لئے راستہ روشن کر رہا ہے۔ ڈھل مل حکمران اب زیادہ دیر قومی امنگوں کو پامال نہیں کر سکتے، البتہ وہ دھماکے کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ضرور ہیں۔ وزیر خزانہ سرتاج عزیز بول اٹھے ہیں کہ ایٹمی دھماکہ ضرور ہوگا، لیکن وقت کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ بجٹ سے پہلے کیا جائے یا بجٹ کے بعد۔ سرتاج عزیز کے بس میں ہو تو وہ بجٹ کے دوران ہی دھماکہ کر ڈالیں۔ وہ ٹیکس اور مہنگائی کے فیتے کو چنگاری دکھا کر پوری قوم کو بھک سے اڑا دینے کے چکر میں مبتلا ہیں۔ میاں نواز شریف کا تاجرانہ پس منظر بجٹ کے دھماکے کو بم دھماکے سے چھپانے کے چکر میں ہے اور ایک چکر تقدیر کا بھی ہے جو مسلسل چلتا ہے اور کسی کو نظر نہیں آتا۔

پاکستان کی قیادت کے گٹے گوڈوں میں پانی ہوتا، تو اس بحث کی نوبت ہی نہ آتی کہ دھماکہ ہو یا نہ، کب ہو، کہاں ہو، دھماکہ اب تک ہو چکا ہوتا، لوگ گلی بازاروں میں سروں پر کفن پہنے وطن کا پہرہ دے رہے ہوتے۔ خاکی وردیوں کو چوم رہے ہوتے، بوہری بازار، اکبری منڈی، شادمان مارکیٹ اور راجہ بازار میں بھارتی سامان کی چتا دہک رہی ہوتی۔

حکومت کی بے عملی دیکھ کر بلوچستان کے نوجوانوں نے ایک فوکر طیارہ اور اڑتیس مسافر ہائی جیک کر لئے۔ باجپائی کے منشی زیادہ ہوشیار تھے، انہوں نے کوشش کی کہ پورا پاکستان ہائی جیک کر لیا جائے اور 14 کروڑ پاکستانی عوام کو یرغمال بنا لیا جائے۔ بلوچستان کے نوجوانوں کا خام منصوبہ فوج کے کمانڈوز نے ناکام بنا دیا۔ باجپائی کے منشیوں کی خام خیالی آرمی چیف کی فرض شناسی اور مستعدی نے مسل ڈالی ہے۔

پاکستان دھماکہ کرتا ہے یا نہیں، اب یہ سوال اور بحث صدیوں پیچھے چلی گئی ہے۔ آرمی چیف پر پوری طرح واضح ہے کہ آئندہ کیا چیلنج درپیش ہے۔ باجپائی دھماکہ تو کر چکا ہے۔ اب اس نے کشمیر پر قبضہ کرنا ہے اور پاکستان آرمی بفضلہٖ وہ پہلی اور آخری طاقت ہے جو باجپائی، ایڈوانی، فرنینڈیس، بال ٹھاکرے اور ان کے منشیوں کے مذموم عزائم کو ناکام بنانے کیلئے پوری طرح تیار ہے۔ بھارت اپنی تباہی کو دعوت دینا چاہتا ہے، تو آگے بڑھے اور اسلام کے سرفروشوں سے ٹکر لینے کی حماقت کرے۔

ڈرانے والے ڈرا رہے ہیں کہ بھارت بڑی طاقت ہے۔ خبردار کر رہے ہیں کہ وہ پاکستان کو کھا جائے گا، ہڑپ کر لے گا، ہزار سال کی غلامی کا بدلہ لے لے گا، لیکن جنرل جہانگیر کرامت جو خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، عقبہ بن نافع، صلاح الدین ایوبی، شہاب الدین غوری اور محمود غزنوی کی روایات کا

امین ہے، اب کنٹرول لائن پر مورچہ زن ہے۔ بھارت کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں جوان روایات کو روند سکے، نہ باجپائی، ایڈوانی، بال ٹھاکرے اور نہ فرنینڈیس اور ان کے گماشتوں اور منشیوں کے بس میں ہے کہ وہ ایک جہانگیر کرامت کو روند سکیں۔ یہاں تو چودہ کرڑو جہانگیر کرامت ہیں اور ہر ایک کو یقین ہے کہ بھارت کا ہندو بزدل ہے، ہم اس پر ایک ہزار برس تک حکومت کر چکے ہیں اور اگر اس ہندو نے کوئی نیا پنگا لیا تو اگلے ایک ہزار سال تک غلامی اس کا مقدر بن جائے گی، انشااللہ۔ فیصلہ ہندو نے کرنا ہے، وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے، اپنے منشیوں پر فیصلہ نہ چھوڑے۔ (30 مئی 1998)

حیات جاودانی کا لمحہ

ایک باغیرت قوم نے ایک باغیرت راستہ اختیار کیا ہے۔

کچھ ففتھ کالمسٹوں نے بے غیرتی کا راستہ دکھانے کیلئے پورا زور لگایا تھا، لیکن پاکستان ایک باغیرت، باوقار ملک تھا، پاکستانی قوم نے اب تک ملکی غیرت اور ملی وقار کو قائم رکھنے میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ انڈیا کے پانچ ایٹمی دھماکے، پاکستان کی غیرت اور ملی وقار کے لئے سنگین چیلنج ثابت ہوئے، پاکستان کو ثابت کرنا تھا کہ وہ اپنی غیرت، اپنی آزادی، اپنی سلامتی اور اپنے وقار پر کوئی سودے بازی نہیں کرسکتا۔

لیکن افسوس ! کہ ایک ''وصولی گروپ'' نے سر اٹھایا، وہ چلانے لگا، ''دھماکہ نہیں، مال بناؤ، وصولی کرو، بریف کیس سمیٹو''۔ پورے پندرہ دن تک اس وصولی گروپ نے وہ دھما چوکڑی مچائی کہ خدا کی پناہ، پاکستانی قوم کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ شاید قائداعظم نے پاکستان بنا کر غلطی کی تھی، انگریز اور ہندو کے خلاف ہمارے اسلاف نے قربانیاں دی تھیں وہ شاید اکارت چلی گئیں، مشرقی پنجاب میں ہماری ماؤں، بہنوں کی عصمتوں کو لوٹا گیا، ان کو بھلا دیا جائے، ننھے بچوں کو سنگینوں سے ذبح کردیا گیا، ان کے معصوم خون کو ضائع سمجھا جائے، گویا خون صد ہزار انجم سے پھوٹنے والی سحر کی بات محض سراب تھی۔ دھماکہ نہیں ''مال بناؤ'' ٹولے نے اس پر بس نہیں کی، وہ قوم کو بے غیرتی کی آخری حدیں پار کرانے پر تلا بیٹھا تھا، کشمیر میں باحیا، باصفا پاکستانی خواتین کی عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ پھول سے جگر گوشوں کے ٹکڑے کئے جارہے ہیں، ہٹلر نے یہودیوں کی نسلی کشی کی یا نہیں، لیکن ہندو نے کشمیری مسلمانوں کی نسل مٹانے کیلئے سفاکی اور بہیمیت کا بازار گرم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ''دھماکہ نہیں، مال بناؤ'' ٹولہ چاہتا تھا کہ ہم کشمیری عفت مآب خواتین کی لٹی ہوئی عصمتوں اور چناروں کی وادی میں بہنے والے جواں گرم خون کی تجارت کرگزریں.....!

خدا کی قسم ! یہ ٹولہ بھول گیا تھا کہ عصمت اور خون کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، کوئی بے غیرت سے بے غیرت

قوم بھی عصمت اور خون کی قیمت وصول کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی، پاکستانی قوم کی غیرت اس سودے بازی کے لئے کیوں کر تیار ہو سکتی تھی۔

پاکستانی قوم نے غیرت اور حمیت کا راستہ نہ چھوڑنا تھا اور نہ چھوڑا، پاکستان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا، سو پاکستان اسی راستے پر آگے بڑھا، مال بناؤ گروپ ملعون اور مردود ٹھہرا۔ تاریخ اور آنے والی نسل اس پر ہزار نفرین کہتی رہے گی!

جمعرات 28 مئی 1998ء کی سہ پہر کی اس ساعت سعید کو سلام، جب بلوچستان کے پہاڑوں میں پانچ ایٹم بم پھٹے، پوری قوم کے دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی، گھر گھر مبارکباد کا شور گونجا، پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگے، قوموں کی برادری میں ہم سر بلند و باوقار ٹھہرے، سقوط بغداد اور سقوط غرناطہ کا انتقام لے لیا گیا، سقوط اسلام آباد کا چانکیائی ہندو خواب چکنا چور کر دیا گیا۔

زندہ قومیں زندہ فیصلے کرتی ہیں، حوصلہ مند قیادت حوصلوں کا کوہ گراں ثابت ہوتی ہے، قائداعظم کا حوصلہ تو محاورہ تھا ہی۔ اب تو نواز شریف نے بھی با حوصلہ اقدام کر کے اپنے آپ کو تاریخ میں زندہ بنا لیا ہے۔ وزیر اعظم کی تقریر جچی تلی تھی، قوم ہمہ تن گوش تھی، دوست اور دشمن یکساں طور پر نواز شریف کے ایک ایک نقطہ پر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

آج اس تاریخی لمحے پر قوم اپنے ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے سامنے سلام عقیدت سے مئوب جھکی ہوئی ہے، قوم اپنے جوہری سائنس دانوں کی پوری ٹیم کی ممنون ہے۔ آج کوئی دوست اور دشمن ذوالفقار علی بھٹو کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھلا سکتا۔ اس نے بھارت کے نیوکلیئر چیلنج کا جواب دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے کی پاداش میں اسے پھانسی چڑھنا پڑھا۔ کوئی دوست اور دشمن آج جنرل ضیاء الحق کو بھولنا چاہے تو نہیں بھلا سکتا کہ اس نے سپر طاقتوں کی رعونت اور دھونس کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دیا اور ایٹمی پروگرام کو اس کی منطقی منزل سے ہمکنار کیا۔ اسی کی پاداش میں اسے طیارے میں زندہ جلا دیا گیا۔

بھٹو اور ضیاء الحق کے سارے پیروکار جو ایک دوسرے سے دو عشروں سے سر ٹکرا رہے ہیں، کیا وہ آج کے دن باہم شیر و شکر ہونے کو تیار نہیں ہوں گے۔ ان کو یہ بات سمجھنے میں مزید ایک لمحہ کی تاخیر اور غلطی نہیں کرنی چاہئے کہ بھٹو اور ضیاء الحق کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کرنے والی سامراجی قوتیں ہمیں تقسیم کر کے کیا حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

آیئے آج ہم سب ایک قہقہہ لگائیں اور اپنی باہمی دشمنیوں، دلی کدورتوں اور منافرتوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ختم کر ڈالیں۔

غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری کو بھی ایٹمی پروگرام کے تحفظ کے مقدس مشن کو برقرار رکھنے کی پاداش میں ایوان صدر سے بے توقیر کر کے رخصت کیا گیا، آج قوم ان کے لازوال کردار کا بھی اعتراف کرتی ہے۔

آیئے آج کے زندہ لمحے میں جینا سیکھیں، یہ لمحہ ہمیں حیات جاودانی کی نوید دے رہا ہے۔ جن قوموں نے نہ مرنے کی قسم کھائی ہو، وہ مٹ کر بھی نہیں مرتیں۔ پاکستانی قوم تو اللہ کے سائے میں ہے۔ کالی کملی والے کی دعاؤں سے اس کو مٹانا آسان نہیں..... ہندو لالہ اپنے دل سے یہ خیال نکال سے بلکہ اپنی خیر منائے ۔۔۔خبردار.....!

اور خبردار کہ ایٹمی دھماکے سے قوم کو جو الوہی اور والہانہ خوشی ہوئی ہے، پاکستان کے در و دیوار جس مسرت سے جھوم جھوم اٹھے ہیں، اب حکومتی انتظامیہ ایمرجنسی کے نفاذ سے ان خوشیوں میں زہر گھولنے کی کوشش نہ کرے۔ ہمارے ایٹم بموں سے انڈیا کے ہندو کو بدحواس ہونا چاہئے اور وہ ان سے بوکھلا کر رہ گیا ہے۔ ان بموں سے پاکستانی قوم کو حوصلہ اور اعتماد ملنا چاہئے تھا جو اسے مل گیا ہے، لیکن ایمرجنسی کا نفاذ شدید بوکھلاہٹ، پرلے درجے کی حواس باختگی اور سراسیمگی کا غماز ہے۔ بم ہندو کے لئے چلے ہیں، پاکستانی عوام پر نہیں گرنے چاہئیں۔ عوام نے کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ وہ اب بھی ''صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسول ﷺ بس'' کی روایات دہرا سکتے ہیں۔ ان کو کسی جبر کا نشانہ بنانا دانش مندی نہیں۔ نواز شریف کو غلط مشیروں نے گھیر لیا ہے۔ نواز شریف ان سے باہر نکلیں اور قوم سے براہ راست قربانی کی اپیل کریں۔ زیرو پوائنٹ، کمیٹی چوک، مسجد شہدا اور مزار قائداعظم کے سامنے چادر پھیلا دیں، تو لوگ سب کچھ نچھاور کر دیں گے۔ سی بی آر کو لوٹ کھسوٹ اور حکومتی افسر شاہی کے اللے تللوں کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچا، جاؤ بابا معاف کرو، قوم کو دھماکوں سے جو خوشی ملی ہے، وہ ایک دن کے لیے تو قائم رہنے دو اور اب غزنوی، ابدالی اور شاہین میزائل کے تجربوں نے قوم کی جھولی خوشیوں کی دولت سے مالا مال کر دی ہے۔ اے میری قوم! اس قوم کی خالی جھولی بھی بھر دے تا کہ کسی سر تاج کو سر تاج عزیز بننے کا موقع نہ ملے۔

پاکستان کو کسی ایمرجنسی کا سامنا نہیں، کسی کو ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں۔ ہمیں جلد بازی میں کسی بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے نواز شریف کو یہ مشورے نہ دو کہ ''نواز شریف کے

ہاتھ مضبوط کرو‘‘۔ مضبوط پاکستان کو ہونا ہے، مضبوط پاکستانی قوم کو ہونا چاہیئے۔ کسی ذات کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تو پاکستان کو نقصان پہنچے گا اور ذات تو گھاٹے میں ہی رہے گی۔ پاکستان کو مضبوط کیا گیا تو کسی کی ذات کو بھی فائدہ ہوگا، پاکستان ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے، اسے کسی کی ذات سے دیکھنے، کسی کی ذات میں سمیٹنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کی جائے۔ غوری اور ایٹم بموں کے پانچ دھماکوں کے بعد ابدالی، غزنوی، شاہین کے تجربے نے حیات جاوداں اور حیات جاں افزا کے لمحات کو امر بنا دیا ہے۔

یہ امر لمحے قوم کو مبارک، نواز شریف کو مبارک، فوج اور آرمی چیف کو مبارک اور قوم کے ہیرو ڈاکٹر عبد القدیر خاں کو مبارک!!!

(5 جولائی 1998)

ایٹمی قائداعظم اور الفاظ کی دہشت گردی

یارلوگوں نے بہت زور لگایا کہ پاکستان ایٹمی دھماکہ نہ کرے لیکن پاکستانی قوم کے سامنے ان کی دال نہ گلی، دھماکہ ہوگیا ہے۔ پاکستانی قوم سرخرو ٹھہری اور دھماکہ مخالف ٹولہ سربخاک ہوا۔ اب یہ ٹولہ ایٹم بم کو تو گالی دینے کی ہمت نہیں رکھتا سو اپنا غصہ اور کینہ نکالنے کیلئے قدیر خان کے خلاف بولنا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان کے ''ایٹمی قائداعظم'' کی بے توقیری کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ شکر ہے اس ٹولے نے یہ نہیں کہہ دیا کہ قدیر خاں نے اگر کوئی ایٹم بم بنایا تھا تو اس نے عبدالکلام کو دے دیا ہے۔ زبانیں جب لمبی ہو جائیں تو پھر انکشافات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس ٹولے کی کوشش یہ ہے کہ پاکستانی قوم کی وہ خوشی اور سرشاری غارت کر دے جو پانچ ایٹمی دھماکوں سے یکلخت ملی ہے۔ یہ خوشی آسمانوں سے اتری ہے اور فرشتے غول در غول پاکستانی قوم کو مبارکباد دے رہے ہیں لیکن ایک نامہربان ٹولہ اس کوشش میں ہے کہ ایسی درقطعی چھوڑ دو جس سے دشمنان پاکستان کو متمتع ہونے کا موقع ملے۔ سو یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ قدیر خاں اور اس کی کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کا ایٹم بم کی تیاری سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسی دلیل تو بغداد کے ماہرین منطق کو بھی نہ سوجھی ہوگی جب وہ کوا حلال ہے یا حرام کے سلسلے میں نکتہ آفرینی کر رہے تھے۔ کہوٹہ کے بارے میں دور کی کوڑی لانے والے اس ٹولے سے کوئی پوچھے کہ آپ جناب نے کبھی عالم اسلام کے اس ناقابل تسخیر قلعے کی زیارت کی ہے، ویسے مجھے یقین ہے کہ خدا نے ان کی قسمت میں کہوٹہ کی زیارت نہیں لکھی۔ کہوٹہ کے ذکر سے چڑنے والے ٹولے سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مضبوط چٹانوں میں گھرے ہوئے اس مقام پر ایٹم بم نہیں بنتا تو کیا اسرائیلی اور بھارتی طیارے یہاں صندل اور بادام کے شربتوں کی بوتلوں کا گودام تباہ کرنے کیلئے پر تولتے رہے۔ آج یکا یک قوم کو بتایا جا رہا ہے کہ ایٹمی توانائی کمیشن میں بم بنا لیکن اس دفتر مبارک کو تو کسی نے آج تک غلیل کا نشانہ لینے کا بھی نہیں سوچا۔ کہا جا رہا ہے کہ دنیا کے ایٹمی سائنسدان تو شہرت پسند نہیں ہوتے لیکن

جناب قدیر خان پبلسٹی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ان کہنے والوں سے کوئی پوچھے کہ آپ نے جو ایٹمی سائنسدان پیش کیا ہے کیا اس کے نعرے وزیراعظم نے نہیں لگوائے؟ کیا اس کا استقبال نہیں کرایا گیا؟ کیا گلدستے اس پر نچھاور نہیں کیے گئے؟ کیا اخبارات اور ٹی وی میں اس کی تصویر نہیں چھپی؟ حیرت کی بات ہے کہ عبدالکلام کے مسلمان ہونے کے گن یہاں گائے جا رہے ہیں اور وہ بھی تو ایک ایٹمی سائنسدان ہے، کوئی کالم نویس نہیں، نہ ٹی وی کا فنکار یا تجزیہ نگار ہے کہ روز اخبارات اور ٹی وی پر اس کی تصویر جلوہ فگن ہوتی رہے۔

قصہ یہ ہے کہ 47ء میں برصغیر کی تقسیم محض بھارت اور پاکستان کی شکل میں ہوئی تھی۔اس تقسیم کے باوجود ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی تقسیم عمل میں نہیں آسکی۔ بھارت میں ایک بہت بڑا اور توانا مسلم انڈیا آج بھی موجود ہے اور پاکستان میں ہندو انڈیا گھسا ہوا ہے۔65ء کی جنگ کی کالی راتوں میں مصطفیٰ علی ہمدانی ریڈیو پاکستان سے للکارا کرتا تھا: ''خبردار! دشمن نے چھاتہ بردار اتار دیئے ہیں، ان گھس بیٹھیوں کو کونے کھدروں سے تلاش کر کے کچل دو'' اور میں نے یہ منظر دیکھا تھا کہ دیہات کی عورتیں کپڑے دھونے والے ''تھاپے'' اور اوکھلی میں چلانے والے ''موسلے'' لے کر جھاڑیوں میں گھس گئی تھیں۔

آج ہمیں پھر اسی قدر چوکنا اور ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔پہلے 65ء میں جو گھس بیٹھے جھاڑیوں اور کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے تھے، آج وہ کھلے عام دندنا رہے ہیں اور ان کی یہ ہمت ہے کہ وہ پاکستان کی بات کرنے والوں کو ''باجپائی'' قرار دیتے ہیں۔ان کی، منطق کی جسارت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں 'بھارت میں بی جے پی اور پاکستان میں حزب مخالف کے سیاستدان ایٹمی دھماکہ کے حق میں ہیں''۔ان کا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وطن کی بات کرنے والوں کو دشمن کا ایجنٹ ثابت کر دیا جائے۔ یہ کام کوئی نیا نہیں۔ 71-70ء میں اس ٹولے نے مشرقی پاکستان کی مسلم آبادی کو اندرا گاندھی اور کلکتے کا ایجنٹ قرار دے کر پاکستان کو دولخت کر دیا تھا۔اب پاکستان کی مسلم آبادی ان چالوں کو اچھی طرح پہچانتی ہے اور رب کعبہ کی قسم! اب پاکستان میں اس لمحے پیدا ہونے والا بچہ بھی یہ عزم لے کر دنیا میں آ رہا ہے کہ انشاءاللہ پاکستان کا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔وہ دن گئے جب ان بچوں کو ماؤں کی گود اور چھاتیوں سے گھسیٹ کر سنگینوں پر اچھال دیا گیا تھا۔آج یہ بچے مجسم ایٹم بم ہیں جو کوئی انہیں چھیڑے گا وہ اپنی موت کو دعوت دے گا۔ بڑھک گیدڑ بھبکی ہوتی ہے لیکن کمزوری دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ آؤ ہمیں پاؤں کے نیچے کچل اور مسل دو۔آج ہم کمزور نہیں ہیں اور ہم دنیا پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے قیصر روم کو تاراج کیا تھا۔جنہوں نے کسریٰ کے کنگن لرزہ

برانداز کر دیئے تھے اور یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہندو کو ہم نے ایک ہزار سال تک محکوم بنائے رکھا ہے اور اگر وہ اپنی خیر چاہتا ہے تو ہم سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ہندو انڈیا بقائے باہمی پر چلنا سیکھے۔ خود جینا چاہتا ہے تو مسلم انڈیا کو جینے دے۔ کشمیری خواتین کی آبروریزی بند کرے، کشمیری مسلمانوں کی نسل کشی کا خیال دل سے نکال دے۔ اسلام آباد کو نئی دہلی اور اس کی فوج کے رویئے پر گہری نظر رکھنی چاہے اور اگر اس رویئے میں اصلاح کے آثار نظر نہ آئیں تو پھر جو بم تجربوں سے بچ گئے خواہ وہ قدیر خاں نے بنائے ہیں یا ثمر مبارک مند نے، ان کو غوری کی ٹوپیوں پر چڑھا دے۔ ایٹم بم، ایٹم بم ہی ہوتے ہیں، خواہ قدیر خاں کے ہاتھ کے بنے ہوں یا مبارک مند کے کمیشن میں تیار ہوئے ہیں۔ ان ایٹم بموں کی ہیبت اور تباہی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہندو انڈیا کا کچومر نکالنے کیلئے یہ کافی ہیں۔ ابھی تو ان بموں کا تجربہ ہوا ہے اور سرحد کے دونوں جانب ہندو انڈیا کے اوسان خطا ہو گئے ہیں جس دن ان کا ٹریگر دبا دیا گیا تو پھر ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''۔ لیکن آیئے اس وقت کے آنے سے پہلے جینے کا ڈھنگ سیکھیں، کوشش تو کر کے دیکھیں۔

جناب ڈاکٹر ثمر مبارک مند! بم آپ نے تیار کیے ہیں تو میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ جو کریڈٹ آپ کا ہے وہ کوئی آپ سے چھین نہیں سکتا اور جو بم آپ نے قوم کی نذر کیے ہیں، وہ قوم کی آبرو ہیں، وہ ملک کیلئے ثمر مند ہیں۔ آپ نے یہ بم ہندو انڈیا کو ڈرانے کیلئے بنائے ہیں، کوئی ان بموں کا رخ قدیر خاں کی طرف نہ موڑے، مسلم انڈیا کا ایک محسن قائداعظم ہے اور ان کے بعد قدیر خان کو خدا نے عزت عطا کی ہے۔ جو عزت آپ کے حصے میں آئی ہے، وہ کوئی آپ سے نہیں چھین سکتا۔

یہی کہ اس نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی۔ ساری دنیا کی مخالفت ایک طرف اور قدیر خان اور اس کے خدا کی خدائی ایک طرف، اس قدیر خاں نے وہ راہیں روشن کیں جو ثمر مبارک مند کو چاغی کے پہاڑوں کی طرف انگلی پکڑ کر لے گئیں ورنہ چاغی کے لنڈ منڈ پہاڑ تو پہلے بھی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ یہ تب کسی کو نظر کیوں نہ آئے۔ قدیر خاں مقدس گناہ نہ کرتا تو چاغی کے پہاڑوں کا رنگ تبدیل ہونے کی نوبت نہ آتی۔ ڈاکٹر قدیر بڑے دل گردے والا سائنسدان لگتا ہے، وہ اپنے خلاف طعن اور تشنیع ہمیشہ برداشت کرتا آیا ہے، اب بھی الفاظ کی دہشت گردی کو خندہ پیشانی سے سہہ لے۔ خدا کرے وہ اپنی دھن میں مست رہے اور پاکستان کیلئے اپنا پرانا گناہ کرتا رہے، کسی کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے تو اٹھتا رہے..... آخر ایٹم بم کی اتنی سی بھی دہشت نہ ہو تو پھر یہ ایٹم بم کیسا!!! (3 جون 1998)

اب یا کبھی نہیں (1)

وزیراعظم کو جس کسی نے ٹی وی پر فی البدیہ خطاب کا مشورہ دیا اس سے بڑا ان کا نادان دوست اور کون ہوگا، میاں نواز شریف کے لیے لکھی ہوئی تقریر پڑھنا مشکل ہے، کجا ان سے یہ توقع وابستہ کر لی جائے کہ وہ بہادری کا مظاہرہ کریں، خود اعتمادی سے کام لیں اور اپنے ذہن اور ہونٹوں سے بولنے کی کوشش کریں۔ ایسا مشورہ دینے والے کسی دن ٹی وی پر فی البدیہہ بول کر دیکھ لیں، ان کا پتہ پانی ہو جائے گا۔

وزیراعظم کو غلط مشورہ دے کر مشکل میں ڈال کر ان صلاح کاروں کو کیا ملا یہ تو وہی بہتر جانتے ہیں البتہ قوم کو شدید مایوسی ہوئی۔ عوام تو اپنے لیڈر کو پوجتے ہیں لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ ان کا لیڈر الفاظ کی تلاش میں لکنت کا شکار ہو گیا ہے۔ تو ظاہر ہے ان کا بھی بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میرا لکھنے کا مقصد یہ بھی نہیں کہ وزیراعظم کے لیے کسی بھی جگہ فی البدیہہ بولنا دشوار یا ناممکن ہے، اگر ان کے سامنے لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود ہو تو پھر میاں صاحب کی جولانی طبع دیکھنے کے لیے لائق ہوتی ہے، ان کا چہرہ تمتما جاتا ہے، وہ مٹھیاں بھینچ کر اپنی ہر بات کو بڑی مہارت سے اگلتے ہیں اور چند لمحوں کے لیے مجمع کو قابو میں کر لیتے ہیں۔ لیکن ٹی وی کیمروں کو گھور کر روانی سے بولنا اور مضبوط اور مربوط گفتگو کرنا ایک کارے دارد والا معاملہ ہے، بہتر ہوگا میاں صاحب اپنے اردگرد کے مشیروں کی سازش سے ہوشیار رہیں اور آئندہ اس امتحان میں پڑنے سے گریز کریں۔

میاں صاحب کے خطاب کی دوسری خرابی یہ تھی کہ اس کا سرے سے کوئی موضوع نہیں تھا، حکومت اس وقت ایک گھسی پٹی رٹ لگا رہی ہے۔ بدحکومتی کو چھپانے کے کئی بہانے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے کامیاب یہ ہے کہ سابقہ حکومت پر سارا وبال ڈال دو۔ عوام کے مسائل کا ذمہ دار اپنے مخالفین کو ٹھہرا دیں۔ پبلک کو بیوقوف بنانے کا کبھی یہ کامیاب ہتھیار رہوا کرتا تھا اور میاں صاحب کے تقریر نویس اور صلاح

کا راس زنگ آلود اور کند ہتھیار کو ہر بار استعمال کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں کہ عوامی شعور میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور انہیں ان ہتھکنڈوں سے بے وقوف بنانا آسان نہیں رہا۔ بلکہ الٹا لیڈر کی بھد اڑتی ہے اور اس کا وقار مجروح ہوتا ہے۔

میاں صاحب کی تقریر کا ایک مثبت پہلو اور مقصد ضرور سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی حالیہ ٹرم کے ابتدائی پندرہ مہینوں کے سولہویں دورے سے واپس آ گئے ہیں اور چند روز بعد سترہویں دورے پر جانے سے پہلے قوم کو اپنی ایک جھلک دکھانا چاہتے تھے۔ بینظیر بھٹو نے کرپشن کی تھی یا نہیں، آصف زرداری نے کتنی لوٹ مار کی، بعض معمولی گریڈ کے افسران کے لاکروں سے کیا نکلا۔ تھرمل منصوبے لگانے والوں نے کس کو کتنی رشوت دی۔ یہ معاملات عدالتوں میں پیش کرنے اور ثابت کرنے کے لیے تو ہو سکتے ہیں ان پر ٹی وی شو سے میڈیا وار کو تند و تیز بنانا مقصود تھا تو یہ مقصد حکومت کو حاصل ہو گیا۔ قوم یقیناً اس بخار میں مبتلا ہو گئی۔

کوئی شخص میاں صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنے کو تیار نہ ہو کہ انصاف کا نظام اور عمل پیچیدہ ہے، وکیل موشگافیاں پیدا کر کے کیس لٹکا دیتے ہیں۔ میاں صاحب کم از کم اپنے بارے میں یہ رائے رکھنے میں حق بجانب نہیں، قوم کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ میاں صاحب کو ہمیشہ انصاف ملا۔ اور چند ہفتوں کے اندر اندر ملا۔ معاملہ حکومت کی معزولی کا ہو یا کوئی اور میاں صاحب کو تیز رفتار انصاف ملا اور گزشتہ دسمبر میں جب چند دن کے لیے انصاف ملنے میں تاخیر یا رکاوٹ نظر آئی تو سپریم کورٹ پر دھاوے پر منظر دیکھنے میں آیا۔ اور بالآخر چیف جسٹس آف پاکستان کو گھر بھیج کر مقصد پورا کر لیا گیا۔ یہ چند واقعات ہیں، عدلیہ کی تاریخ ایسے واقعات سے اٹی پڑی ہے۔ اس لیے میاں نواز شریف کو عدلیہ سے گلا نہیں ہونا چاہیے کہ انصاف کا عمل لمبا ہے۔ میاں صاحب کی تقریر میں جس کسی نے یہ جملے ڈالے اس نے بڑی خوبصورتی سے میاں صاحب کو تنقید کا نشانہ بننے کا بہانہ پیدا کیا۔ میاں صاحب کی تقریر میں اگر کچھ نہیں ڈالا گیا تو اس کا مقصد بھی یہ ثابت کرنا ہے کہ وزیر اعظم کو ملک قوم اور وقت کے سنگین ترین مسئلے کا نہ احساس ہے نہ وہ اس کی پیش بینی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میاں صاحب کے تقریر نویس اور صلاح کار اس ملک کے وزیر اعظم کو یا تو جان بوجھ کر ہوا میں معلق رکھنا چاہتے ہیں یہ پھر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صلاح کار خود بھی مستقبل بینی کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ ایک ایسے وقت

میں جب بھارت میں بی جے پی کی حکومت قائم ہے، جس کا قوم سے وعدہ ہے کہ وہ بھارت کو ایٹمی طاقت بنائے گی اور پاکستان غوری میزائل کا تجربہ کر کے بھارت کو جواب دے چکا ہو تو اس کے بعد حکومت پاکستان کے چوٹی کے صلاح کاروں اور پالیسی سازوں کا خواب خرگوش میں محو ہو جانا باعث تعجب ہے۔ کیا ایسا جان بوجھ کر کیا گیا یا اس سے حکومتی ٹولے کی صلاحیتوں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ معاملہ کچھ بھی ہو قوم و ملک کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کی قسمت محفوظ نہیں ہے۔

جس حکومت کی ساری انرجی سیاسی مخالفین کو شکنجے میں کسنے کے لیے وقف ہو، وہ قومی سلامتی کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے کیا وقت نکالے گی۔ لیکن ایک ایسے لمحے میں جب کسی گاڑی کا ڈرائیور نا تجربہ کاری کے باعث مسافروں کی زندگی خطرے میں ڈال چکا ہو تو کیا اس وقت ڈرائیور کو چھوڑ کر مسافر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جواب ناں میں ہے۔ میرے خیال میں اس وقت قومی قیادت کو مطمئن کرنے میں وقت ضائع کرنے سے بات نہیں بنے گی۔

ہمیں قومی سلامتی کے حوالے سے نازک موڑ پر اپنے حواس پر قابو پانا چاہیے لیکن بھارت کے ایک ساتھ تین ایٹمی دھماکوں نے ہمیں علاقے میں بونا بنا کر رکھ دیا ہے۔ بھارت نے تو دنیا کی واحد سپر طاقت کی ڈکٹیشن قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے اندر مہا بھارت کا جنون اپنے زوروں پر ہے، وہ اندھی طاقت کے بل بوتے پر اب کچھ بھی کر سکتا ہے۔ شاید اسے زیادہ مزاحمت کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ مشرقی پاکستان چند دن کی کارروائی سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس وقت بھارت ایٹمی طاقت بھی نہیں تھا۔ آج وہ دنیا کی چھٹی ایٹمی طاقت ہے، بھارت کی برسر اقتدار جماعت کے پاس بھاری مینڈیٹ بھی نہیں لیکن وہ اپنے منشور کو عملی جامہ پہنانے میں سنجیدہ ہے لیکن افسوس کہ جب بھارتی وزیر اعظم تین دھماکوں کا اعلان کر رہے تھے تو ہمارے وزیر اعظم نے اپنے ردعمل میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ قوم اس وقت میاں نواز شریف کی طرف دیکھ رہی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ نواز شریف اپنی ذات کو بحرانوں سے نکالنے کے لیے بڑے سے بڑے فیصلے کر سکتے ہیں۔ لیکن انہیں ملک و قوم کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے بھی دلیری سے فیصلے کرنے چاہئیں۔ جناب وزیر اعظم اب یا کبھی نہیں۔ تاریخی فیصلے میں تاخیر کیسی؟ (3 مئی 1998)

اب یا کبھی نہیں (2)

میں آج کا کالم پاکستان کے نئے میر جعفروں اور صادقوں کی نظر التفات کیلئے لکھ رہا ہوں۔

بھارت نے 1974ء میں پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ پاکستان اس وقت 1971ء کے سقوط ڈھاکہ کے سانحہ تلے کراہ رہا تھا لیکن اس دور کے پاکستانی حکمران ذوالفقار علی بھٹو نے بھارت کے ایٹمی خطرات کو بھانپتے ہوئے پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کی داغ بیل رکھی۔ بھٹو کا یہ فقرہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا ''ہم گھاس کھائیں گے لیکن ایٹم بم بنائیں گے''۔

بھارت نے پیر 11 مئی 1998ء کو دوسرا، تیسرا اور چوتھا ایٹمی دھماکہ کیا ہے۔ پھر دو روز کے وقفے سے 13 مئی کو اس نے چوتھا اور پانچواں ایٹمی دھماکہ بھی کر دیا ہے۔ پاکستان میں اس وقت حکومت میاں نواز شریف کے ہاتھ میں ہے کہ لیکن قوم کو کچھ پتہ نہیں کہ آج کی قیادت بھارتی خطرات نمٹنے کیلئے کیا لائحہ عمل اختیار کرے گی۔

بھارت کے تازہ پانچ ایٹمی دھماکوں پر ایک دنیا لرزہ براندام ہے۔ بھارت کی مذمت کی جا رہی ہے۔ چیخ و پکار جاری ہے۔ ہاہا کار مچی ہوئی ہے لیکن ستم ظریفی دیکھئے۔ پاکستان میں میر جعفروں کا ایک ٹولہ قوم کو لوری دینے کیلئے سرگرم ہو گیا ہے۔ جعفر و صادق ٹولے کی ترجیحات قوم کی ترجیحات سے ٹکرا رہی ہیں۔ امریکہ بھی پاکستان کو صبر و تحمل کا درس دے رہا ہے اور ہمارے میر جعفر اور میر صادق امن امن اور شانتی شانتی کا رٹ لگا رہے ہیں۔ وہ قوم کو بزدلی کا راستہ دکھا رہے ہیں ان کی کوشش ہے کہ ہمارے ذہنوں سے سلطان میسور کا سنہری قول محو ہو کر رہ جائے ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' ان کی کوشش ہے کہ ہم قرآن کے اس حکم کو بھول جائیں ''دشمن کے مقابلے میں اپنے گھوڑے تیار رکھو'' ان کی کوشش ہے کہ اسلامی تاریخ سے خالد بن ولیدؓ، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، شہاب الدین غوری، محمود

غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے نام حذف کر دیئے جائیں اور ان کا تذکرہ حرف غلط کی طرف مٹا ڈالا جائے، قوم کو ایک سال سے پٹی پڑھائی جا رہی تھی کہ میزائل نہیں منڈی، اور اب قوم کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے لئے اس ٹولے نے اپنا آخری وار کر دیا ہے صبر، امن اور شانتی!!

قوم بے بسی سے سب کچھ سن رہی ہے، دیکھ رہی ہے اور محسوس کر رہی ہے۔ وہ سقوط بغداد، سقوط غرناطہ اور سقوط ڈھاکہ کے انجام سے خوف زدہ ہے۔ اسے دلیر، نڈر، بے خوف اور جذبہ جہاد سے سرشار قیادت کی ضرورت ہے لیکن قیادت کی ترجیحات کچھ اور ہیں۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین کا کچومر نکالنے پر تلی ہوئی ہے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔ ضرورت تو یہ تھی کہ آج قوم یک جان ہوتی۔ ایوب خاں جیسے ڈکٹیٹر نے جب دیکھا کہ بھارت کی ننگی جارحیت نے ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے تو اس نے اپوزیشن کی طرف اتحاد اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اخبارات میں ایک تصویر چھپی، حکومتی اور اپوزیشن زعما ایک قطار میں کھڑے تھے۔ قومی اتفاق رائے کا اس سے شاندار اور قابل فخر مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ آج پاکستان 65ء سے زیادہ سنگین خطرات سے دوچار ہے۔ آج ایک مثالی اور دیرپا قومی اتفاق رائے کی ضرورت ہے۔ ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، کوئی تفریق نہیں، کوئی دوری نہیں، کوئی کسی کے خون کا پیاسہ نہیں۔ بھارت کے مقابلے میں ہم سب ایک ہیں، ایک ہیں۔ قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے تحریک پاکستان کے دنوں میں اس اتحاد و اتفاق کی ایک مثالی فضاء پیدا کی تھی۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ قوم کو اشارہ تو کیا جائے۔ اس کے اندر اتحاد کی تڑپ موجود ہے اور اگر میاں نواز شریف تاریخ میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو وہ پہل کریں اور تمام قومی زعما کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دیں۔ جناب وزیراعظم آگے بڑھیے۔ دیر مت کیجئے۔ جب قوم اور ملک کی انا کا سوال ہو تو ذاتی انا کیسی!! اپنے نادان مشیروں، میر جعفروں اور بزدلی کا درس دینے والوں کے دائرے سے باہر نکلئے، قوم اپنی بانہیں آپ کی طرف پھیلائے منتظر کھڑی ہے۔

(14 مئی 1998)

سقوطِ زیارت

میں نے سقوط ڈھاکہ کا زخم برداشت کیا، تب سوچتا تھا کہ اتنی زندگی باقی نہیں رہ گئی کہ کوئی اور کاری زخم سہ سکوں لیکن پندرہ جون کے ابتدائی لمحات میں میرے قائد کی یادوں کو بارود سے اڑا دیا گیا، میں اسے سقوط زیارت کے مترادف سمجھتا ہوں۔ میں یہ کالم سینے پر پتھر رکھ کر لکھ رہا ہوں، میرے قلم پر تقدیر نے سنگین تان رکھی ہے کہ لکھو۔۔ زیارت کے کھنڈر اور اس کی راکھ کا نوحہ لکھو۔

یہ ایک عمارت کی بات نہیں، یہ بلوچستان میں قائداعظم کی واحد نشانی ہے اور اس کا قصور یہ ہے کہ اس پر پاکستان کا پرچم لہراتا تھا، وہ سارا سامان جو میرے قائد کی یادوں کا امین تھا، راکھ کا ڈھیر بن گیا، میری تاریخ کو بغداد کے حشر سے دوچار کر دیا گیا، غرناطہ اور قرطبہ کی طرح اسے یادوں کے صفحات سے کھرچ دیا گیا۔

عظیم قائد ہمارے درمیان نہیں تھے لیکن وہ دیواریں تو تھیں جو کان لگا کر قائد کے نحیف ہونٹوں کی لرزش کو سننے کے لیئے بے تاب رہتی تھیں۔ وہ بستر تو تھا جسے قائد کے لافانی جسم کو چھونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اور وہ روح افزا جھونکے بھی اس کی راہداریوں میں اپنے مقدر پر ناز کرتے رقصاں رہتے تھے جو موذی مرض میں مبتلا قائد کو طاقت اور توانائی بخشتے رہے۔

خاک مدینہ و نجف کے بعد زیارت کی خاک قوم کی آنکھوں کا نور تھی، اس کی روح کو سرور بخشتی تھی۔

زیارت ایک علامت ہے، ہمارے اقتدار اعلی کی، ہماری قومی خودمختاری کی، ہماری آزادی کے احساس کی۔ یہ علامت ہے ہمارے قائد کی اس بے مثل کشمکش کی جو رینگتی ہوئی یقینی موت کے ساتھ ان کے وجود میں برپا ہوئی۔ بطل حریت کی زندگی کے آخری ایام یہاں بسر ہوئے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے زیارت کا ذکر نمناک آنکھوں سے کیا۔ اپنی کتاب، میرے بھائی، میں انہوں نے لکھا:

زیارت کی ریذیڈنسی جہاں ہم ٹھہرے، ایک پرفضا منظر، پرانی اور دو منزلہ عمارت تھی۔ جو ایک بلند و بالا

پہاڑی پر کسی مستعد چوکیدار کی طرح کھڑی تھی۔اس کے لان اور باغ وسیع ہیں جہاں پرندے ہر صبح نغمہ حمد گاتے ،اور شام کو چہچہاتے ، پھلدار درختوں کا ایک جھنڈ ،اور پھولوں کے تختے یہاں کے منظر کی خوبصورتی کو دوبالا کرتے۔قائداعظم اس کی خاموشی اور دلکشی پر فریفتہ ہو گئے۔

بارود اور راکھ کی بو سے اٹی ہوئی زیارت ریذیڈنسی کی تاریخ گونگی نہیں، بہری نہیں، اسے یاد ہے کہ کس طرح کھانستے کھانستے ،قائد بے حال ہو جاتے تھے،اکیلی فاطی ان کی دلجوئی کے لیئے ہمہ وقت کوشاں رہتی۔

زیارت ریذیڈنسی کی آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ نرس نے قائد کا ٹمپریچر لیا، قائد نے پوچھا، کتنا ٹمپریچر ہے۔نرس نے کہا کہ میں آپ کو نہیں ،صرف ڈاکٹر کو بتاؤں گی ، قائد نے اصرار کیا کہ میں اپنا ٹمپریچر معلوم کرنا چاہتا ہوں، مجھے بتاؤ،نرس اپنے موقف پر ڈٹی رہی: میں صرف ڈاکٹر کو بتانے کی پابند ہوں،آپ کو نہیں،اور وہ کمرے سے چلی گئی تو قائد نے فاطی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور تاریخ نے اسے اپنے صفحات پر نقش کر لیا: میں اس قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ایسے لوگ جو مصمم ارادہ کے مالک ہوں،اور جو خوفزدہ ہونے سے صاف انکار کر دیں۔

میرے قائد! مجھے افسوس ہے ہم آپ کی یہ نصیحت بھول گئے ،ہم اپنے ارادوں پر قائم نہ رہ سکے،ہم خوف زدہ ہو چکے۔ایک اقلیت کے سامنے ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اچکزئی کی شہرت یہ ہے کہ وہ جمہوریت پرست ہیں،جس روز ڈاکٹر طاہر القادری نے دھرنا دے رکھا تھا،نواز شریف نے اپوزیشن رہنماؤں کا اجلاس جاتی امرا میں طلب کیا اور ایک دبنگ اعلامیہ جاری ہوا، جناب اچکزئی کے لیئے یہ اعلامیہ شاید کافی نہیں تھا۔انہوں نے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ میں جنرل کیانی سے بات کروں گا کہ ملک کے ساتھ کافی ہو گئی۔رہی سہی بھڑاس انہوں نے قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں نکال لی۔اور پھر ان کے بھائی کو صوبے کا گورنر بنا دیا گیا، ایک بھائی ان کے ایم این اے بن چکے تھے، بہنوئی صوبائی اسمبلی کے رکن بن گئے اور دور شتے دار خواتین کو انہوں نے صوبائی اسمبلی کی رکنیت بھی دلوادی۔یہ ہے جمہوریت کا چہرہ جس میں صرف ایک خاندان جھلکتا ہے۔ڈاکٹر عبدالمالک کو صوبائی قیادت سونپ دی گئی،ن لیگ نے صوبے سے جان چھڑوالی اور ڈھنڈورا یہ پیٹا گیا کہ اقتدار کی نہیں،اقدار کی سیاست کرتے ہیں۔

میں حساب کتاب کا ماہر نہیں۔۔نہیں بتا سکتا کہ فرزند زمین ڈاکٹر عبدالمالک اور گورنر محمد خاں اچکزئی کے اقتدار سنبھالنے کے کتنے گھنٹوں بعد قائداعظم کی زندگی کے آخری لمحات کی امانت دار زیارت ریذیڈنسی کو

بارود اور آگ کے شعلوں کی نذر کیا گیا ہے۔

دہشت گردوں کا یہ پیغام مل چکا کہ قائداعظم کا پاکستان قبول نہیں ہے۔

مجھے مشرف کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ وہ زمانہ لد گیا جب بلوچ سردار پہاڑوں پر چڑھ کر چھپ جاتے تھے، اب پاک فوج کے پاس وہ آلات ہیں جو پہاڑوں کی جھاڑیوں کے اندر جھانک سکتے ہیں۔ کیا یہ آلات اسی طرح گونگے بہرے اور اندھے ہو گئے ہیں جس طرح ایبٹ آباد پر جارحیت کے دوران امریکہ نے مغربی سرحد پر ہمارے راڈار سسٹم کو گونگا، بہرہ اور اندھا کر دیا تھا۔

سابق وزیراعظم گیلانی نے شرم الشیخ کانفرنس میں من موہن سنگھ سے احتجاج کیا تھا کہ بلوچستان میں ان کا ملک مداخلت کر رہا ہے، سابق وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے چند ماہ پیشتر بھارت کی سرزمین پر کھڑے ہو کر کہا کہ را کے ایجنٹوں نے بلوچستان کو جہنم میں تبدیل کر رکھا ہے۔

مجھے دیکھنا ہے کہ ایم این اے محمود خاں اچکزئی، ان کے گورنر بننے والے بھائی محمد خاں اچکزئی اور قوم پرست وزیراعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک لب کشائی کرتے ہیں تو کیا حقائق سامنے لاتے ہیں۔ کیا وہ بھارت کا نام لیں گے جو سقوط ڈھاکہ کا مجرم تھا۔ مگر میرے نزدیک وہی سقوط زیارت کا مجرم ہے۔

نئے وزیراعظم، قائداعظم ثانی کو امریکہ نے ڈرون حملوں کی سلامی دی اور بھارت نے زیارت کی راکھ کی سلامی دی۔

زیارت میں ایک بلڈنگ کو نہیں، ایک نظریے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

کیا قائداعظم ثانی پہلی فرصت میں قائداعظم کے مزار پر حاضری دیں گے اور قائد کے حضور یہ عہد کریں گے کہ وہ قائد کے ملک اور قائد کے نظریے کے لیئے جان لڑا دیں گے، کیا وہ مصطفیٰ کمال کی طرح قوم سے کہیں گے کہ میں تمہیں لڑنے کا نہیں، مرنے کا حکم دیتا ہوں۔

ہر پاکستانی کی جیب میں سو روپے کا نوٹ تو ضرور ہوتا ہے، میری اپیل ہے کہ آج ایک بار اس نوٹ کو دل کی آنکھوں سے ضرور چومیئے۔ اس نوٹ کے ایک طرف زیارت ریذیڈنسی کی تصویر ہے جو مستقبل میں صرف اسی نوٹ پر ہی دیکھی جا سکے گی۔

پرندے یہاں ہر صبح نغمہ حمد گاتے تھے، مگر وہاں ایک بلند پہاڑی پر (پاکستان کا) مستعد چوکیدار اب نظر نہیں آئے گا۔ (16 جون 2013ء)